عرب

اور

اہلِ عرب

مصنف

رچرڈ ایچ سینگر

مترجم

مولانا غلام رسول مہر

مکتبہ معین الادب لاہور

طبع اول ۱۹۶۱

تعداد ۱۰۰۰

طابع .... ایم معین الدین

مطبع .... منصور پریس لاہور

طباعت گرد پوش .... نفیس پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت .... چھ روپے

بہ اشتراک

مکتبۂ فرینکلن لاہور ، نیویارک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

سرزمین عرب ہی کے دامن میں وہ مقدس ترین مقام واقع ہے جسے اس کائنات میں انسانوں کا پہلا دینی مرکز و معبد ہونے کا شرف حاصل ہوا یعنی مسجد الحرام۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ۔ (آل عمران ۹۶)	بلاشبہ پہلا گھر جو انسانوں کے لئے خدا پرستی کا مرکز بنایا گیا وہ (یہی عبادت گاہ) ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور تمام انسانوں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ۔

اقبال نے اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا تھا:

دنیا کے بت کدے میں پہلا وہ گھر خدا کا

ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پاک مقام کی تقدیس از سر نو قائم کر دی۔ اگرچہ عرب بعد ازاں برائیوں کے تاریک غار میں گر گئے۔ اور دین حق کو انہوں نے بالکل بھلا دیا تاہم اس مقام کی تقدیس و حرمت کے ظاہری آداب میں قطعاً فرق نہ آیا۔ پھر اسلام آیا تو اس دینی مرکز کو کائنات انسانیت کی قبلہ گاہ بنا دیا گیا۔ کم و بیش چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں کبھی کوئی دور اور کوئی زمانہ نہیں آیا جب روئے زمین کے اطراف سے لاکھوں فرزندان

توحید ہر سال ادائے حج و عمرہ کے لئے اس مقدس مقام پر پہنچتے رہے ہوں۔ دریا، سمندر
پہاڑ، لق و دق صحرا، بدامنیاں، خونریزیاں، خوف جان و مال، سفر کی دشواریاں، ملی
کی صبر آزمائیاں ہمیشہ انسانوں کے لئے حوصلہ فرسا بن رہی ہیں۔ حرم محترم تک پہنچنے میں ابھی یہ تمام
موانع مختلف اوقات میں موجود رہے ہیں۔ سمندروں میں جہازوں پر حملے ہوتے تھے، خشکی میں
قافلے لٹتے تھے۔ پھر جدہ سے مکہ مکرمہ تک اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک ایسی صعوبتوں اور
مصیبتوں سے سابقہ پڑتا تھا جن کا تصور بھی انسانوں کے پختہ عزائم کو مضمحل کر دینے کے
لئے کافی تھا۔ مگر یہ راستے فدا کاران دین حق کی گام زنی اور مسافت پیمائی سے کبھی خالی
نہ ہوئے۔ دنیا میں بہت سے مقامات ہیں جنھیں مذہبی تقدیس کی بنا پر خاص ہر دلعزیزی
حاصل رہی۔ لیکن کوئی مقام ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جسے عملی اعتبار سے حرم پاک کا
رتبہ بلند ملا ہو اور جہاں سال بہ سال ملکوں، قوموں، نسلوں اور رنگوں کا ایسا وسیع
اجتماع ہوتا رہا ہو جیسا مکہ مکرمہ میں ہوتا چلا آیا ہے اور جب تک آسمان کا سائبان
زمین پر تنا ہوا ہے، برابر ہوتا رہے گا۔

ان حالات کے پیش نظر سرزمین عرب کے احوال و ظروف جس توجہ کے مستحق تھے وہ
کسی تشریح کی محتاج نہیں لیکن یہ امر یقیناً حد درجہ تعجب خیز اور حیرت افزا ہے کہ مدت
مدید تک عرب کے مفصل جغرافیائی حالات فراہم ہی نہ ہو سکے بلکہ اس کا ایک مستند نقشہ بھی
تیار نہ ہو سکا۔ سیاحوں اور زائروں نے جو کچھ قلمبند کیا، وہ صرف ان راستوں اور گزرگاہوں
سے تعلق رکھتا تھا، جن سے مختلف اوقات میں ان کو سفر کرنا پڑا یا ان راستوں سے لوگ
مختلف زمانوں میں آتے جاتے تھے۔ مستند معلومات کی فراہمی کا آغاز اہل یورپ سے ہوا
اور اہل یورپ ہی نے ان معلومات کا معاملہ آخری منزل پر پہنچایا۔ انھوں نے دور حا

اصول کے مطابق عرب کے مختلف حصوں کے قابل اعتماد نقشے تیار کئے۔ اور آج جن کتابوں کو اہل علم میں درجہ استناد حاصل ہے، وہ سب اہل یورپ ہی کی مرتب کی ہوئی ہیں جنہوں نے پہلے عربی زبان میں اس پیمانے پر مشق بہم پہنچائی کہ بے تکلف بات چیت کر سکیں۔ پھر اپنا تمدن اور طریق بود و باش چھوڑ کر عربوں کے سے اوضاع و اطوار اختیار کئے۔ سب سے آخر میں اپنے جسموں کو ان مشقتوں اور سختیوں کی برداشت کے لئے تیار کیا۔ جن کے لئے خود اس سرزمین کی فضا میں پلنے والے بھی زیادہ تعداد میں تیار نہ ہو سکتے تھے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا قابل ذکر شخص کارسٹن نی بہر[1] ہے، جسے شاہ ڈنمارک نے ۱۷۶۱ء میں ماہرین فن کی ایک جماعت کے ساتھ عرب بھیجا تھا۔ اور اس نے خاصی مدت حجازی مقامات نیز یمن کے مختلف حصوں میں گزاری۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ بائبل کے مختلف مقامات کی جغرافیائی توثیق و تشریح کے لئے معلومات فراہم کی جائیں۔ ۱۹۴۶ء میں ولفرڈ تھیسیگر[2] نے "ربع الخالی" کا آخری سفر کیا۔ ایک سو ستائیس سال کی طویل درمیانی مدت میں بہت سے سیاح بھیس بدل بدل کر عرب کے مختلف حصوں میں پھرے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں:۔ ڈاؤٹی[3]، پال گریو[4]، بلنٹ[5]، برکہارٹ[6]، برٹن[7]، سینٹ جان فلبی[8] اور برٹرام ٹامس[9]۔ ٹامس، فلبی اور تھیسیگر نے دوسرے مقامات کی تفصیلات کے علاوہ "ربع الخالی" کے مختلف حصوں کی چھان بین تکمیل تک پہنچا دی۔

---

1. Carsten Neibuhr 2, Wilfred Thesiger

3. Doughty & Palgrau. 5. Lady Blunt

6. Burckhardt. 7. Richard Burton

8. St John Philby 9. Bertram Thomas

یہ وسیع صحرائی علاقہ جس پر ابتدا سے تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا ۔ پہلی مرتبہ روشنی میں آیا اور اس کا مستند نقشہ تیار ہوا ۔ اکتشافی سیاحتوں کا معاملہ صرف مردوں تک محدود نہ رہا عورتوں نے بھی اس سلسلے میں بڑا قابلِ قدر کام انجام دیا ۔ مثلاً جرٹرُوڈ بیل[۲]۔ فریا سٹارک[۱] مسز انگرام[۳] ۔

یہ تمام کتابیں اپنی اپنی جگہ بڑی قابلِ قدر تھیں ۔ لیکن میں کسی ایسی کتاب کی تلاش میں تھا جو عام حالات کی مختصر کیفیت کے علاوہ گزشتہ پندرہ بیس سال کے حقائق و وقائع کی جامع ہوتی ۔ خصوصاً اس میں یہ بتایا جاتا کہ عرب کے مختلف خطوں نے زراعت و آبیاری کے نئے وسائل سے کس حد تک فائدہ اٹھایا ؟ وہاں زرعی ترقی کے امکانات کیا ہیں ؟ کون کون سی صنعتیں جاری ہو چکی ہیں اور کن کن صنعتوں کو کامیابی سے جاری کرنے کا انتظام ہو سکتا ہے ؟ سب سے آخر میں یہ کہ اس زیرِ زمین دولت و ثروت کے نشوو ارتقا کا پورا نقشہ سامنے آجاتا جس نے اقتصادی لحاظ سے سرزمین عرب کو آج دنیا بھر کی توجہات کا مرکز بنا رکھا ہے ۔ یعنی تیل ۔ اسی قدرتی دولت کی برکت ہے ۔ کہ آج تمام بڑی طاقتیں عربوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے لئے مضطرب ہیں ۔ اور چاہتی ہیں کہ انہیں اعتماد کا بلند ترین درجہ حاصل ہو جائے ۔

اس اثنا میں مسٹر اچ وسینگر کی کتاب "جزیرۃ العرب" دیکھنے کا موقع ملا جس میں سنہ ۱۹۵۳ء تک خاصی قیمتی معلومات فراہم کر دی گئی تھیں ۔ فاضل مصنف نے خود مختلف علاقوں کا سفر کیا اور جو کچھ لکھا ذاتی مشاہدات کی بنا پر لکھا ۔ اس میں دولت سعودیہ عربیہ ، بحرین ، کویت ، عمان کی ساحلی امارتوں (ٹروشیل عمان)

---

۱ Freya Stark ۲ Gertrude Bell ۳ Mrs. Ingram

مسقط، عدن کی زیرِ حمایت ریاستوں اور یمن کے متعلق تمام ضروری حالات جمع کر دیئے گئے تھے۔ گویا جزیرۃ العرب میں سے صرف "ہلال زرخیز" یعنی عراق، اردن، شام، بیروت اور فلسطین کا ذکر باقی رہ گیا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ قیمتی معلومات کے اس ذخیرے کو مناسب انداز میں اردو کا لباس پہنا دیا جائے تاکہ میرے اردو خواں ہم وطن بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ معلومات غالباً ان میں سے بھی اکثر اصحاب کے پیشِ نظر نہ ہوں گی۔ جو عموماً تازہ ترین انگریزی کتابیں پڑھنے کے عادی ہیں۔

اس کتاب میں بڑی خوبیاں ہیں، جو عموماً اجنبی سیاحوں کی کتابوں میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً: ۱۔ مصنف نے زیادہ سے زیادہ صحیح حالات پیش کئے ہیں اور اپنے تاثرات بے تکلف بیان کر دیے ہیں۔ معلومات کی کمی کا معاملہ الگ ہے تاہم مجھے اس میں کسی جانبداری بیان کا سراغ نہ مل سکا۔

۲۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مختلف ممالک کے باشندے کس وسیع پیمانے پر خلقِ خدا کی خدمت کر رہے ہیں اور ان کی سرگرمیاں خود ان کے ملک کے لئے کس قدر فائدہ رساں اور وقار افزا ثابت ہوتی ہیں۔

۳۔ اس کتاب سے پہلی مرتبہ معلوم ہو گا کہ اہلِ مغرب خصوصاً اہلِ امریکہ نے کس عزم و استقامت کے ساتھ عرب میں زرعی ترقیات کی بنیاد رکھی۔

۴۔ بعض معلومات میرے نزدیک بالکل نئی ہیں۔ مثلاً جمہوریہ امریکہ کے تعلقات ممالکِ عربیہ سے۔ جو تفصیل اس کتاب میں بیان ہوئی ہے وہ غالباً یکجا کسی دوسری کتاب میں نہ مل سکے گی۔

پوری کتاب اہلِ یورپ اور اہلِ امریکہ کا نقطۂ نگاہ سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی، اس وجہ سے اس میں ایسی چیزیں بھی آ گئی تھیں، جن کی ضرورت ہمارے خوانندگان کرام کو نہ تھی۔ مثلاً ارکانِ اسلام کے متعلق معمولی تفصیلات، جن سے عام مسلمان بدرجہا بہتر طریق پر آگاہ ہیں۔ یا بعض مقامات پر سیاحت کے زاویۂ نظر سے ایسی جزئیات، جو ہمارے اہلِ وطن کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے فاضل مصنف کی اجازت سے ایسی چیزیں یا تو بالکل حذف کر دیں یا جہاں حذف سے نفسِ مضمون کی ترتیب میں خلل کا اندیشہ تھا، وہاں تلخیص پر اکتفا کیا۔ تاہم کتاب کے تمام جغرافیائی، تمدنی، ثقافتی، صنعتی اور نباتاتی مطالب مصنف کے الفاظ میں قائم رکھے اور کوئی ضروری چیز نہ چھوڑی گئی، نہ اس کی تفصیل سے اعراض کیا۔ اس طرح کتاب کی ضخامت ایک حد تک کم ہو گئی لیکن اس کے وہ حصّے حرفاً حرفاً محفوظ رہے، جن کا تعلق معلومات سے تھا، یہاں تک کہ بعض صحرائی مناظر کو بھی بدستور قائم رکھا اور ان کا لفظی ترجمہ کیا۔ اگرچہ اس سلسلے میں بعض اساطیری تلمیحات کی تشریح حواشی میں کرنی پڑی۔ مصنف نے کہیں کہیں ضمناً اسلام سے پیشتر کی تاریخِ عرب اور بعض اہم آثارِ قدیمہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہ معلومات اختصار کے باوجود بہت قیمتی تھیں اس لیے میں نے یہ حصے بھی پورے کے پورے لے لیے بلکہ بعض مقامات پر متعلقہ مطالب کا اضافہ حواشی میں کر دیا تاکہ خوانندگانِ کرام کے سامنے زیادہ سے زیادہ معلومات آ جائیں۔

اس کے علاوہ میں نے کتاب کو ہر لحاظ سے جامع اور مکمل بنانے کے

لیے جو کچھ کیا، اس کا سرسری نقشہ ذیل میں درج ہے:

۱- مصنف کی کتاب ۱۹۵۳ء میں مکمل ہو چکی تھی اور ۱۹۵۴ء میں شائع ہو گئی تھی، اس لیے طبعاً اس میں صرف ۱۹۵۳ء تک کی معلومات شامل تھیں۔ میں نے مختلف جرائد و رسائل اور سالناموں کو سامنے رکھ کر ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۹ء تک کی معلومات فراہم کیں۔ اور انہیں ہر بیان کے آخر میں بہ طور ضمیمہ شامل کر دیا۔ گویا اپنے ترجمے کو ۱۹۵۹ء تک کے حالات پر حاوی بنا دیا۔

۲- جا بجا ضروری حواشی لکھے، جن میں مختلف مقامات اور معاملات و امور کے متعلق مزید معلومات درج کر دیں، جو اصل کتاب میں موجود نہ تھیں۔

۳- بعض معاملات کے متعلق مصنف نے صرف یک طرفہ معلومات کافی سمجھ لی تھیں۔ مثلاً ۱۸۵۸ء میں جو ہنگامہ بہ مقام جدہ برپا ہوا تھا، مصنف نے اس کے متعلق "لندن ٹائمز" کا بیان درج کیا حالانکہ وہ سراسر طرف دار نہ تھا۔ میں نے مستند عربی تاریخوں سے اس ہنگامے کے اصل اسباب پیش کیے۔ خوانندگان کرام پر واضح ہو جائے گا کہ اس طرح ہنگامے کی نوعیت کچھ سے کچھ ہو گئی۔

۴- بعض امور کے سمجھنے میں مصنف سے لغزشیں ہوئی تھیں۔ میں نے ان کی صحیح تشریح کر دی تاکہ حقیقت نظروں سے اوجھل نہ رہے۔

۵- بعض تاریخی معلومات میں اضافہ کیا۔

۶ - ایک نہایت ضروری چیز یہ تھی کہ تمام مقامات کے نام صحیح لکھے جاتے اور جہاں مصنف نے ان کا موقع اور محل نہیں بتایا تھا، وہاں یہ کمی پوری کر دی جاتی - میں نے اس سلسلے میں بھی حتی الامکان کوئی امر نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ اس طرح "جزیرۃ العرب" کے متعلق یہ کتاب جغرافیائی، تاریخی، تمدنی، ثقافتی اور ترقیاتی معلومات کا ایک گراں قدر مجموعہ بن گئی ہے - امید ہے خوانندگان کرام اسے پسند فرمائیں گے - مترجم کے لیے یہی اطمینان کافی ہے کہ اسے سرزمین مقدس عرب کے متعلق ایک ضروری کتاب کو اپنے علم کی حد تک بہتر صورت میں پیش کرنے کا موقع ملا -

مہر
مسلم ٹاؤن - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

پہلا باب

جدّہ

سفارتی مرکز اور باب الحج

طلوعِ سحر کی خنک فضا میں ہوائی جہاز قاہرہ سے جدّہ روانہ ہوا۔ تھوڑی سی دیر میں سورج کی روشنی نمودار ہو گئی۔ اور جہاز بحیرۂ قلزم کے اوپر پہنچ گیا جس کی موجوں کو شمالی و مغربی ہوا نے سفید تاج پہنا رکھے تھے۔ ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز سفید بادلوں سے بچتا ہوا ایسے مقام پر آ گیا جہاں مصر کی سرزمین نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اور سامنے ایک اور خطہ نمودار ہوا۔ اس کا منظر بڑا دلکش تھا۔ سمندر کی لہریں زیرِ آب چٹانوں سے ٹکراتی تھیں، تو ان پر سفید جھاگ نمودار ہو جاتا تھا۔ وہاں سے ساحل تک ہلکے سبز رنگ کا پانی پھیلا ہوا تھا۔

یہ دولت سعودیہ عربیہ کا ساحل تھا۔ اسے اس آٹھ لاکھ مربع میل سرزمین کی دہلیز سمجھنا چاہیئے، جس میں ریگستان بھی ہیں اور سنگلاخ سطحِ مرتفع بھی، کھجوروں سے بھرے ہوئے نخلستان بھی ہیں اور تیل کے چشمے بھی۔ اسی نے نہایت مقدس اسلامی

مقامات کو آغوش میں لے رکھا ہے۔ جن کی زیارت کے لئے ہر سال لاکھوں مسلمان
پہنچتے ہیں۔

ساحل سے تھوڑی دور ہی ہوائی جہاز نے رُخ بدل لیا۔ اور وہ جبل رضوی
کی سات ہزار فٹ بلند چوٹی پر سے گزرا۔ اس کے دامن میں ینبوع واقع ہے۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا۔ کہ یک رنگ ساحل پہ ایک دھندلا سا سفید نقطہ لگا دیا گیا ہے۔
یہی مقام، مدینہ منورہ کی بندرگاہ ہے۔ اس کے قریب ہی رومی جرنیل آئیس گیلس[1]
نے ۲۴ ق م میں یمن پہ حملے کے لیئے فوج تیار کی تھی۔ اور جزیرۃ العرب کا
یہ پہلا معروف یورپی سیاح تھا۔ اسی بندرگاہ کے قریب سے پہلی جنگ عظیم
میں ترکوں کی پسپائی کا آغاز ہوا تھا۔ اس طرح عرب اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔

ینبوع سے ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد مسافروں کے کانوں میں ہوائی جہاز کے
انجن کا شور بہت بڑھ گیا۔ یہ اس امر کی علامت تھی۔ کہ جہاز جدہ میں اتر رہا ہے
جو دولت سعودیہ عربیہ کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے اور جو نازیں حج سمندر کے راستے
مکہ معظمہ آتے ہیں۔ وہ اسی مقام پر اترتے ہیں۔ نیز دولت سعودیہ کا سفارتی مرکز بھی
یہی مقام ہے۔[2]

---

[1] Aelius Gallus (i) یہ شخص قیصر آگسٹس کے ماتحت مصر کا گورنر تھا۔ اور مسالوں کی
تجارت پر قبضہ کرنے کی غرض سے اس نے یمن پر حملہ کیا تھا۔ لیکن مہم راستہ بھولنے اور پانی نہ ملنے
کے باعث بری طرح ناکام رہی۔ سمجھا یہ گیا کہ رہبروں نے دھوکا دیا [2] اصل دارالحکومت مکہ معظمہ ہے۔ چونکہ
کوئی غیر مسلم حدود حرم کے اندر داخل نہیں ہو سکتا جو مکہ معظمہ کے چاروں طرف مختلف فاصلوں پر متعین
ہیں اس لئے جدہ کو سفارتی دارالحکومت بنا لیا گیا۔ یعنی تمام سفیر جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں جدہ میں رہتے
ہیں اور حکمران نیز وزیر خارجہ وقتاً فوقتاً ملاقات اور گفتگو کے لئے جدہ پہنچ جاتے ہیں

پہلے ریگستان میں بنی ہوئی جھونپڑیوں کا ایک جھنڈ نظر آیا، جن میں افریقہ کے حبشی رہتے ہیں۔ پھر ایک ریگستان نما میدان دکھائی دیا۔ جسے جدّہ کے غیر ملکی باشندے گالف کا میدان کہتے ہیں۔ آگے ہوائی جہاز امریکی سفارت خانے کے نئے احاطے کے اوپر سے گزرا۔ اس کے اور آگے سرخ رنگ کی بہت سی عمارتیں دکھائی دیں جن میں دولت سعودیہ کی شرکت معدنیات[1] کا صدر دفتر بھی ہے۔ پھر شاہی موٹر خانہ آگیا۔ ساتھ ہی موٹروں کے ٹھہرانے کی جگہ تھی۔ شاہ سعود نے اپنی سلطنت کی بڑی شاہراہوں پر اونٹوں کی جگہ بڑے بڑے ٹرک چلوانے کا انتظام کر دیا ہے۔ ان ٹرکوں کے بیڑے کا مغربی صدر مقام یہی ہے۔ اس سے آگے ایک ٹیلے پر جدید وضع کی عمارت کھڑی ہے جس پر سبز استر کاری کر دی گئی ہے۔ مصری امرا اس رنگ کو عموماً پسند کرتے ہیں۔ پہلے دولت سعودیہ کا امریکی سفیر اسی عمارت میں مقیم تھا۔ اور آگے بڑھے۔ تو مزید مقامات دکھائی دیئے۔ پھر جدہ کا ساحل نظر آیا۔ جس کی زیر آب چٹانوں پر جھاگ کے دل پھیلے ہوئے تھے۔ پاس ہی بادبانی کشتیوں کا ایک بیڑا اور کچھ چھوٹے دخانی جہاز ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک چٹان پر فرانسیسی جہاز "ایشیا" کا زنگ خوردہ ڈھانچا پڑا تھا، جو ۱۹۳۴ء میں یمن سے عازمین حج کے قافلے کو لے کر آیا تھا۔ جدّہ کی بندرگاہ میں پہنچا تو طوفان کے باعث زیر آب چٹان سے ٹکرا گیا اور ساری رات جلتا رہا۔ مقامی لوگوں کو اب تک یہ دردناک واقعہ یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے۔ کہ ارض مقدس پر نظر پڑتے ہی ان عقیدت مندوں پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ انھوں نے سمجھا کہ آگ اللہ کے حکم سے لگی ہے۔ چنانچہ اپنی جانیں

---

[1] Mining Syndicate

بچانے کے بجائے نماز و دعا میں مشغول ہو گئے۔ صرف وہی لوگ بچے۔ جنھیں بچانے والوں نے اٹھا کر جہاز کے باہر پھینک دیا۔

اب ہوائی جہاز شہر پر سے گزرا اور مسافروں کو چار چار، پانچ پانچ منزل کے مکان ایک دوسرے سے پیوست نظر آئے۔ بعض اتنے بلند اور ایک طرف کو جھکے ہوئے کہ ان کے گر جانے کا خطرہ پیدا ہوتا تھا۔ انجام کار جہاز ایک ریتلے میدان میں جا اترا۔ جو شہر کے مشرقی جانب تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کا دروازہ کھلا اور عرب کی ریگ آلود ہوا اندر گھس آئی۔

جو آنکھیں قاہرہ کے مناظر سے مانوس ہو چکی ہوں انھیں جدّہ میں بہت کم قابل توجہ چیزیں نظر آتی ہیں۔ نہ اس شہر میں ٹرام گاڑیاں چلتی ہیں۔ نہ شاہراہوں پر سینماؤں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ جدّہ کی زیادہ تر گلیاں صرف اتنی چوڑی ہیں کہ دو گدھے برابر برابر بہ سہولت عمارتوں کے شہ نشینوں کے نیچے سے گزر جائیں۔ شہ نشینوں کے لیے اس شہر کو بڑا شہرت حاصل ہے اور ان پر نہایت عمدہ دستکاری کی گئی ہے۔ عرب کی بے پناہ دھوپ کے باعث پرانی عمارتوں کا پلستر تڑخ گیا ہے اور خود شہ نشینوں کا رنگ روغن بھی اڑ گیا ہے۔ احساس یہ ہوتا ہے۔ کہ شہر کھڑے کھڑے ہی عالم خواب میں پہنچ گیا، اس لیے کہ لیٹنے اور مناسب طریق پر سونے کے لیے اسے جگہ نہ مل سکی۔

گلیوں کے فرش پختہ نہیں۔ کبھی کبھی پرانی وضع کی پانی گاڑیاں ان پر چھڑکاؤ کر دیتی ہیں۔ اگر اچانک بارش کا ریلا آ جائے تو گلیوں میں کیچڑ ہو

جاتی ہے۔ ساحلی میدان کی ریت شہر کے لیئے خاصی مصیبت کا سامان ہے جب تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ تو گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھتا ہے جو آہستہ آہستہ میز، فرش، چوکھٹوں وغیرہ پر بیٹھتا جاتا ہے۔ جدّہ میں گرمی بھی ہے، گرد و غبار بھی، بدبو بھی ہے اور مکھیاں بھی۔ یہ چیزیں نو وارد کو خاصا پریشان کر دیتی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ حالات سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ اجنبیت زائل ہو جاتی ہے۔ اور شہر میں نمایاں تبدیلیوں کا جو سلسلہ جاری ہے وہ توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے وسط تک جدّہ میں گارے اور پتھر کی ایک اونچی فصیل بنی ہوئی تھی۔ یہ اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ قبائلیوں کے اچانک حملے روکے جا سکیں۔ مگر ساتھ ہی بحیرہ قلزم کی خوشگوار اور فرحت انگیز ہوا بھی رک گئی تھی جو موسم گرما میں زندگی کو قابل برداشت بنا سکتی تھی۔ اس فصیل کے خاتمے کا واقعہ یوں پیش آیا۔

امریکہ کی ایک کمپنی بیچٹل کارپوریشن[1] ہے، جس نے ارامکو[2] کے ساتھ مل کر دولت سعودیہ کی کایا پلٹ دی۔ ۱۹۴۷ء کے موسم بہار کا آخری دور تھا جب ایک روز اس کمپنی کا نائب صدر مسٹر انگلش، دولت سعودیہ کے وزیر مالیات شیخ عبداللہ سلیمان کے ساتھ موٹر میں سوار ہو کر جدّہ کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ شیخ عبداللہ سلیمان کی آرزو مدت سے یہ چلی آ رہی تھی۔ کہ جدّہ کی بندرگاہ

---

[1] International Bechtel Corporation.

[2] Arabian American Oil Company. مخفف بنا لیا گیا۔ جیسا کہ امریکیوں کا دستور ہے

میں ایک عمدہ گودی بن جائے جس کے ساتھ بڑے دخانی جہاز ٹھہر سکیں۔ دونوں اسی معاملے کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ موٹر جدہ کی فصیل کے ایک دروازے میں سے گزری تو وزیر مال نے پوچھا کہ گودی بنانے کے لیے ملبہ کہاں سے آئے گا؟ مسٹر انگلش نے تھوڑی دیر کے لیے سوچا پھر دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہمیں ایسے ملبے کی ضرورت ہے۔ وزیر مال نے فرمایا: "پھر فصیل کو ڈھا دیجیے اور ملبہ استعمال کر لیجئے۔"

فصیل مزید کچھ مدت کے لیے قائم رہی اور افواہ پھیل گئی کہ تکمیل کمپنی یہ کام انجام نہیں دے سکتی۔ لیکن ایک روز چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پوری فصیل کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا گیا اور وہ اریحا کی دیوار[1] کی طرح زمین بوس ہو گئی۔ بل ڈوزروں کے ذریعہ سے اسے ہموار کر دیا گیا اور بڑے بڑے ٹرکوں میں بھر کر ساحل پر پہنچا دیا گیا۔

جدہ ظہور اسلام سے پہلے موجود تھا، لیکن مشہور شہر کی حیثیت سے اس کی

---

[1] Jericho فلسطین کا مشہور مقام جو دریائے اردن کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ بنی اسرائیل نے مصر سے آکر فلسطین میں سب سے پہلے اسی شہر پر حملہ کیا تھا۔ اور بائیل کے بیان کے مطابق حملے کے ساتھ ہی فصیل گر گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ عین حملے کے وقت سخت بھونچال آیا جس سے فصیل گر گئی۔ ساتھ ہی دریائے اردن کا ایک حصہ تھوڑی دیر کے لیے خشک ہو گیا جیسے عام روایت کے مطابق زلزلہ بہار کے وقت دریائے گنگا دو تین منٹ کے لیے بہت سے لوگوں کو خشک نظر آیا تھا۔ یہ سب کچھ خدا کی رحمت سے ہوا اور بنی اسرائیل کامیاب ہو گئے۔ اریحا کے لفظی معنی خوشبو کے ہیں اور اریحا کا ترجمہ بوستان ہونا چاہیے۔

ابتدا ۶۴۷ء میں ہوئی جب امیر المومنین حضرت عثمانؓ نے اسے مکہ معظمہ کی بندرگاہ بنا دیا۔ ۱۵۴۱ء میں پرتگیزوں کے ایک بیڑے نے جدہ پر حملہ کیا جو ناکام رہا۔ ان نامبارک حالات میں یورپ کے ساتھ اس شہر کے تعلقات کی طویل اور بے مزہ تاریخ شروع ہوئی ۔

انیسویں صدی میں برطانیہ و فرانس نے جدہ میں قونصل خانے قائم کر لیے اور تھوڑے سے یورپی تاجروں نے وہاں سکونت اختیار کر لی۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں کو اس پر شدید اعتراض تھا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ حجاز مقدس سرزمین ہے جس پر کسی غیر مسلم کے قدم نہیں آ سکتے۔ ۱۸۵۸ء میں جوش غیظ کی یہ آگ غیر متوقع طریق پر بھڑک اٹھی۔ ۱۵۔ جولائی ۱۸۵۸ء کے "لندن ٹائمز" میں اس کی تفصیل مرقوم ہے کہ برطانوی گن بوٹ سائیکلوپس[i]، برطانوی اور فرانسیسی قونصلوں کو سویز کے راستے جدہ لایا اور ایک ہفتہ وہاں ٹھہرا رہا۔ ۱۵۔ جون کی شام تک حالت بالکل پُر سکون معلوم ہوتی تھی۔ پھر جدہ کے چند یونانی باشندے تیر کر سائیکلوپس تک پہنچے اور اطلاع دی کہ جوشیلے مسلمانوں کا ایک ہجوم بزور برطانوی قونصل خانے میں داخل ہو گیا، مکان میں جو کچھ تھا اٹھا لیا، جھنڈا پھاڑ کر پھینک دیا۔ اور برطانوی قونصل مسٹر پیج[ii] کو مار ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد یہ خبر ملی کہ اسی ہجوم نے فرانسیسی قونصل مسیو ایویلارڈ[iii] اور اس کی بیوی کو بھی ہلاک کر دیا۔ قونصل کی بیٹی اس

(i) Cyclops. (ii) Mr. Page. (iii) M. Eveillard

M. Eveillard.

کشمکش میں زخمی ہو گئی ۔ اگلے روز سائیکلوپس کے جہازیوں نے جدہ میں اُترنے کی کوشش کی لیکن انہیں گودی پر سے مار مار کر پیچھے ہٹا دیا گیا ۔ ہنگامہ چار روز جاری رہا ۔ پانچویں روز حجاز کا گورنر مکہ معظمہ سے پانسو ترک سپاہیوں کے ساتھ جدہ پہنچا ۔ اور اس نے امن بحال کیا ۔ اس وقت تک اکیس مسیحی موت کے گھاٹ اُتر چکے تھے ۔ جب ترک افسروں نے فسادیوں کے خلاف مناسب کارروائی کرنے سے انکار کر دیا تو سائیکلوپس نے شہر پر گولہ باری شروع کر دی ۔ آخر گیارہ مجرموں کو پھانسی کی سزا دی گئی[۱]

---

[۱] ۱۸۵۸ء میں بمقام جدہ جو واقعات پیش آئے تھے ، " لنڈن ٹائمز " نے ان کی صحیح کیفیت بیان نہیں کی ۔ شیخ احمد بن زینی دحلان نے اپنی کتاب " خلاصۃ الکلام فی بیان امراء البلد الحرام " میں جو کچھ لکھا ہے ۔ اس کا مفاد ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ صحیح حالات سامنے آجائیں :-

جدہ کے ایک تاجر کے جہاز پر انگریزی پرچم لہرا رہا تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی جگہ دولت عثمانیہ کا جھنڈا لگائے ۔ برطانوی قونصل نے اسے منع کیا ۔ لیکن تاجر مذکور حجاز کے ترک والی نامق پاشا سے اجازت لے چکا تھا ۔ اور اس نے جھنڈا تبدیل کر لیا ۔ انگریزی قونصل کو معلوم ہوا تو وہ جہاز پر پہنچا ، عثمانی جھنڈا اتارا اور انگریزی جھنڈا چڑھا دیا ۔ افواہ پھیل گئی کہ قونصل نے عثمانی جھنڈے کو پامال کیا اور دولت عثمانیہ کے متعلق غیر مناسب باتیں کہیں ۔ اس پر لوگوں میں جوش پیدا ہوا ۔ ۶ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸ جون ۱۸۵۸ء کو لوگ ہیجان کے عالم میں قونصل خانے پہنچے ۔ انگریز قونصل کو قتل کر دیا ۔ پھر ایک فتنہ شروع ہو گیا ، اور جدہ میں جو غیر مسلم قونصل یا نصرانی موجود تھے ، ان میں (باقی اگلے صفحہ پر)

پھر سائیکلوپس کا بحری دستہ ساحل پہ اترا۔ ترکی فوج کے ایک جیش نے اپنے تازہ بنی ہوئی قبروں تک پہنچایا۔ جن میں مقتول مسیحیوں کو دفن کیا گیا تھا۔ یہ قبریں اب بھی جدہ کے یورپی قبرستان میں دیکھی جا سکتی ہیں، جو شہر کے جنوبی حصّے میں واقع ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی بیڑا دوبارہ جدہ پر قابض ہو گیا تھا۔ یہ ترکوں کو سرزمین عرب سے نکالنے کے لیئے فوجی مہم کا ابتدائی اقدام تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یکم مئی ۱۹۳۱ء کو

(بقیہ حاشیہ صد ۱۶) سے کچھ مارے گئے اور ان کا مال لوٹ لیا گیا۔ نامق پاشا کو اطلاع ملی تو وہ خود جدّہ پہنچا۔ ساتھ ہی فتنہ فرد ہو گیا۔ جن لوگوں پر قتل یا لوٹ مار کا الزام تھا۔ انھیں گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا اور پورے واقعہ کی تفصیلات قسطنطنیہ بھیج دی گئیں پھر نامق پاشا ادائے حج کے لیے مکّہ معظمہ چلا گیا۔ حج کے بعد سب لوگ منیٰ میں جمع ہوئے۔ جب اطلاع ملی کہ انگریزی جہاز آیا اور اس نے جدّہ پہ گولہ باری شروع کر دی تو بہت سے لوگ بال بچوں اور مال متاع کے ساتھ شہر چھوڑ کر نکل گئے۔ نامق پاشا نے تمام بڑے بڑے مسلمانوں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ اکثر لوگ مقابلے کے لیے تیار تھے۔ نامق پاشا نے حسن تدبیر سے ان سب کو ٹھنڈا کیا اور ایک جماعت کے ساتھ خود جدّہ پہنچا۔ انگریزی جہاز کے کپتان سے بات چیت کی ستمبر ۱۸۵۸ء کے آخر میں سلطنت عثمانیہ کے نمائندے اور بڑے بڑے فرانسیسی بھی جدّہ پہنچ گئے۔ غرض گفت و شنید کے بعد دو بڑے آدمیوں اور تقریباً بارہ عام لوگوں کے لیے جن پر قتل کا الزام ثابت ہوا موت کی سزا تجویز ہوئی۔ کچھ لوگ قید کر دیئے گئے اور بعض کو ایک خاص مدت کے لیے جدہ سے خارج کر دیا گیا۔ فتنے کا آغاز انگریز قونصل کی غلطی سے ہوا، لیکن جدّہ میں کوئی ذمہ دار حاکم اس وقت موجود نہ تھا، اس لیئے حالات بگڑ گئے۔

دھنی تھا- اور عربی بولنے پر اسے پوری مہارت حاصل تھی - اس لئے امریکہ اور
دولت سعودیہ کے تعلقات کو بہت تقویت پہنچائی - اس کی سفارت کا نہایت
اہم واقعہ یہ ہے کہ جنوری ۱۹۴۵ء میں مرحوم بادشاہ ابن سعود، شاہی خاندان
کے بعض دوسرے افراد کے ساتھ ایک امریکی جنگی جہاز کوئنسی[i] پر سوار ہو کر پریزیڈنٹ
روز ویلٹ سے ملنے کے لیئے نہر سویز کی بڑی جھیل میں پہنچا - شاہ ابن سعود پہلے
بحرین اور کویت جا چکا تھا مگر جزیرۃ العرب سے باہر نہیں نکلا تھا - امریکہ اور
دولت سعودیہ کی دوستی کا یہ ایک نہایت اہم واقعہ تھا-

یکم جولائی ۱۹۴۶ء کو کرنل ایڈی نے استعفا دے دیا اور ان کی جگہ مسٹر
رائوز چائلڈ[ii] سفیر مقرر ہوا، جو فلیج فارس سے طنجہ[iii] تک مختلف عرب ممالک
میں نہایت شاندار اور طویل سفارتی خدمات انجام دے چکا تھا- اس نے چار
سال سے زیادہ مدت جدہ میں گزاری اور جنگ کے بعد جو مسائل پیدا ہوئے ان سے
عہدہ برآ ہوتا رہا - اس اثنا میں فلسطین کی صورت حال کی وجہ سے تناؤ کی صورت
بھی پیدا ہوئی - چائلڈز ہی کے زمانے میں ظہران کے ہوائی اڈے کے متعلق امریکہ
سے پہلا معاہدہ ہوا - اب تک چائلڈز کی اصل حیثیت پورے سفیر کی نہ تھی -
۱۱ مارچ ۱۹۴۹ء سے اسے سفیر کا درجہ مل گیا اور ۵ ستمبر ۱۹۵۰ء تک اس
عہدے پر مامور رہا - پھر ریمنڈ اے ہیر[iv] ۱۹۵۳ء کے وسط تک سفارتی وزارت
انجام دیتا رہا - بعد ازاں یہ عہدہ جارج واڈزورتھ[v] کو مل گیا جس نے پوری زندگی

(i) Quiney (ii) Rives Childs (iii) Taugier
(iv) Raymond A. Hare (v) George Waugworth

مشرقِ قریب کی سفارتوں میں گزاری ہے۔ جنگ کے بعد ابتدائی دور میں جو لوگ جدہ آتے تھے وہ ہوٹل جدہ میں قیام کرتے تھے۔ یہ چار منزلہ عمارت زمانہ جنگ میں بنی تھی، لیکن اس کے انتظامات اطمینان بخش نہ تھے۔ با ایں ہمہ امریکی یا دوسرے لوگ جو باہر سے آتے تھے، اسی میں ٹھہرتے تھے۔ پھر موجودہ ہوٹل تعمیر ہوا۔

بیت "ارامکو" (عربی امریکی تیل کی کمپنی کا صدر دفتر) جدہ کے طرز تعمیر کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ یہ اصل میں ایک دولت مند تاجر خاندان کا مکان تھا۔ اس کا پلستر کہیں سے تڑخا ہوا نہیں، کھڑکیاں سلامت ہیں اور ان پر تازہ روغن پھرا ہوا ہے۔ اسی میں تیل کی کمپنی کا نمائندہ گیری اوون[1] اپنے عملے کے ساتھ رہتا ہے۔ وہی کمپنی کی طرف سے دولت سعودیہ کے ساتھ تعلقات کا کفیل ہے۔ اس کے کمرے ٹھنڈے رکھنے کا انتظام کر لیا گیا ہے اور جدہ کی گرم صبح کے وقت بیت "ارامکو" میں لبنان کے پہاڑوں جیسی راحت افزا فضا ہوتی ہے۔

پہلے جدہ میں فصیل کے ساتھ ساتھ ایک سڑک تھی، جو پورے شہر کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔ فصیل ڈھا دی گئی تو یہ سڑک اور چوڑی ہو گئی۔ اب یہ ایک سایہ دار شاہراہ ہے۔ جو بیت "ارامکو" سے شروع ہو کر بندرگاہ کی آخری حد تک جاتی ہے۔ پھر یہ سمندر کے کنارے جنوب کی جانب نکل گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بڑی شاندار عمارتیں کھڑی ہیں۔ انہی میں مصر، ہالینڈ، شام، عراق

---

[1] Garry Owen

لبنان، فرانس، چین اور برطانیہ کے سفارت خانے اور قونصل خانے ہیں۔

برطانوی سفارت خانے کے باغ میں لکڑی کا ایک چبوترہ سا بنا ہوا ہے، جہاں کسی زمانے میں بینڈ (باجا) بجایا جاتا تھا۔ یہ پہلی جنگ عظیم میں غیر معمولی حالات کے ماتحت بنایا گیا تھا۔ لارنس[1] اور رونالڈ سٹورز[2] اس وقت عرب میں برطانوی سیاسی معاملات کے کفیل تھے۔ وہ ایک رات بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شریف حسین (سابق شاہ حجاز) نے دریافت کیا "آیا آپ لوگ پسند کریں گے کہ جو بینڈ ترکوں سے ہاتھ لگا ہے، آپ کو سنایا جائے۔ دونوں انگریز انکار کر ہی نہ سکتے تھے۔ چنانچہ جو بینڈ مکہ میں بج رہا تھا، ان دونوں نے جدہ میں بیٹھ کر سنا۔ اور شریف کا شکریہ ادا کیا۔ شریف نے اسی وقت بتا دیا کہ بینڈ عنقریب آپ کے پاس جدہ بھیج دیا جائے گا۔ اس واقعہ سے کچھ مدت بعد امیر عبداللہ (ابن شریف حسین) کھانے کی دعوت کے سلسلے میں برطانوی مرکز میں آیا تو اس کے پیچھے پیچھے پرانی ترکی وردیاں پہنے ہوئے بینڈ والے لوگ بھی تھے۔ پر لطف امر یہ ہے کہ انہوں نے بینڈ میں جرمنی کا قومی گیت بجایا۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ انہیں ترکی بھیج دیا جائے، لیکن امیر عبداللہ اور شریف حسین کو یہ بینڈ اتنا پسند تھا کہ یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ چبوترا اسی بینڈ کے لئے بنوایا گیا تھا۔

اسی سایہ دار شاہراہ پر ان بڑی بڑی یورپی کمپنیوں کے دفتر ہیں، جو جدہ میں کاروبار کر رہی ہیں۔ مثلاً امریکہ کی بین الاقوامی تعمیری فرم انٹرنیشنل

(i) Lawrence (ii) Ronald Storrs

یہاں امریکہ کی ایسٹرن ٹریڈنگ کارپوریشن اور برطانیہ کی جیلٹلی ہینکی کمپنی؎ جو بحیرۂ روم کے آس پاس کی غالباً سب سے زیادہ مشہور تجارتی فرم ہے۔ آخرالذکر کمپنی درآمد و برآمد کے علاوہ بینک بھی چلاتی ہے۔ اسی کمپنی نے وادی فاطمہ کا پانی نلوں کے ذریعہ سے جدہ پہنچایا۔ دونوں مقامات کا درمیانی فاصلہ قریباً تیس میل ہے۔ اس طرح جدہ میں قلت آب کی شکایت ایک حد تک دور ہو گئی۔ اس اثنا میں شہر کی آبادی بیس ہزار سے ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ ہو گئی۔

بہم رسانی آب کے اس جدید نظام کا افتتاح ۱۸۔ نومبر ۱۹۴۷ء کو بڑے شاندار طریقے پر ہوا۔ شہر کے شمالی دروازے پر نل ختم ہوتے تھے۔ وہاں ایک چشمہ بنا دیا گیا۔ جہاں پر پر تکلف دعوت کا انتظام ہوا۔ اس میں کم و بیش پچیس ہزار آدمی شریک تھے۔ انہی میں وزیر مال بھی تھا۔ اور ولی عہد سلطنت بھی آئے جو آجکل دولت سعودیہ کا بادشاہ ہے۔ جسے اس تقریب کے لئے بطور خاص دعوت دی گئی تھی۔ شاہی خاندان کے دوسرے افراد اور مختلف سفارتوں کے نمائندے نیز بہت سے ممتاز اصحاب بھی شریک تھے۔ اس موقع پر تقریریں بھی ہوئیں ۔۔ دولت سعودیہ کے ہوائی بیڑے کے چھ جہاز بھی مصروف پرواز تھے۔ افتتاح یوں ہوا کہ سب سے پہلے ولی عہد نے نلوں کے ذریعہ سے آیا ہوا پانی چاندی کے پیالے میں پیا۔

برطانوی سفیر کے مکان سے ذرا آگے سایہ دار شاہراہ اندر کی طرف آجاتی ہے۔ یہاں سمندر کے کنارے ایک بہت بڑی پرانی عمارت ہے جسے بیت بغدادی؎

؎ Gellatly Hankey Company

کہتے ہیں۔ یہ جدہ کے خاص طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ترکی
گورنر رہتا تھا۔ پھر اسے عرب کے مشہور سیاح اور کتنت سینٹ جان فلبی نے
لے لیا۔ "دارالمکہ" کا پہلا مرکز جدہ میں بھی "بیت بغدادی" تھا آج کل اس
میں کم و بیش پچاس خاندان مقیم ہیں اس کے قریب ہی سوق یا منڈی کا دروازہ
ہے جس کے اندر نئے نمونے کی بھی بہت سی دکانیں بنی ہوئی ہیں تاکہ معلوم ہو
جدہ نئی وضع اختیار کر رہا ہے۔ اس کا نام سوق امیر فیصل ہے، لیکن زیادہ تر
لوگ اب بھی پرانے سوق ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ جس میں تنگ اور پیچ دار گلیاں
ہیں اور پرانی وضع کی عامیانہ سی دکانیں۔ کہیں تو ایک بیٹھا ہے اور اپنے
لیے چار مربع فٹ جگہ ہی کافی سمجھتا ہے۔ کہیں قالین فروش بیٹھا ہے اور اس
کی دکان کم از کم تیس فٹ لمبی، بیس فٹ چوڑی ہوگی۔ عرب کے صرافوں سے
ہر قسم کی کرنسی مل سکتی ہے۔ جدہ میں برطانیہ کی طلائی اشرفی کو سب سے گراں
قیمت سکہ سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ روپیہ جمع رکھنے کے لیے بھی موزوں ہے
اور بڑا کاروبار بھی اس کے ذریعے بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ اس اشرفی کی عام قیمت
ساڑھے آٹھ ڈالر ہے، لیکن جدہ میں یہ گیارہ سے بیس ڈالر تک فروخت ہو سکتی ہے
قیمت کی کمی بیشی رسد و طلب پر موقوف ہے۔ پھر جن اشرفیوں پر شاہ جارج
کی تصویر ہو، وہ ایڈورڈ کی تصویر والی اشرفیوں سے اور ایڈورڈ کی اشرفیاں
وکٹوریہ کی اشرفیوں سے زیادہ قیمت پاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سکہ جتنا
پرانا ہوگا گھسنے سے اتنا ہی سونا کم ہو جائے گا۔

دولت سعودیہ کا عام سکہ ریال ہے۔ یہ چاندی کا ہوتا ہے۔ اور آج کل

انگلستان، امریکہ اور میکسیکو کی ٹکسالوں میں تیار ہوتا ہے۔ عربین امریکن آئل کمپنی کے وسیع کاروبار اور تنخواہوں کے وسیع سلسلے کے باعث ریال کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات نئے تیار شدہ ریال ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے عرب پہنچائے جاتے ہیں۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ ریال کے انبار ہوائی جہازوں سے اتار کر ٹرکوں میں لاد دیئے جاتے ہیں اور عرب ڈرائیور حفاظتی دستے کے بغیر ہی انہیں بینک یا وزارت مال میں پہنچا دیتے ہیں اور وہاں ریالوں سے بھرے ہوئے صندوق معقول حفاظت و نگرانی کے بغیر پڑے رہتے ہیں۔

ریال کے علاوہ میریا تھریسیا کا ٹالر بھی ملتا ہے۔ جو ماضی قریب تک حبشہ کا معیاری سکہ تھا۔ اور یمن میں اب تک اس کا رواج ہے۔ دولت سعودیہ میں کاغذی سکہ ہنوز رائج نہیں ہوا۔ جدہ کے بعض صرافوں کے پاس مختلف قسم کے سکے موجود ہیں۔ مثلاً پرانے ترکی سکے یا زاروں کے عہد کے روسی سکے، ہندی اور چینی سکے، رومہ، یونان اور حمیر (جنوبی عرب) کے پرانے سکے۔ جدہ میں دستکاری کے جو نمونے ملتے ہیں وہ عموماً معمولی اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شاہ ابن سعود راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باعث تصویروں اور نقش و نگار کے سخت خلاف ہے۔ لکڑی کی کھڑاویں بڑی اچھی بنتی ہیں جن میں چمڑے کی پٹیاں لگی ہوتی ہیں۔ اور ان پر نیلا اور نقرئی کام ہوتا ہے۔ جدہ کے دستکار چاندی کے سکوں سے پہنچیاں، کانوں کے آویزے اور پیٹیوں کے بکل بناتے ہیں۔ قالین بھی بنتے ہیں، لیکن دولت سعودیہ کے عرب تاجر

زیادہ تر قالین ایران اور ہندوستان سے منگاتے ہیں۔ بکری یا اونٹ کی پشم کا کپڑا ابھی تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ باقی عام کپڑا دنیا کے ہر حصّے سے منگوایا جاتا ہے۔ ارزاں پارچوں میں ہندوستان کو اور زیادہ قیمتی پارچوں میں برطانیہ اور امریکہ کی مصنوعات کو ترجیح حاصل ہے۔

جدہ میں حفظانِ صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے موسم خزاں میں مصر کے اندر ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی تو دولت سعودیہ اس سے بالکل محفوظ رہی۔ اس زمانے میں ہر شخص کو بندرگاہ جدہ کے قریب ایک جزیرے میں پانچ دن کے لیے رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ کے بیٹے بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہ تھے۔ قرنطینہ میں پانچ دن گزارنے کے بعد ساحل پر اترنے کی اجازت دی جاتی تھی

سوق یا منڈی سے آگے جدہ کی سب سے بڑی تجارتی فرم نیدرلینڈز ٹریڈنگ سوسائٹی[1] کا نیا دفتر ہے جسے عام طور پر ڈچ بینک (ولندیزی بینک) کہتے ہیں جزائر شرق الہند (موجودہ انڈونیشیا) کے کروڑوں مسلمانوں میں سے ہزاروں ہر سال حج کے لیے جاتے ہوئے جدہ سے گزرتے ہیں۔ ولندیزی بینک اس کاروبار کی وجہ سے بہت خوشحال ہو گیا ہے۔ ایک اور مالی ادارے بینک دی لا انڈوچین[2] (بینک ہند چینی) کی بھی ایک شاخ جدہ میں موجود ہے، جو طلائی اشرفیوں کے مبادلے کا نفع بخش کاروبار کر رہا ہے۔

جدہ میں بہت سی مسجدیں ہیں۔ ان میں سے اکثر کے مینار نہیں۔ ایک مسجد

(i) Netherlands Trading Society

(ii) Banque de l' Indochine

ڈچ بینک کے قریب ہے۔ اس کا مینار ایک طرف اتنا جھک گیا ہے کہ وہ پیسا کے مینار خمیدہ کا حریف معلوم ہوتا ہے۔

ڈچ بینک کے جنوب میں وہ عمارت ہے جہاں امریکی سفارت خانے کا عملہ رہتا تھا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک امریکی سفارت خانے کا ہسپتال بھی اسی عمارت میں تھا جنگ کے دوران میں دولت سعودیہ کے مغربی حصے میں اس کے سوا دور حاضر کا کوئی طبی مرکز نہ تھا۔ بیرونی سایہ دار شاہراہ آخر ایک میدان پہ ختم ہوتی ہے جسے "میدان ملک عبدالعزیز" کہتے ہیں یہ جدہ کا بہت بڑا چوک ہے۔ شہر کی تمام تقریبات جشن اور دعوتیں اسی جگہ ہوتی ہیں کبھی کبھی اس مقام کو مقتل کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہیں سمندر کے کنارے چنگی خانہ واقع ہے۔ اس کے دونوں طرف بہت سی گھاٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ ایک طرف قرنطینہ والوں کے اترنے کی گودی ہے۔ دوسری طرف عازمین حج اترتے ہیں۔ دولت سعودیہ کی بندرگاہوں مثلاً "دیجہ" یلیمرح اور لیت نیز پورٹ سوڈان اور عدن کی بندرگاہ سے جدہ سے مسافر عموماً آتے رہتے ہیں۔ البتہ سال بھر میں دو مہینے بڑا ہجوم رہتا ہے اور یہ مقام خاص سرگرمیوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ چالیس ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک عازمین حج اطراف عالم سے جدہ اترتے ہیں۔ وہ علاقائی عربی اور کم و بیش ایک درجن دوسری زبانیں بولتے ہیں۔ ان میں فقیر اور درویش بھی ہوتے ہیں، دولت مند تاجر اور امراء بھی۔ ان کے ساتھ بیسیوں نوکر چاکر ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ زندگی میں صرف ایک دفعہ حج کرتے ہیں۔ وہ سال ہا سال تک اس غرض سے پیسے بچاتے

رہتے ہیں اور جب آتے ہیں تو دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے حج دولت
سعودیہ کے لوگوں کے لیے خاصے بڑے کاروبار کا ذریعہ بن گیا ہے۔ جنگ یا بیماری
کے باعث رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے تو مختلف ملکوں کے سکوں میں ساٹھ لاکھ سے
اسی لاکھ ڈالر تک رقم دولت سعودیہ کے خزانے میں پہنچ جاتی ہے۔ بعض لوگوں
کو جدہ پہنچنے میں ایک ایک دو دو سال لگ جاتے ہیں، لیکن عام مسلمان سفر
حج کا انتظام کارندوں کی معرفت کر لیتے ہیں، جو روپیہ لے کر ہر چیز کا بندوبست
کر دیتے ہیں۔ اگرچہ بعض عازمین حج اب بھی خشکی کے راستے اونٹوں پہ سوار
ہو کر آتے ہیں، لیکن زیادہ تر لوگ جہازوں میں پہنچتے ہیں اور یا پانچ روز
طور یا جدہ کے قرنطینہ میں گزار کر ساحل پہ اترتے ہیں۔ تین چار ہزار
دولت مند مسلمان ہوائی جہازوں کے ذریعہ مکہ پہنچ جاتے ہیں۔ ارض مقدس
میں پہنچنا نیک دل مسلمانوں کے لیے بڑی ہی سعادت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ وہ
اس سرزمین مقدس کو سینہ سے لگا کر بوسہ دیتے ہیں جو رسول پاک صلعم
کے قدمہائے مبارک سے مشرف ہوئی۔ موسم حج میں جدہ کے بہت سے لوگ
عازمین حج کو اپنے ہاں جگہ دے دیتے ہیں اور ان سے رقمیں وصول کر لیتے
ہیں۔ خاصی تعداد کھلی جگہ ہی میں بیٹھ جاتی ہے۔ جب عازمین حج کی آمد
کا زور ہو تو میدان ملک عبدالعزیز دن رات کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ زیادہ
تر لوگ جدہ سے اونٹوں پہ سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچتے تھے۔ اب پکی سڑک
بن گئی ہے۔ بسوں کا بیڑا رات دن اس پہ دوڑتا رہتا ہے اور دو دن کا
سفر دو گھنٹے میں پورا ہو جاتا ہے۔ جگہ جگہ لاؤڈ سپیکر لگا دیئے جاتے ہیں تاکہ

بسوں کی آمد کے متعلق حاجیوں کو بر وقت اطلاعات ملتی رہیں۔ کوئی غیر مسلم مکہ معظمہ کی سڑک پر پندرہ میل سے آگے نہیں جا سکتا، جہاں سیاہ پہاڑی کے دامن میں پتھر کا ایک نشان نصب ہے۔ سبز قرنطینہ کی گودی کے برابر ہی ایک گلابی رنگ کی عمارت ہے۔ یہ وزارت مال ہے، جس میں شاہ ابن سعود کے دست راست اور مشیر خاص شیخ عبداللہ سلیمان دولت سعودیہ کے روز افزوں مالیات کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے کرتے رہے۔ وہ اپنا زیادہ وقت جدہ میں گزارتے تھے، لیکن دوسرے اہم معاملات کی طرح بڑے بڑے مالی مسائل بھی ریاض میں طے ہوتے تھے، جو دولت سعودیہ کا سیاسی مرکز ہے۔

میدانِ ملک عبدالعزیز کے جنوب میں سفید عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے، جس میں فورڈ اور لنکن موٹروں کی نمائش گاہ، مرمت کا کارخانہ اور دفتر ہے۔ اس عمارت کا مالک شیخ علی رضا کا خاندان ہے۔ یہ سب سے زیادہ ذی اثر تاجر اور حجاز کے حد درجہ دولت مند خاندانوں میں سے ایک ہے۔ انہوں نے موتیوں، زنانہ ریشمی کپڑوں اور خوشبوؤں کی تجارت میں کروڑوں ڈالر پیدا کیے۔ آج کل یہ فورڈ اور لنکن کی موٹروں اور زینتھ کے ریڈیو کی تجارت کر رہے ہیں۔ علی رضا والوں نے ایک مرتبہ پرانے ٹرکوں کے لیے امریکہ آرڈر بھیجا کہ انہیں جدہ پہنچانے کے لیے پورا جہاز کرایہ پر لینا پڑا۔ سنہ ۱۹۴۹ تک دولت سعودیہ کے بحیرۂ قلزم والے ساحل پر کوئی ایسی گودی نہ تھی جہاں بحری جہاز ٹھہرائے جا سکتے اس لیے علی رضا والوں کو خاص انتظام کرنا پڑا، جس کے بعد موٹروں اور ٹرکوں کو جہاں جی چاہے اتارا جا سکتا ہے۔ نمائش گاہ سے ملا ہوا گیراج حسنِ انتظام

کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دکان میں موٹروں کے مختلف پرزے بھرے پڑے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ دولت سعودیہ میں موٹریں بہت جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ علی رضا کے خاندان کے ایک نوجوان نے کیلیے فورنیا کی یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ایک امریکی لڑکی سے شادی کرلی۔ وہ امریکی اوضاع کو بہت پسند کرتا ہے اور اپنا پورا وقت کاروبار میں لگا دینا چاہتا تھا۔ لیکن امیر فیصل ولی عہد و وزیر خارجہ سعودیہ کے مشیر و ترجمان کی حیثیت میں اسے پورا وقت صرف کرنا پڑا۔ انجمن اقوام متحدہ میں وہی دولت سعودیہ کا سب سے بڑا نمائندہ تھا اور آج کل وزیر دولت ہے۔

جدّہ کے حوالی میں رہنے کے لیے زیادہ خوشگوار مقام اس سڑک کے قریب واقع ہے جو ہوائی اڈے کی طرف جاتی ہے۔ یا نسبتاً وہ بلند مقام، جو شہر کے شمال میں واقع ہے۔ جدّہ کے غیر ملکی باشندوں اور دولت مند تاجروں نے بھی شہر سے باہر نکل کر شمالی و مشرقی سمت میں مکان بنانے شروع کردیے ہیں ان مقامات تک سڑکیں وہاں سے شروع ہوتی ہیں، جہاں ایک زمانے میں باب مکہ تھا۔ کھاڑی کے کنارے فوجی بارکیں ہیں جن کے پھاٹک پر بڑے پھول والی توپیں کھڑی ہیں۔ نئے مکانوں کی قطاروں سے آگے بڑھیں تو شاہی محل کی مسطح عمارت نظر آتی ہے۔ اس عمارت کی بڑی خصوصیت ایک چکر دار پشتہ ہے جو دوسری منزل تک جاتا ہے۔ اس پر سے موٹریں آجا سکتی ہیں۔

پرانے باب مکہ کے شمال مشرق کی طرف ایک احاطہ ہے۔ اس کے اندر ایک

چالیس فٹ لمبی قبر ہے جسے عام طور پر حضرت حوا کی قبر قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں پہلے بہت لوگ آتے جاتے تھے۔ شاہ ابن سعود کے زمانے میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اہل جدہ اب بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ ان کے شہر کا نام حضرت حوا کی وجہ سے جدہ (دادی جان) رکھا گیا۔

جدہ میں ایک پرانی وضع کا مکان ہے جسے لاوارث عورتوں کی پناہ گاہ بنایا جاتا ہے۔ یہاں بیوہ عورتیں یا وہ خواتین رہتی ہیں جن کے رشتے داران کی دیکھ بھال کے لیئے تیار نہ ہوں۔

جدہ کے دولت مند خاندان موسم گرما میں یا تو طائف چلے جاتے ہیں۔ یا مکہ معظمہ، مدینہ منورہ یا ریاض جو اندرون ملک میں قریباً پانسو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دولت سعودیہ میں ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے سفر کا انتظام ہو جانے کے باعث ان شہروں تک آنا جانا آسان ہو گیا ہے اور سفر بہت جلد طے ہو جاتا ہے۔ ہر پرواز میں برقع پوش عورتیں ضرور ہوتی ہیں۔ جن کے ساتھ بچے اور حبشی غلام جاتے آتے ہیں۔ قاہرہ بیروت اور دمشق تک صرف پانچ گھنٹے یا اس سے بھی کم مدت میں جا سکتے ہیں۔ اس وجہ سے حجاز کی عورتیں اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے وقتاً فوقتاً جاتی رہتی ہیں۔

جدہ میں کوئی سینما گھر نہیں، البتہ مختلف سفارت خانوں میں تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ ایک مدت تک یہ دستور رہا کہ تمام یورپی سفیر تصویریں دیکھنے کے لیے کسی ایک سفارت خانے میں جمع ہو جاتے تھے۔ جدہ کے ہوائی اڈے اور دولت سعودیہ کی شرکت معدنیات کے صدر دفتر میں بھی تصویریں دکھائی۔

جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ حجاز کے پہاڑی علاقے میں جہاں کان کنی کا کام جاری ہے۔ نیز الخرج میں جہاں امریکہ کا زرعی مرکز ہے متحرک تصویروں کی نمائش کا انتظام ہے۔[1]

---
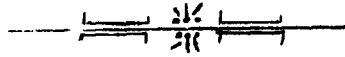
[1] جدہ اور دولت سعودیہ کی ممکن دوسری مزید ضروری معلومات کے لیئے وہ ضمیمہ ملاحظہ فرمایئے جو مترجم نے دولت مذکورہ کے متعلق تذکرہ کے آخر میں لگا دیا ہے۔

دوسرا باب

سلیمانی عہد کی ایک کان

سرزمین عرب کو دور حاضر کی ترقیات سے مستفید کرنے کی باتیں تو بہت ہوتی رہیں لیکن اس سلسلے میں جس شخص نے پہلا عملی قدم اٹھایا وہ ایک امریکی تاجر اور ڈپلومیٹ تھا، یعنی چارلس آر کرین[1]۔ امام یحییٰ مرحوم والی یمن کے ساتھ کرین کے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس حد تک ممکن ہو امام کی مدد کرے۔ چنانچہ اس نے بطور خود چار نکاتی پروگرام تیار کر لیا اور سوا ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم سڑکوں، پل، پانی کے پمپوں اور دوسرے رفاہی کاموں میں صرف کر دی۔ اس سلسلے میں ایک نوجوان امریکی

---

[1] Charles R. Crane واضح رہے کہ کرین سنہ 1919 میں جو پریذیڈنٹ امریکہ صدر ولسن کی طرف سے فلسطین کے حالات دیکھنے کے لیے ایک کمیشن کا ممبر بن کر آیا تھا جسے کنگ کرین کمیشن کہتے تھے۔ اس کمیشن نے جو رپورٹ کی تھی۔ افسوس کہ اسے برطانیہ اور فرانس یا یوں کہنا چاہیئے کہ لائڈ جارج، پیرچل اور کلیمنشو کی خود غرضیوں نے پردے کار نہ آنے دیا۔

انجینیر کارل ایس ٹوچل[1] سے بڑی امداد ملی جس کی خدمات کرین نے ۱۹۲۷ء میں حاصل کی تھیں۔ ٹوچل چھ سال تک یمن کے کوہستانی علاقوں میں مصروف کار رہا۔ اس اثنا میں اس کی شہرت سے پورا جزیرۃ العرب اگونج اٹھا۔ جب کرین نے شاہ ابن سعود سے ملاقات کی تو شاہ نے فرمایا کہ آیا ٹوچل ہمارے ہاں بھی آ سکتا ہے تاکہ کھیتی باڑی کے لیے ہمارے آبی وسائل اور دوسرے منصوبوں پر عمل میں امداد دے؟ کرین نے شاہ کی بات مان لی۔ اور ۱۹۳۱ء کے آغاز میں ٹوچل سعودی عرب میں چکر لگاتا رہا۔ تاکہ آبی وسائل اور معدنیات کا اندازہ کرے۔ ان سفروں میں اکثر اس کی جوان ہمت انگریز بیوی بھی ساتھ ہوتی تھی۔ ٹوچل کا ایک کام یہ بھی تھا کہ دولت سعودیہ میں ایسی اشیاء کا پتہ چلائے جنھیں باہر بھیجا جا سکے اور دولت سعودیہ کے لیئے عازمین حج کے علاوہ بھی مستقل آمدنی کا ذریعہ نکل آئے۔

۱۹۳۲ء میں ٹوچل نے شیخ عبداللہ سلیمان وزیر مال کے پاس رپورٹ پیش کر دی کہ مغربی دولت سعودیہ یعنی حجاز اور عسیر میں معدنیات کا امکان ہو سکتا ہے۔ مثلاً تانبا، پلاٹینم، سیسہ یہ امکان بھی ہے کہ چاندی اور سونا مل جائے۔ اس سے پیشتر ٹوچل ایک مسیحی تبلیغی مشن میں ایک خاتون سے ملا تھا۔ اس نے پوچھا تھا۔ آیا آپ نے عرب کی مشہور معدنیات طلا بھی دیکھی ہیں؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ بائبل نے حویلہ میں ہونے کی کانوں کا ذکر کیا ہے۔ اور اس سونے کو چوکھا بتایا ہے۔ کتاب پیدائش باب دوم آیت ۱۱-۱۲)

---

[1] Twitchell مزید تفصیلات آپ کو یمن کے باب میں ملیں گی۔

ڈمپل کو اس اطلاع سے خاص دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے بائبل میں معدنیات طلا کے دوسرے حوالے بھی تلاش کر لیئے۔ مثلاً سلاطین اول میں مذکور ہے۔

اور بنی اسرائیل کے ملک مصر سے نکل آنے کے بعد چار سو اسی ویں سال اسرائیل پر سلیمان کی سلطنت کے چوتھے برس ..... ایسا ہوا کہ اس نے (سلیمان نے) خداوند کا گھر بنانا شروع کیا (باب ششم آیت ا)

...... اور سلیمان نے اس گھر کو اندر اندر خالص سونے سے منڈھا اور الہام گاہ کے سامنے اس نے سونے کی زنجیریں تان دیں۔ اور اس پر بھی سونا منڈھا اور اس پورے گھر کو جب تک وہ سارا گھر تمام نہ ہو گیا اس نے سونے سے منڈھا اور الہام گاہ کے پورے مذبح پر بھی اس نے سونا منڈھا۔

باب ششم آیت (۲۱-۲۲)

بائبل پڑھنے والوں کو شاید حیرانی ہوتی ہوگی کہ یہ سونا کہاں سے آیا۔ چونکہ عہد قدیم میں سونا نکالنے کے طریقے چنداں اچھے نہ تھے، لہذا سمجھ لیا گیا کہ یہ ایک کان سے نہیں بلکہ مختلف کانوں سے حاصل کیا گیا ہوگا۔ سلاطین اول میں بتایا گیا ہے:-

پھر سلیمان بادشاہ نے ..... ادوم کے ملک میں بحیرہ قلزم کے کنارے ..... جہازوں کا بیڑا بنایا اور حیرام نے اپنے ملازم سلیمان کے ملازموں کے ساتھ اس بیڑے میں بھیجے۔ وہ ملاح تھے جو سمندر سے واقف تھے وہ اوفیر کو گئے۔ اور وہاں سے چار سو بیس قنطار سونا

لے کر اسے سلیمان بادشاہ کے پاس لائے۔ (باب نہم آیت ۲۶-۲۸)
سوال یہ تھا کہ اوفیر کی سرزمین کہاں ہے۔ آیا یہ ربع الخالی کے قلب کا مشہور افسانوی شہر اوبار تھا، جو اب ناپید ہو چکا ہے یا یہ مقام عمان میں تھا، جو مسقط کے شمال میں ساحل پر واقع ہے، یا حبشہ میں تھا یا یمن میں۔

ٹوچل نے شیخ عبداللہ کو بتایا کہ "میں سمجھتا ہوں یہ کانیں حجاز میں تھیں۔ اس لئے کہ زمانۂ قدیم کی زیادہ تر معدنیات طلا ارض مدین میں تھیں۔ جو وادی حمض کے شمال میں ہے اور اس خطے کی کیفیت رچرڈ برٹن[۱] نے اپنی کتاب "مدین کی معدنیات طلا"[۲] میں بیان کی ہے"۔ ٹوچل نے سادہ انداز میں ایک کتابچہ لکھ دیا، جس میں تفصیلات بیان کر دیں کہ کس کس قسم کی چٹانوں میں کیا کیا دھاتیں ہو سکتی ہیں۔ وزیر مالیات نے اس کا ترجمہ عربی میں کرا لیا۔ اس کے بعد وہ جب بھی دولت سعودیہ میں دورے پر نکلتا تو جگہ جگہ چٹانوں اور پتھروں کا معائنہ ٹوچل کے بیانات کی روشنی میں کرتا رہتا۔ جب ٹوچل سے وزیر موصوف کی ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان دونوں سے تقریباً یکساں فاصلے پر ایک پہاڑ ہے۔ جس کے شمالی حصے میں سفید چٹانوں کی رگیں نمایاں ہیں اور یہ چٹانیں ویسی ہی ہیں، جیسی ٹوچل کے نزدیک طلائی معدنیات کی چٹانیں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ وزیر موصوف نے سواری کا انتظام کر دیا اور ٹوچل فوراً اس مقام کی طرف روانہ ہو گیا[۵۳]۔

(i) Burton (ii) The Golden Mines of Midian

۵۳ یہ تفصیلات خود ٹوچل اور بعض دوسرے وسائل سے حاصل ہوئیں۔

آٹھ روز بعد شدید مشکلات سے گزرتے ہوئے ٹوچل کا قافلہ اس پہاڑ پر پہنچ گیا۔ جسے "مہد ذہب" یعنی سونے کا گہوارہ کہتے ہیں۔ یہاں یقیناً سونا موجود تھا اور ممکن ہے ایک زمانے میں یہ حضرت سلیمانؑ کی نہایت قیمتی کان رہ چکی ہو۔ ایسے آثار بھی موجود تھے کہ اس میں کسی نہ کسی وقت کھدائی ہو چکی تھی۔ ممکن ہے فونیقیوں اور رومیوں نے یہ کھدائی کی ہو۔ نیز خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں بھی اس سے فائدہ اٹھایا گیا ہو۔ پھر شاہ ابن سعود سے باقاعدہ اجازت نامہ لے کر ٹوچل سرمایہ کے انتظام کے لیئے امریکہ روانہ ہو گیا۔ بعد ازاں انگلستان پہنچا۔ ۱۹۳۴ء میں دولت سعودیہ عربیہ کی "شرکت معدنیات" بن گئی۔ ۱۹۳۹ء کے موسم گرما میں کام شروع ہو گیا۔ اور آجکل یہ دولت سعودیہ کے مغربی حصے میں سب سے بڑا صنعتی کاروبار ہے۔

اس مقام پر پہنچنے کے لیئے ضروری ہے کہ آدمی تڑکے اٹھے اور صبح کی خنکی میں روانہ ہو جائے۔ اپنے ساتھ کم از کم دو موٹریں رکھنی چاہئیں ان میں سے ایک سٹیشن ویگن ہو تو اچھا ہے۔ ایک ٹرک میں تیل، پانی اور دوسرا سامان لاد لینا چاہیئے۔ دولت سعودیہ کے عرب محافظ بھی ساتھ لے لینے چاہئیں جو صحرائی جنگوں کے ماہر ہیں۔

شرکت معدنیات کی گودی اور میلے کی قیامگاہ سے آگے بڑھیں۔ تو تقریباً آدھ گھنٹے تک سڑک ساحل کے ایک ریگستانی میدان میں سے گزرتی ہے، جس میں کہیں کہیں سبزہ اور صحرائی جھاڑیاں نظر آتی ہیں۔ بدو گلہ بانوں کے لڑکے ریوڑ چراتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں کہیں میدان میں سفید دم والے

ہرن بھی مل جاتے ہیں۔ شرکت معدنیات نے جو شاہراہ بنائی ہے، وہ دولت سعودیہ کی بہترین سڑک ہے اور موٹر میں اڑھائی سو میل کا فاصلہ تقریباً دس گھنٹے میں طے کر لیتی ہیں۔ جدہ سے چار پانچ میل پر پہنچ جائیں تو ایک کنواں ملتا ہے جس میں سے پون چکی کے ذریعے پانی نکلتا ہے۔ عرب میں ایسے چند ہی کنوئیں ہیں۔ چونکہ یہ ساحل سے قریب ہے اور ہوا بھی تیز چلتی رہتی ہے نیز پانی کی سطح نسبتاً قریب تر ہے، اس لیے خوب کام دیتی ہے۔ آگے بڑھیں تو میدان ختم ہو جاتا ہے اور بنجر پہاڑیوں پر چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک پہاڑی کی چوٹی پر کوئی دو سو سال پرانے سنگین قلعے کے کھنڈر نظر آتے ہیں جس کے چھ برج شکستہ حالت میں موجود ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ترک اس مقام کو اپنے خطِ رسد کا ایک اہم مرکز سمجھتے تھے۔

قلعے سے چند میل آگے جائیں تو ایک وادی آ جاتی ہے۔ اس میں ایک جگہ گرد آلود نخلستان دکھائی دیتا ہے اور پاس ایک گاؤں ہے اس میں کوئی ایک سو گھر ہوں گے جو کھجور کے تنوں اور شاخوں پتوں وغیرہ سے بنائے گئے ہیں۔ یہی مقام ہے جہاں بغداد کے قافلہ ہائے حجاج چھبیس روزہ کی مشقت خیز مسافت کے بعد اس طریقِ حج پر پہنچتے ہیں جو دمشق سے مکہ معظمہ آتا ہے۔ رسول اللہ صلعم ہجرت کر کے مکہ معظمہ سے نکلے تھے تو مدینہ منورہ جاتے ہوئے اس مقام پر بھی ٹھہرے تھے۔ اسی واقعہ سے اسلامی تقویم کا آغاز ہوا۔ (۶۲۲ء) آج حجاز خشک اور بنجر نظر آتا ہے۔ لیکن ایسی شہادتیں موجود ہیں۔ کہ ایک زمانے میں بارش کا پانی بہت بڑی آبادی کے لیے گزارے کے مطابق غلہ پیدا

کر دنیا تھا۔ اور جگہ جگہ پرانے بندوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ جن میں سے بعض پندرہ پندرہ فٹ تک اونچے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ترکوں کے زمانے کا معلوم نہیں ہوتا اور غالب قیاس یہ ہے کہ یہ بند تیرھویں اور چودھویں صدی میں بنائے گئے ہونگے۔ ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان بندوں کے ذریعے سے زراعت کے لئے پانی محفوظ بھی ہو جاتا تھا اور سیلاب کی مصیبتیں بھی پیش نہ آتی تھیں۔

جدہ سے چار گھنٹے کی مسافت کے بعد سڑک چکر کھاتی ہوئی ایک مسطح بلندی پر پہنچ جاتی ہے جسے عرب کی سطح مرتفع کا مغربی کنارہ سمجھنا چاہیئے۔ اس مقام سے کوئی پچاس میل تک جو خطہ پھیلا ہوا ہے، وہ دنیا کے صد درجہ ویران اور بنجر علاقوں میں سے ہے۔ اسے حرہ کہتے ہیں یعنی جلا ہوا مقام۔ یہ ایک ایسی چٹان پر مشتمل ہے جس کے متعلق سمجھا جا سکتا ہے کہ لاوے کا ایک سیل آیا اور ٹھنڈا ہو کر لاکھوں ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ جو مسافر وسط عرب سے مکہ یا جدہ آئیں۔ ان کے لیئے لازم ہے کہ اس خطے سے گزریں۔ کوئی مسافر خواہ وہ پیدل ہو یا اونٹ پر سوار دن کی گرمی میں اس خطے سے گزرنا ناقابل برداشت سمجھتا ہے۔ اگر کوئی شخص سٹیشن ویگن میں بھی آئے تو یہ احساس تازہ رہتا ہے کہ ایٹم بم سے تباہ شدہ دنیا کا وہ تھوڑا حصہ ہے جو بچ نکلا۔ ایک مقام پر حرہ دو پہاڑیوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک سفید سنگ مرمر کی معلوم ہوتی ہے اور دوسری سیاہ سنگ مرمر کی۔ یہ مقام جدہ سے کوئی سوا سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور قافلہ یہاں سے جنوبی جانب مڑ کر اس سنگلاخ درے کی طرف جاتا ہے، جسے وادی حمتا کہتے ہیں۔ اس مقام پر شرکت نے ایک مکان بنا دیا ہے۔ اس کے پاس ایک زنجیر

گذرتا ہے۔ شرکت کے ایک سرگرم بوڑھے ملازم او۔ آر۔ ڈرہم[1] نے دو نصف نصف ایکڑ کے قطعے صاف کیے۔ اور چند عمارتیں بنا دیں جن میں سے ایک پر سفیدی پھری ہوئی ہے۔ یہ مکان صرف ایک منزل کا ہے۔ اس کی دیواروں پر اندر کی طرف ایرانی قالین لٹکائے گئے ہیں۔ اور دروازوں اور کھڑکیوں پر بڑے عمدہ پردے لٹک رہے ہیں۔ ہر جگہ کتابوں کے انبار نظر آتے تھے۔ کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھیں تو بطخیں، چوزے اور ریلوے دکھائی دیتے ہیں۔ پاس ہی ایک پالتو بندر کھیلتا کودتا رہتا ہے۔ ڈرہم تمام مہمانوں کی تواضع خربوزوں سے کرتا جو اس نے اپنے باغ میں بو رکھے تھے۔ ساتھ ہی خوش طبعی سے شکایت کرتا ہے کہ شارع ذہبت[2] سے آنے والے مسافر بھی کس قدر تکلیف کا باعث ہیں۔ پھر یہ گفتگو شروع ہو جاتی ہے کہ بارش کی سخت ضرورت ہے۔ جدہ کا نقشہ بدل رہا ہے اور دیکھیے میرا باغ ہر سال قریباً بیس فٹ کی رفتار سے پھیل رہا ہے۔ ڈرہم عام طور پر کہتا ہے۔ اچھا کھانا کھا کر استراحت ضروری ہے۔ کھانا اچھا نہ ہو تو کام ٹھیک طریق پر نہیں ہو سکتا۔ آپ ٹھہر جائیں اور تھوڑی دیر سو لیں۔ ذرا ٹھنڈ ہو جائے گی۔ تو چلے جانا۔ لیکن مسافر کے لئے ایک سو تیس میل کی مسافت سخت پریشان کن ہوتی ہے۔ لہذا وہ خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ دولت سعودیہ میں گمنام بہا غریب کاشت کار ہے۔

مزید بیس میل کی مسافت طے کر چکنے کے بعد اصل سڑک کو چھوڑ کر ایک صحرائی راستے پر ہو لیتے ہیں۔ یہی ریاض (دارالحکومت دولت سعودیہ) کا راستہ ہے اور ریاض

---

[1] O. R. Durham.

[2] لفظی معنی سنہری کانوں کا راستہ۔ یہ اس راستے کا نام ہے جو کانوں کی طرف جاتا ہے۔

یہاں سے کوئی چار سو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ تھوڑی دور چل کر سیاہ پتھروں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک سنگین حوض اس وضع کا ہے جسے عرب "برکہ" کہتے ہیں۔ یہ ۸۱۰ء میں خلیفہ ہارون الرشید کی بیگم ملکہ زبیدہ نے عازمین حج کے لیے بنوایا تھا۔ حوض میں اتنی مٹی بھر گئی ہے کہ اوپر کی صرف دس فٹ جگہ خالی رہ گئی ہے۔ تاہم اس میں پانی بھرا رہتا ہے اور بدو وقتاً فوقتاً اپنے اونٹ لے کر یہاں آٹھہرتے ہیں۔ اور ببول کے درختوں کے نیچے مصلّے بچھا لیتے ہیں۔

برکہ سے آگے سڑک ریگستانی بنجر میں سے گزرتی ہے جس میں کہیں کہیں خاردار جھاڑیاں نظر آتی ہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے سینگوں والے غزال بڑی خوش اسلوبی سے کلانچیں بھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نیز بادامی اور زرد رنگ کے گرگٹ ملتے ہیں جن میں سے بعض تین تین فٹ لمبے ہوتے ہیں۔ یہ وہی جانور ہے جسے عرب ضب (سوسمار) کہتے ہیں۔ گرد و پیش کا علاقہ اتنا بنجر ہے کہ جہاں ببول کا کوئی درخت ہوا سے بطور نشان استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا ہی درخت کوئی تیس فٹ اونچا ہوگا جیسے ان سنگریزوں میں بھی نم آلود جگہ مل گئی۔ یہ مقام "الشجر" (درخت) کے نام سے مشہور ہو گیا اور پاس کی پہاڑی کو "جبل نشائیے" (چائے کی پہاڑی) کہنے لگے۔ اس لیے کہ شرکت کے ٹرکوں کے ڈرائیور عموماً اس سایہ دار جگہ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ یا ہارون الرشید کے زمانے میں جن لوگوں نے سونا نکالنے کا کام شروع کیا تھا، انھیں پانی کی کمی یقیناً محسوس ہوتی ہوگی۔ وہ یا تو ان کنوؤں سے کام لیتے تھے، جن میں پانی کی مقدار زیادہ نہ تھی یا اونٹوں پہ لاد کر پانی لاتے

تھے۔ غالباً وہ سال بھر میں تھوڑی سی مدت کے لیے کان کنی کرتے تھے، لیکن دولت سعودیہ کی شرکت معدنیات کے انجینئروں نے کوئی چونتیس میل کے فاصلے پر مغربی جانب کی ایک وادی میں ایک نل کنواں لگایا اور وہاں سے نلوں کے ذریعہ پانی "مہد ذہب" تک لے آئے۔ سڑک پر سے معدن کا پہلا نشان وہ پمپنگ سٹیشن ہیں جو پائپ لائن کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے ارد گرد سبز باغیچے ہیں۔ پھر "مہد ذہب" کی دو چوٹیاں نمودار ہوتی ہیں۔ ان سے آگے عرب کی بنجر سرزمین میں سونا نکالنے کی مشینیں اور متعلقہ عمارتیں ہیں، جو دور حاضر کے نمونے کی ہیں۔ وادی کے دوسری جانب کان کے اندر کام کرنے والے آدمیوں کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی کھانے کا ہال، تفریحی مرکز اور مہمان خانہ ہے۔

کان کا انتظامی عملہ تیس آدمیوں پر مشتمل ہے اور وہ زیادہ تر امریکی ہیں۔ دن بھر کام کرنے کے بعد وہ پیٹ بھر کر کھانے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور آپس میں یا نو واردوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ کھانا ختم ہو جائے تو سب تفریحی مرکز میں جمع ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ برج اور رینگ پونگ کھیلنا شروع کر دیتے ہیں باقی لوگ شام کی خنکی میں باہر بیٹھ کر فلمیں دیکھتے ہیں۔ عرب بھی جو وہاں کام پر لگے ہوتے ہیں۔ یا انجینیری کی تربیت حاصل کر رہے ہیں، تصویریں دیکھنے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ نوجوانوں کو زیادہ تر امریکی زندگی کے خاص مناظر سے دلچسپی ہے مثلاً ہوائی جہاز، موٹر کاریں، ٹینس، فلک بوس عمارتیں یا کھیتی باڑی کی مشینیں۔

"مہد ذہب" سمندر کی سطح سے سوا تین ہزار فٹ بلند ہے اور جدہ کی مرطوب ہوا کے مقابلے میں یہاں کی ہوا نسبتاً خشک اور خنک ہے۔ مزے کی نیند لے چکنے

کے بعد پھر پرامریکی ناشتہ کھا کر سیاح کان کے دورے کے لیئے تیار ہو جاتا ہے۔ ایسے
جو چیز پہلی نظر میں زیادہ حیران کرتی ہے۔ وہ ہنرمند عرب ملازموں کا عنفوانِ شباب
ہے۔ اگر کوئی مشین بگڑ جائے تو موقعہ . . . . ہی پر اس کی مرمت ہو جانی چاہیئے
ورنہ اسے کان سے ساحل پر پہنچا کر امریکہ بھیجنا پڑے گا۔ چند نگران کار اور کاریگر امریکیوں
کو چھوڑ کر باقی زیادہ تر کارکن عرب جوان ہیں جن کی عمریں بارہ اور اٹھارہ سال کے
درمیان ہوں گی۔ بعض نے کام ابھی شروع کیا ہے اور وہ سن رسیدہ عرب کارکنوں
یا امریکیوں کے پاس کھڑے ہو کر ہر کام سیکھتے رہتے ہیں۔ دوسرے عربوں نے
مشینوں کا پیچ بیچ کام خود سنبھال لیا ہے۔ یہ مشینیں ڈیزل سے چلتی ہیں۔ ہر
شفٹ (کام کی باری یا دور) کے ساتھ ایک امریکی ایجنٹ موقع پر موجود رہتا
ہے اور دولت سعودیہ کے تین کاریگر معاون کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ان کی
عمریں بیس اور تیس سال کے درمیان ہوں گی۔ چھ سال پیشتر ان لوگوں نے اونٹ
کی زین کے سوا دورِ جدید کی کوئی چیز نہ دیکھی تھی۔

کان کے اندر اترنے کے لیئے ایک پنجرے میں بیٹھنا پڑتا ہے جو تاریکی میں سے
گزرتا ہوا چھ سو فٹ نیچے چلا جاتا ہے۔ یہاں ہوا گرم اور مرطوب ملتی ہے۔ وہاں
سے سیاح ان سرنگوں میں نکل جاتا ہے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ جہاں
کاربائیڈ لیمپوں کے سوا روشنی کی کوئی صورت نہیں۔ ان سرنگوں میں نوجوان
عرب توڑی ہوئی چٹانوں کے ٹکڑے ایک ایک ٹن بوجھ اٹھانے والی دستی گاڑیوں
میں بھرتے نظر آتے ہیں۔ جب کان کنی کا آغاز ہوا تھا تو عرب مزدوروں کے
لیئے دن میں پانچ مرتبہ کام روکنا پڑتا تھا تاکہ وہ اوپر جا کر نماز ادا کر لیں۔ کان

کے اندر کعبہ کی سمت ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ اب ہر سرنگ میں کعبہ کی سمت کے نشان لگا دیئے گئے ہیں۔ اور کان کے اندر کام کرنے والے عرب سطح زمین سے ۳۰۰ —— ۶۰۰ فٹ کی گہرائی میں نماز ادا کر لیتے ہیں۔

ایک گھنٹہ تاریکی نیز سوراخ کرنے والی مشینوں کے شور میں گزار چکنے کے بعد سیاح پھر سطح پر آجاتا ہے۔ پاس ہی وہ مشین لگی ہوئی ہے، جو بڑے بڑے ڈھیلوں کو کوٹ کر چھوٹے چھوٹے سنگریزے بنا دیتی ہے۔ پھر اسے دوسری مشین میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں سنگریزوں میں پانی ملا کر انہیں خوب پیس دیا جاتا ہے۔ اور دھاتیں مٹی سے الگ کر لی جاتی ہیں۔ عام اندازہ یہ ہے کہ توڑے ہوئے ڈھیلوں سے پچیس فیصد سونا اور پچیس فی صد چاندی نکلتی ہے۔ باقی سب کچھ میل متصور ہوتا ہے۔ سونے اور چاندی کو فولادی پیپوں میں بھر کر "شارع ذہب" کے راستے جدہ بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں سے یہ چیزیں جہازیں سوار کر کے نیوجرسی (ریاستہائے متحدہ امریکہ) پہنچا دی جاتی ہیں۔ وہیں دھاتیں دوبارہ صاف ہوتی ہیں۔

دولت سعودیہ میں قدیم و جدید کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ اگر آپ کسی علاقے کے گورنر یا امیر سے ملنے کے لیئے جائیں تو وہاں بھی آپ کو یہ فرق بدیہی طور پر نظر آئے گا۔ وہاں سب سے پہلے آپ کو یمنی قہوہ پلایا جائے گا، جس میں الائچی ملی ہوتی ہے۔ عربی آداب کا تقاضا یہ ہے۔ کہ آپ نہ تو تین سے کم اور نہ تین سے زیادہ پیالیاں پئیں۔ تین سے کم پئیں گے تو سمجھا جائے گا کہ آپ کو قہوہ پسند نہیں آیا۔ زیادہ پئیں گے تو میزبان کو خیال ہو گا کہ آپ بہت بھوکے پیاسے ہیں اور کھانا بھی کھلانا چاہیئے تھا۔ قہوہ پلانے والا آدمی عموماً معزز

ہوتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں قہوے کا برنجی برتن ہوتا ہے جس سے انتہائی چابک دستی کے ساتھ قہوہ چینی کی بے دستہ چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں ڈالتا جاتا ہے۔ جب مہمان تین پیالیاں پی چکتا ہے تو پیالی ہلا دیتا ہے۔ سمجھ لیا جاتا ہے کہ مزید درکار نہیں۔ قہوے کا پہلا دور ہو چکتا ہے تو لذیذ ہندوستانی چائے شیشے کی چھوٹی چھوٹی فنجانوں میں پیش کی جاتی ہے۔ اور مہمان دو فنجان ضرور پیتا ہے۔

"مہد ذہب" کا امیر جس مکان میں رہتا ہے۔ وہاں سے شمالی جانب دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی وادی ملتی ہے۔ یہاں بڑی بڑی چٹانیں عمودی شکل میں کھڑی ہیں۔ ان پر تصویریں اور نقش کندہ کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گھاٹی میں ذرا اوپر کی طرف چلے جائیں تو ایک درجن کے قریب آدمیوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں، جنھوں نے تیر کمان پکڑ رکھے ہیں اور دو لمبے سینگوں والے ہرنوں اور دوسرے جانوروں کا شکار کھیلتے دکھائے گئے ہیں۔ چونکہ اسلام میں تصویر کشی منع تھی، اس لیے قیاس یہ ہے کہ یہ تصویریں اسلام سے پیشتر کے دور کی ہیں۔ عرب کے بہت سے سیاحوں نے جن میں چارلس ڈاؤٹی[1] اور لیڈی بلنٹ[2] بھی

(i) Charles Doughty (۱۸۴۳ء سے ۱۹۲۶ء) انگلستان کا مشہور سیاح جس نے ۱۸۷۶ء میں شمالی عرب کا سفر کیا اور اپنی مشہور کتاب "اریبیا ڈیزرٹا" (ریگستانی عرب) لکھی۔

(ii) Lady Blunt اس خاتون کا اصل نام این نوئل (Anne Noel) تھا۔ ۱۸۶۲ء میں اس کی شادی بلنٹ سے ہوئی، جو انگریزی زبان کا شاعر تھا اور سفارتی خدمات انجام دیتا رہا۔ بلنٹ نے اس کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شامل ہیں۔ شمالی و مغربی عرب کے دوسرے حصوں میں بھی اس قسم کی تصویروں کا ذکر سنایا جاتا ہے۔ مقامی پولیس کے افسر اعلیٰ نے بتایا کہ ماضی قریب تک وہ تمام جانور رجانز کے پہاڑوں میں پائے جاتے تھے، جن کی تصویریں چٹانوں پر بنی ہوئی ہیں، بلکہ ببر شیر بھی ملتے تھے۔

"مہد ذہب" کی سیاحت کے سلسلے میں پہاڑ کی شمالی جانب بھی دیکھ لینی چاہیئے کان کی موجودہ جگہ سے قدرے مغرب میں کچھ سوراخ اور سرنگیں نظر آئیں گی یہ ان لوگوں کی ہیں جنھوں نے پہلے پہل اس پہاڑ سے سونا نکالا تھا۔ بعض سرنگیں پہاڑ کے اندر ڈیڑھ ڈیڑھ سو فٹ تک چلی گئی ہیں۔ جو پتھر نکالے جاتے تھے انھیں آگ کے ذریعے سے خوب گرم کر لیا جاتا - پھر پانی اوپر ڈالتے ہی وہ تڑخ جاتے اس طرح بار بار کے عمل سے چھوٹے چھوٹے سنگریزے بنا کر انھیں بڑی بڑی چکیوں میں پیس لیا جاتا۔ بعض ایسے پتھر اب تک بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جدّہ پہنچ گئے۔ بلکہ مختلف لوگ انھیں امریکہ لے گئے اور ان سے اپنے باغوں کی سجاوٹ کا کام لیا۔ رات کے وقت یہاں بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ عرب آگ جلانے کے لیے اونٹ کی مینگنیاں استعمال کرتے ہیں۔ کھجور کھاتے ہیں اور اونٹ کا دودھ پیتے ہیں۔ دن میں جو کچھ پیش آتا ہے فی البدیہہ اس کے گیت بنا کر مزے سے گاتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵ اور عربی گھوڑوں کا ایک سٹڈ قائم کر لیا تھا۔ بیوی نے عرب کے متعدد سفر کیے جن کے حالات لیڈی بلنٹ نے مرتب کیے۔ دونوں کو مسلمانوں سے گہری ہمدردی تھی چنانچہ مصر اور سوڈان میں انھوں نے انگریزی پالیسی کی سخت مخالفت کی۔

تیسرا باب

خاندان سعود کا عروج

اگرچہ خاندان سعود نجد میں صدیوں سے مشہور چلا آتا تھا لیکن تاریخ عالم کے صفحات پر اس نے اٹھارھویں صدی کے وسط میں جگہ پائی[1]۔ اسی زمانے میں مسلم مصلح محمد ابن عبدالوہاب بغداد میں تعلیم پا کر اپنے وطن لوٹا۔ تاکہ ہم مذہبوں کو ان طور طریقوں سے باز رکھے۔ جو بت پرستوں کے سے تھے۔ اسلام سے جدا ہوئے تھے اور سب کو رسول اکرم صلعم کے ارشادات کا پابند بنا دے۔ شیخ موصوف کے نزدیک مسلمانوں پر جو مصیبتیں آئی تھیں وہ ان کی غلط روی ہی کا نتیجہ تھیں۔ سعودی خاندان مدت سے درعیہ میں حکمران تھا جو ریاض کے قریب واقع ہے۔ اس خاندان کا امیر محمد بن سعود شیخ کا ہم عقیدہ بن گیا اور دونوں نے

---

[1] مصنف خاندان سعود کے پس منظر کے متعلق کینتھ ولیم کی کتاب ابن سعود کا ممنون ہے۔

مل کر بدویوں اور حضریوں میں خالص اسلام کی اشاعت شروع کی جن کی مذہبی
روح بے معنی رسوم پرستی میں گم ہو چکی تھی۔

امیر محمد بن سعود کی وفات کے بعد ان کا بیٹا عبدالعزیز فرمانروا بنا اور
اس نے اپنا دائرۂ اقتدار دمشق تک بڑھا لیا۔ مبلغین کی ایک نئی جماعت
تیار ہو گئی، جو دینی معاملات میں دنیوی اور سطحی نقطۂ نگاہ کی مذمت کرتی تھی۔
یہی سطحی نقطۂ نگاہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ امیر عبدالعزیز کے
بعد امیر سعود مسند نشین ہوا۔ اس نے ۱۸۰۳ء میں مکہ معظمہ فتح کر لیا[1] اور
متعدد قبے توڑ ڈالے، جن کی پرستش کعبہ کی طرح ہو رہی تھی۔

قسطنطنیہ کے ترک فرمانروا وہابی اثر و اقتدار کے اس پھیلاؤ پر بہت خفا ہوئے۔
وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا روحانی پیشوا سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے حکمران مصر
کو اپنی امداد پر آمادہ کر لیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو فوج دے کر وہابیوں کی سرکوبی
کے لیے بھیج دیا۔ بیٹا فوج لے کر منزل بمنزل بڑھتا گیا۔ ۱۸۱۸ء میں اس نے
سعودیوں کے دارالحکومت درعیہ پر قبضہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا
دی۔ یوں سعودیوں کی قوت درہم برہم ہو گئی۔ انیسویں صدی کے بیشتر حصے

---

[1] پہلا حکمران جس نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی حمایت میں قدم اٹھایا محمد بن سعود تھا۔ عبدالعزیز
بن سعود کو ایک شخص نے غلط تعصب کی بنا پر مسجد میں شہید کر ڈالا تھا۔ نجدی اقتدار عبدالعزیز
کے بیٹے سعود کے عہد میں درجِ کمال پر پہنچا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ نجدیوں کے قبضے میں آ گئے
گویا نجد کے علاوہ حجاز اور شام بھی ان کی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ مزید پیش قدمی کی تیاریاں ہو رہی
تھیں کہ سعود کا انتقال ہو گیا۔ اس سعود کو تاریخ نجد میں سعود اول اور سعود کبیر بھی کہتے ہیں۔
مصنف نے یہاں حالات ایسے انداز میں لکھے ہیں، جن سے صحیح کیفیت (باقی اگلے صفحہ پر)

میں وسطی عرب کی عنان اقتدار رشیدی خاندان کے ہاتھ میں رہی جن کا دارالحکومت حائل تھا۔ محمد ابن رشید نے ترکوں کی سیادت قبول کر لی۔ وہ ۱۸۸۵ء میں ریاض پر قابض ہوا۔ سعودی خاندان کا امیر عبدالرحمٰن کویت میں جا بیٹھا، جو خلیج فارس کے شمالی و مغربی کنارے کی ایک ریاست ہے۔ وہاں اس نے حکمرانی کے تمام حقوق اپنے بڑے بیٹے عبدالعزیز کے حوالے کر دیے۔

عبدالعزیز نے عمر کے ابتدائی دس سال رشیدیوں کے سایہ اقتدار میں گزارے۔ مزید دس سال جلاوطنی کی حالت میں بسر کیے۔ یہ وقت زیادہ تر ربع الخالی کے شمالی گوشے میں بسنے والے بدوؤں کے درمیان پورا ہوا۔ اس نے قیادت

(حاشیہ صفحہ ۴۸) واضح نہیں ہوتی۔ سعود کبیر کے انتقال (۱۸۱۴ء) کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ بن سعود امیر بنا۔ اسی عہد میں خاندان کے اندر کشمکش کا آغاز ہوا۔ جو انجام کار وہابیوں کے اقتدار کی بربادی کا باعث بنا۔ عبداللہ بن سعود ہی کے عہد میں محمد علی پاشا خدیو مصر نے عثمانی سلطان کے فرمان کے ماتحت اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو عرب بھیج دیا۔ امیر عبداللہ بن سعود سے جنگی تدابیر میں غلطیاں ہوئیں۔ ابراہیم پاشا نے ان غلطیوں سے پورا فائدہ اٹھایا، یہاں تک کہ ۱۸۱۸ء میں درعیہ برباد ہو گیا، امیر عبداللہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ اسے گرفتار کر کے پہلے مصر پھر قسطنطنیہ بھیج دیا گیا، جہاں اسے موت کی سزا دے دی گئی۔

اس کے بعد آل سعود میں سے جو لوگ باقی تھے، انھوں نے اپنی اپنی حکومتوں کے لیے جد و جہد شروع کر دی۔ ان میں سے پہلا قابل ذکر شخص ترکی بن عبداللہ تھا۔ پھر فیصل بن ترکی کے لیے قوت از سر نو فراہم کی۔ اس کی وفات پر دوبارہ خوفناک خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اسی خانہ جنگی میں حائل کے رشیدی امیر زور پر آئے (باقی بر صفحہ ۵۰)

کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لی۔ وہ بڑا جواں مرد اور جسمانی اعتبار سے بہت قوی تھا۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔ کہ وطن کو رشید یوں کے قبضے سے نکالنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گا۔ جنوری ۱۹۰۲ء میں وہ تھوڑے سے آدمیوں کے ہمراہ کویت سے روانہ ہوا۔ کچھ مدت نئے رنگروٹ مہیا کرنے میں گزاری۔ پھر خفیہ خفیہ نخلستان ریاض کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں اپنے تیس ہمراہیوں کو ایک جگہ ٹھہرا دیا۔ اور تاکید کر دی کہ اگر کل صبح تک تمہارے پاس کوئی پیغام نہ پہنچے تو سمجھ لینا کہ ہم مارے گئے۔ اور تم تیزی سے واپس چلے جانا۔

یہ پیغام دے کر وہ آگے بڑھا۔ اپنے بھائی محمد کو بیس آدمیوں کے ہمراہ ریاض کے قریب کھجوروں کے ایک جھنڈ میں چھوڑا۔ شام ہو چکی تھی۔ صرف دس آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا۔ کھجور کا ایک تنا شہر کی فصیل کے ساتھ لگا کر وہ لوگ اوپر چڑھے تا اور اندر کی طرف اتر گئے۔ پھر مختلف چھتوں پر سے گزرتے ہوئے رشیدی گورنر کے مکان پر پہنچ گئے۔ اور اس میں جو لوگ موجود تھے انھیں یہ کہہ کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا کہ اگر ذرا بھی آواز نکالو گے۔ تو ایک ہی لمحے میں کام تمام کر دیا جائے گا۔ گورنر ہی کے گھر سے کھجوریں اور قہوے کر

(بقیہ صفحہ ۴۹) نجد پر قابض ہو گئے۔

درعیہ برباد ہو چکا تھا۔ ترکی بن عبداللہ نے ریاض کو دارالحکومت بنا لیا جو اب تک چلا آتا ہے۔ فیصل کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سب سے چھوٹا عبدالرحمن تھا جس نے نہایت نازک حالات میں ریاض کو چھوڑ کر کویت میں سکونت اختیار کر لی

(م۔ مہ حالات آگے چل کر بیان ہوں گے)

بھوک اور پیاس مٹائی اور باقی رات وہاں قرآن کی تلاوت میں گزار دی
پو پھٹتے ہی ریاض کے قلعے کا دروازہ کھلا۔ عبدالعزیز اور اس کے ساتھی ایسی
جگہ بیٹھے تھے جہاں سے دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ
گورنر کے گھوڑے قلعے سے باہر لائے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خود گورنر نکلا۔
اس کا طریقہ یہی تھا کہ رات قلعے میں گزارتا تھا۔ گورنر کے نکلتے ہی عبدالعزیز
اور اس کے ساتھی بجلی کی تیزی سے گورنر پر حملہ آور ہوئے۔ اُسے نیز اس
کے چند محافظوں کو آناً فاناً قتل کر ڈالا۔ محافظ فوج کے باقی لوگ قلعے
کے اندر کی طرف بھاگے تاکہ دروازہ بند کر لیں۔ ابن سعود کے رفیق خاص
عبداللہ بن جلوی نے دروازے پر پہنچ کر انھیں اتنی دیر ٹھہرائے رکھا کہ باقی ساتھی
اطمینان سے اندر داخل ہو گئے۔ تھوڑی دیر کشمکش جاری رہی۔ پھر قلعہ نشین
فوج نے ہتھیار ڈال دئیے۔ سترہ سال کے بعد دوبارہ خاندانِ سعود کا ایک شہزادہ
ریاض کا مالک و مختار بن گیا[1]۔ عبدالعزیز کی اس کامیابی نے ترکوں کو بھی قدم
اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۰۴ء کے موسم بہار میں آٹھ ترکی بیش ابن رشید

[1] یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مصنف نے حالات ٹھیک بیان نہیں کئے۔ عبدالعزیز شہر کے اندر پہنچتے ہی ایک ایسے شخص کے گھر چلا گیا جس کے تمام افراد اس سے بخوبی واقف تھے۔ ان سے گورنر کے متعلق حالات معلوم کر کے مکانوں کی چھتوں سے گزرتا ہوا گورنر کے مکان تک پہنچا۔ تھا۔ جہاں نوکروں چاکروں کے علاوہ صرف دو عورتیں موجود تھیں۔ ایک گورنر کی بیوی دوسری اس کی بہن۔ عبدالعزیز نے دونوں عورتوں کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ دونوں نجومی تھیں اور عبدالعزیز کو خوب پہچانتی تھیں۔ ممکن ہے اس وجہ سے بھی انھوں نے چپ ہی رہنا

(باقی اگلے صفحہ پہ ملاحظہ فرمائیں)

اور اس کی قبائلی فوج کے ساتھ شمالی و مشرقی عرب کے ریگستان میں پہنچے - ابن سعود پیچھے ہٹ گیا ۔ تین مہینے تک دونوں لشکر آمنے سامنے پڑے رہے اور کوئی لڑائی نہ ہوئی پھر ابن رشید کے قبائلی لشکری واپس چلے گئے تاکہ اپنے ریوڑوں کو موسم خزاں کی چراگاہوں میں پہنچا دیں - ترکوں کو بھی لوٹنا پڑا - سعودی رسالے نے ان کے لیے ہراس کا خاصا سامان پیدا کیے رکھا - خود عبدالعزیز نے ایک مرتبہ ترکی فوج کے قلب پر حملہ کیا - یہ بڑا خطرناک کام تھا ۔ لیکن جوانمردی کے اس کارنامے نے جنگ کا پانسا پلٹ دیا - ترکی جیش توپیں، سامان اور سونا چھوڑ کر بھاگ گئے - پھر ابن رشید نے انتقال کیا اور نوجوان عبدالعزیز وسطی عرب کا مالک و مختار بن گیا -

اب اس نے جنگ سے اپنی توجہ عارضی طور پر ہٹالی اور داخلی اصلاحات میں لگ گیا - پہلے اخوان کی تحریک منظم کی - جہاں جہاں کوئی نخلستان یا پانی کا چشمہ تھا - عبدالعزیز نے وہاں نئے گاؤں کی بنیاد رکھ دی یا پہلی آبادی میں توسیع کرکے اسے زرعی مرکز بنا دیا - ہر مرکز پر ایک وہابی مبلغ مقرر کردیا

(بقیہ صہ ۵۱) مناسب سمجھا ہو - واقعہ کیا اس پر مورخوں کی نظر نہیں گئی کہ نجد کا فرمانروا خاندان اگرچہ مدت ہوئی جلا وطن ہو چکا تھا لیکن خود اہل نجد اسے بھولے نہیں تھے اور اس کی خاطر ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ تھے - عبدالعزیز بن سعود کو اس حقیقت کا پورا علم ہوگا - اس لیے وہ بہت تھوڑے ہمراہیوں کے ساتھ بے باکانہ ریاض پہنچ گیا - بایں ہمہ یہ کارنامہ اتنا عظیم القدر اور باعث فخر و احترام تھا کہ تاریخ میں اس کی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں -

جو اپنے چند معاونوں کی مدد سے اس مرکز کو ایک فوجی چھاؤنی کی حیثیت میں چلاتا تھا ۔ ہر ایک مرکز آبادی کے لیے اشیاء خوردنی پیدا کرنے کا ذمہ دار تھا ۔ اس کے تمام باشندے ٹھیٹھ اسلامی عقائد و اعمال کے پابند تھے ۔ وہ اخوان یعنی بھائیوں کے لقب سے معروف تھے ۔ ایک سو سے زیادہ ایسی نو آبادیاں قائم ہوگئیں اور بڑے اعلیٰ پیمانے پر ان کا سلسلہ جاری رہا ۔ اس طرح عبدالعزیز کو وفادار اور جاں نثار معاون مل گئے ۔ جو ایک لحاظ سے ترکی سلطانوں کے نیچری[1] جیسے تھے ۔ اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قبائلی چھاپے ایک دم ختم ہوگئے ، جو صدیوں سے وسطی عرب کی قبائلی زندگی کا خاصہ چلے آرہے تھے ۔

"اخوان کی تنظیم سے عبدالعزیز کی حیثیت مستحکم ہوگئی تو اس نے ۱۹۱۳ء میں صوبہ "الحسا" پر قبضہ کر لیا ، جو خلیج فارس کے ساحل پر عرب کا انتہائی مشرقی صوبہ ہے ۔ چنانچہ وہ جبل طویق کے پاس کے ایک فوجی مرکز سے اٹھ کر ہفوف کے نخلستان میں پہنچا اور پانچ روز کی مسافت ڈیڑھ دن میں طے کر لی ۔ کھجور کے تنے فصیل کے ساتھ لگا کر فوج اندر داخل ہوگئی ۔ ترک افسر اور ان کے اہل و عیال قصبے کی مسجد جامع میں منتقل ہو گئے ۔ انجام کار ترکوں نے حوالگی قبول کر لی اور ایک گولی چلائے بغیر ہفوف سے نکل گئے ۔ اس طرح عبدالعزیز کی حکومت کا دائرہ خلیج فارس تک پہنچ گیا ۔ اگر ترکوں کو یہ احساس ہوتا کہ الحسا

---

[1] نیچری یا نیی چری (نئی فوج) ترکوں کی ایک نہایت زبردست اور بے پناہ فوج تھی ، جس کے حملے صدیوں تک بے پناہ رہے ۔ وہ لوگ بڑے جواں مرد جانباز تھے ، لیکن انجام کار ان کا نظام بھی بگڑ گیا ۔ سلطان محمود مصلح نے اس فوج کو تباہ کیا ۔

ہم تین کے لیے ہی ذخیرے ہیں۔ جتنے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہیں، تو اس صوبے کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ جد وجہد کرتے۔

سعودیوں کی حدیں خلیج فارس تک پہنچ جانے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ جانے پر برطانیہ نے عبدالعزیز سے تعلقات پیدا کر لیے۔ اور اسے اپنے ساتھ ملا لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ سر پرسی کاکس[1] نے کپتان شیکسپیئر[2] کو ریاض بھیج دیا۔ رشیدیوں اور سعودیوں کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ جرب کے مقام پر دونوں میں لڑائی ہوئی۔ شیکسپیئر بھی اس لڑائی میں موجود تھا۔ اتفاقیہ ایک گولی اس کے آ لگی۔ رشیدیوں نے خنجر مار کر اسے ختم کر دیا۔ شیکسپیئر کی موت سے برطانیہ کے تعلق کی اصل کڑی ٹوٹ گئی اور جزیرۃ العرب میں اتحادیوں کی جنگی مساعی کا کام قاہرہ کے عرب بیورو کی تحویل میں چلا گیا۔ بیورو نے عبدالعزیز کے سب سے بڑے حریف شریف حسین کو ترکوں کے خلاف تحریک کا قائد بنا لیا۔ امیر فیصل بن شریف حسین اور لارنس حجاز ریلوے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے ان کی سرگرمیوں سے انگریزی خواں عوام بخوبی آگاہ ہیں۔ عبدالعزیز دوران جنگ میں نسبتاً چپ چاپ بیٹھا رہا۔

یہ امر تعجب انگیز نہ ہونا چاہیے۔ کہ پہلی جنگ عظیم کے آخری دور میں عبدالعزیز ابن سعود اور حسین شاہ حجاز کے درمیان کشمکش بہت بڑھ گئی۔ حسین بڑا حریص

---

[1] (i) Percey Cox یہ شخص خلیج فارس میں برطانوی سیاست کا سب سے زیادہ ماہر سمجھا جاتا تھا اور برطانیہ نے عراق میں اتاری تھی، اس میں سب سے بڑا پولیٹیکل افسر وہی تھا۔

[2] Shakespeare

اور ضدی آدمی تھا ۔ ستمبر ۱۹۱۵ء میں اس نے اپنے بیٹے امیر عبداللہ کی سرکردگی
میں ایک مہم اس غرض سے بھیجی کہ نخلستان خرمہ وہابیوں سے چھین لے ۔ اس مہم
میں پانچ ہزار آدمی شریک تھے ۔ ابن سعود کے مجاہدوں نے ان پر شب خون مارا اور
پانچ ہزار میں سے صرف ایک سو زندہ بچ کر نکل سکے ۔ بچ نکلنے والوں میں سے
ایک امیر عبداللہ بھی تھا ۔ جو بعد ازاں اردن کا بادشاہ بن گیا ۔ یہ خبر سنتے ہی
جدہ میں سراسیمگی پھیل گئی ۔ ہر شخص کو اندیشہ پیدا ہو گیا کہ وہابیوں کی پیشقدمی
سے پہلے ہی گھر بار چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ چلا جائے ۔ لیکن ابن سعود نے بحیرۂ
قلزم کی طرف پیش قدمی مناسب نہ سمجھا ۔ اس کے مجاہدوں نے مغربی سرحد پر امن
کا سلسلہ مستحکم کر دیا تھا ۔ اور قاہرہ کا عرب بیورو بھی اپنی تجاویز کے سلسلے
میں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر سکتا تھا ۔ اسی موقع پر ابن سعود نے اپنے
دوسرے بیٹے امیر فیصل کو لندن بھیجا ۔ فیصل اس وقت صرف چودہ سال کا تھا
لیکن کویت کے نئے برطانوی نمائندے سینٹ جان فلبی نے بطور مشیر ایسے
انتظامات کر دیئے کہ فیصل بڑا اچھا اثر پیدا کر کے لوٹا ۔

حسین کھلم کھلا حملے میں ناکام رہا ۔ تو اس نے عسیر کے لیڈروں کو ابن
سعود کے خلاف برانگیختہ کرنے کی ٹھان لی ۔ یہ حجاز کے جنوب میں ایک علاقہ
تھا جسے عام طور پر آزاد سمجھا جاتا تھا ۔ لیکن یہ کسی نہ کسی شکل میں یمن اور
حجاز کے علاوہ ترکوں کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرتا رہتا تھا ۔ ابن سعود نے پانچ

ہزار کا ایک لشکر تیار کیا جو امیر فیصل کی سرکردگی میں ریاض سے چلا اور سات سو میل کا فاصلہ طے کر کے عسیر کے دارالحکومت ابہا میں پہنچ گیا۔ یوں عسیر مسخر ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں رشیدیوں کا زبردست لیڈر مارا گیا اور اس کا بھتیجا عبداللہ بن متعب جانشین ہوا۔ وہ بڑا ہی کاہل اور کمزور امیر تھا۔ مناسب موقع دیکھ کر ابن سعود نے رشیدی دارالحکومت حائل پر حملہ کر دیا۔ عبداللہ ابن متعب اور بہت سے دوسرے رشیدی امراء کو اپنے ساتھ ریاض لے آیا، جہاں عبداللہ نے بڑے آرام و اطمینان سے زندگی گزاری۔ ۱۹۴۷ء میں اس نے انتقال کیا۔ اس طرح رشیدی بھی ختم ہو گئے۔ اہل حائل کے ساتھ حسن و سلوک نے ابن سعود کی دو بڑی خصوصیتیں بہت نمایاں کر دیں۔ اول یہ کہ وہ زبردست قوت و طاقت کا مالک ہے، دوسرے بڑا ہی رحمدل ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حائل میں نہ صرف لوٹ مار سے باز رکھا، بلکہ اپنی فوج کے لیے جو چاول لایا تھا وہ سب وہاں کے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیے۔ حائل کے تمام اکابر سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کے لیے سزائے موت کا وقت آ گیا ہے، لیکن ابن سعود نے سب کو ایک جگہ جمع کیا اور تحریری تحفظ ایک ایک کے حوالے کر دیا۔ اس طرح آل رشید اور قصبہ حائل کے باشندوں کے علاوہ شمر کے نصف قبیلے نے ابن سعود سے وابستگی پیدا کر لی۔ باقی نصف لوگ عراق چلے گئے۔

مارچ ۱۹۲۴ء میں شریف حسین والی حجاز سے مہلک غلطی سرزد ہوئی یعنی اس نے خلیفۂ اسلام ہونے کا اعلان کر دیا۔ ابن سعود نے اس اعلان کا مضحکہ اڑایا۔ اور اپنے ہاں کے جنگی لیڈروں اور عالموں کا ایک بہت بڑا اجتماع

ریاض میں منعقد کیا۔ اس کا سن رسیدہ والد امیر عبدالرحمٰن اس اجتماع کا صدر تھا۔ اس اجتماع میں اخوان نے بڑی زبردست تقریریں کیں اور کہا کہ ہم حج کے لیے مکہ معظمہ جانا چاہتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے حسین کی خلافت قبول کر لی۔ ابن سعود نے ان حالات میں حج سے انھیں روک دیا۔ اور کہا کہ جاؤ پہلے حجاز کو سچے دین اسلام کے لیے فتح کرو۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ نہ ہونا چاہیے لیکن ہاشمیوں کو نکال دینا چاہیے۔ نیز مقامات مقدسہ کو ہر اس رسم سے پاک کر دینا چاہیے جو خالص دین اسلام کے خلاف[1] ہو۔ خرما اور تربہ کے نخلستانوں

---

[1] یہ حالات خدا جانے مصنف نے کہاں سے لیے۔ صحیح واقعات یہ ہیں کہ اہل نجد پر وقت سے حج کے دروازے بند تھے بخصوصاً شریف حسین انھیں کسی بھی حالت میں حجاز آنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اخوان نے اپنے فرمانروا سے مطالبہ کیا تھا۔ کہ ہم اس پابندی کو مصالحت سے دور نہ کر سکے۔ تو قوت سے کام لے کر دور کریں گے۔ اسی اثنا میں شریفی فوجوں نے دوبارہ خرما اور تربہ کے نخلستانوں پر حملہ کر دیا۔ اس جگہ خالد بن لوئی سالار لشکر تھا۔ اس نے حملہ آوروں کو شکست دے کر تعاقب کیا اور طائف پہنچ گیا۔ ابن سعود کو اس وقت کشمکش شروع ہو جانے کی بھی اطلاع نہ تھی۔ طائف پر قبضے کے بعد اطلاع ملی، پھر معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ بھی خالی ہو چکا ہے، لہٰذا خالد مکہ معظمہ پہنچ گیا۔ خالد قبیلہ قریش میں سے تھا اور شریف حسین کے اقربا میں شمار ہوتا تھا۔ وہ شریف سے ناراض ہو کر ابن سعود سے جا ملا تھا۔ میں نے اسے ۱۹۳۶ء میں دیکھا تھا۔ بالکل بعد میں اخوانوں کی سی زندگی اختیار کر لی تھی یعنی بہت سادگی سے رہتا تھا۔

سے وہابی شتر سوار اگست ۱۹۲۴ء میں نکلے۔ اور طائف کا رخ کر لیا، جو پہاڑیوں کے اندر ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پہ واقع ہے۔ شاہ حسین بھاگ کر مکہ چلا گیا، اور اسے اپنے بیٹے علی کے حق میں دست برداری پر مجبور کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ہاشمی فوجیں مکہ معظمہ سے نکل گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے وہابی فوجیں داخل ہو گئیں۔ لوٹ مار کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ وہابی مجاہدین ابن سعود کی سرکردگی میں احرام باندھے ہوئے مکہ معظمہ آئے۔ انھوں نے بہت سے قبے اور مقبرے توڑ دیے جو وہاں جا بجا تعمیر کر لیے گئے تھے[1]۔

کچھ مدت بعد انگریز شریف حسین کو قبرص لے گئے۔ جہاں انھوں نے باطمینان زندگی کے باقی دن گزارے۔ ۱۹۳۱ء میں وفات پائی۔ ابن سعود ۲۵ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو جدہ میں داخل ہوا۔ اور تمام سفارت خانوں کو مطلع کر دیا کہ میں امن وانصاف لے کر آیا ہوں۔ ہاشمی اور رشیدی مسخر ہو گئے۔ اور عرب میں ایک ایسی سلطنت معرض وجود میں آ گئی جس کی حدیں خلیج فارس سے بحر قلزم تک پھیلی ہوئی تھیں۔ حجاز کے مذہبی اور سیاسی لیڈر مکہ معظمہ میں جمع ہوے

---

[1] یہ صحیح نہیں کہ ابن سعود مکہ مکرمہ میں داخل ہونے والی فوج کے ساتھ تھا۔ یہ فوج خالد ہی کی سرکردگی میں مکہ پہنچی تھی اور اس کے تمام افراد نے سچے مسلمانوں کی طرح عمرہ کے احرام باندھ کر سرزمین حرم میں قدم رکھا تھا۔ ابن سعود خاصی مدت بعد مکہ معظمہ پہنچا تھا، جب نجدی فوجیں آگے بڑھ کر جدہ میں ہاشمیوں کا محاصرہ کر چکی تھیں۔

اور فیصلہ کیا کہ سلطان نجد قرآن اور سنت کے مطابق حکومت کرے۔ ہم اسے شاہ حجاز تسلیم کرتے ہیں۔ ۸۔ جنوری ۱۹۲۶ء کو مسجد الحرام میں ایک سادہ سی تقریب قرار پائی اور اہل مکہ نے اپنے نئے بادشاہ کی بیعت کر لی۔ اپریل ۱۹۲۶ء میں شاہ ابن سعود نے مکہ معظمہ میں موتمر اسلامی کے لیئے دعوت دی ستر سے زیادہ علمائے کرام اس موتمر میں شریک ہوئے اور یہ اطلاع لے کر لوٹے کہ عرب میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا ہے۔ آئندہ سال قریباً اڑھائی لاکھ مسلمانوں نے فریضۂ حج ادا کیا۔ شاہ ابن سعود نے کچھ دیر پہلے یہ عزم کیا تھا کہ میں مکہ معظمہ کو غیر اسلامی رسوم سے پاک کر دوں گا۔ اور عازمین حج کے لیے راستوں کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنا دوں گا۔ یہ عزم بڑی حد تک پورا ہو گیا۔

اب برطانیہ نیز یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔ اس نے اپنے بیٹے امیر فیصل کو برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کے دورے پر بھیجا۔ اس سلسلے میں امیر موصوف نے شاہ جارج پنجم، ملکہ ہالینڈ اور صدر جمہوریہ فرانس سے بھی ملاقاتیں کیں۔

امیر فیصل کی واپسی سے تھوڑی دیر بعد انگریزوں اور وہابیوں کے درمیان ایک نئے معاہدے کے لیئے گفت و شنید ہوئی۔ یہ ابتدا میں ناکام رہی تو شاہ ابن سعود گفتگو کو ختم کر کے ریاض واپس چلا گیا۔ وہاں علماء اور قبائلی سرداروں نے اسے شاہ نجد منتخب کر لیا۔ انگریزوں کے ساتھ دوبارہ گفت و شنید جاری ہوئی اور مئی ۱۹۲۷ء میں بمقام جدہ معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے کی رو سے انگریزوں نے شاہ ابن سعود

کی تمام فتوحات کو تسلیم کر لیا۔ جو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوئی تھیں اور اسے ہر لحاظ سے آزاد و خود مختار مان لیا۔

۱۹۲۷ء کے موسم گرما میں اخوان غیظ و غضب میں آ گئے اس لیئے کہ عراق پر چھاپے مارنے سے روک دینے کو اپنے اوپر نا واجب پابندی سمجھتے تھے۔ اور انھوں نے چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ اس نازک صورت حال کو ختم کرنے کے لیے شاہ ابن سعود نے حجاز میں قبائلی نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں سب لوگ آئے لیکن وہ اخوان لیڈر نہ آئے جو سرکشی اختیار کر چکے تھے۔ اس طرح ابن سعود کو خود اپنی پیدا کی ہوئی جنگی مشینری سے لڑائی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ابن سعود نے کانفرنس میں بڑی خوش اسلوبی سے تمام معاملات طے کرائے۔ شرکائے کانفرنس سے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ لوگ مہربانی فرما کر غور کر لیں کہ آیا میں آپ پر حکمرانی کے لائق بھی ہوں کہ نہیں۔ اس کے جواب میں شرکاء نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ ہم آپ کے سوا کسی کو بادشاہ ماننے کے لیئے تیار نہیں۔

ابن سعود کے خلاف ایک الزام یہ بھی تھا کہ اس نے جگہ جگہ لاسلکی مرکز قائم کر لیے ہیں اور ان کے ذریعے سے خبریں آتی جاتی ہیں۔ اور اس طریقے کی تصدیق کے لیے رسول اللہ صلعم کی سنت میں کوئی چیز نہیں ملتی بادشاہ نے خود کھڑے ہو کر اس الزام کا جواب دیا۔ اُس نے کہا کہ قرآن یا حدیث میں ایک حرف بھی لاسلکی یا ریڈیو کے خلاف موجود نہیں۔ اور آخر میں ریڈیو پہ قرآن کا ایک رکوع حاضرین کو سنوایا۔ ساتھ ہی کہا کہ جس چیز

کے ذریعے سے اللہ تعالٰے کا کلام پاک نشر ہوتا ہے، کیا اس میں کوئی برائی ہو سکتی ہے؟ علما نے بادشاہ کے اس فعل کی بھی تصدیق کر دی۔ آگے چل کر موٹروں، بجلی کی روشنی، ڈیزل پمپوں، ریلوں اور ہوائی جہازوں کے لیے تصدیق حاصل کرنے کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔

پھر بادشاہ نے امن کی پالیسی کانفرنس کے روبرو پیش کی۔ اخوان کے سوا سب نے اسے قبول کر لیا۔ اخوان سے تصفیے کی کئی کوششیں کی گئیں، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب سلطنت کے اتحاد کو قائم رکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ قوت سے کام لیا جاتا۔ ابن سعود نے ملک کے اندر کا پورا پٹرول جمع کر لیا۔ اور موٹروں، جیپوں وغیرہ کا ایک بہت بڑا قافلہ لے کر سلطنت کے مشرقی حصّے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنی نوعیّت کی یہ پہلی مہم تھی۔ اخوان پہلے کویت اور عراق کی طرف پسپا ہوئے۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۲۹ء کو انھوں نے دوبارہ حملہ کیا۔ ایک زبردست جنگ کے بعد بادشاہ کامیاب ہوا۔ جو باغی عراق اور کویت بھاگ گئے تھے۔ انھیں گفت و شنید کے بعد سلامتی کے عہد کے ساتھ واپس لے لیا گیا۔ اس طرح شاہ ابن سعود نے اپنی سلطنت کے سب سے بڑے خطرے پر قابو پا لیا۔

مغربی طاقتیں۔ اخوان کی بغاوت کا بڑے غور سے مطالعہ کرتی رہیں اور ابن سعود کی کامیابی کے اعتراف میں انھوں نے تامل نہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں فرانس نے اپنے قونصل خانے کو سفارت خانے کی شکل دے دی۔ فروری ۱۹۳۰ء میں برطانیہ نے سر اینڈریو ریان[1] کو اپنا پہلا وزیر مختار بنایا

---

[1] SIR ANDREW RAYON

اسلامی طاقتیں اپنے سفارت خانے مکہ معظمہ میں قائم کرنا چاہتی تھیں، لیکن ابن سعود نے کہا کہ غیر مسلم نمائندے مکہ نہیں جا سکتے، لہٰذا جدہ ہی کو طبعی سفارتی مرکز رکھنا چاہیئے۔ ۱۹۳۲ء میں سلطنت کا نام سلطنت نجد و حجاز کے کے بجائے دولت سعودیہ عربیہ قرار پایا۔ مئی ۱۹۳۳ء میں اس نے اعلان کر دیا کہ میرا بیٹا امیر سعود ولی عہد ہے۔ ساتھ ہی اسے نجد کا نائب السلطنت بنا دیا۔

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت سعودیہ کے غیر معمولی نظام کو سمجھ لینا نسبتاً سہل ہو جائے گا۔ اسلامی قانون کی بنیاد شریعت ہے جو قرآن حکیم سے تمام احکام لیتی ہے۔ علماء کی ایک جماعت جو مکہ اور ریاض میں رہتی ہے، شرعی احکام کی تعبیر و تفصیل قرآن مجید اور رسول اللہ صلعم کے ارشادات کی روشنی میں پیش کرتی ہے۔ مصر و شام نیز دوسرے بہت سے اسلامی ملکوں میں شریعت کے بعض احکام نافذ نہیں، لیکن دولت سعودیہ میں شریعت ہی پر عمل ہوتا ہے۔

شاہ ابن سعود نے حجاز کو فتح کیا تھا تو اسے احساس ہو گیا تھا کہ جو پرانا نظام وسطی عرب کے قبائل کو متحد رکھنے کے لیے زمانہ قدیم میں مرتب ہوا تھا، وہ اس خطے میں حکمرانی کے لیے ناکافی ہے جس میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ واقع ہیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۶ء میں اس نے ایک نیا دستور مرتب کر لیا تھا۔ اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں، لیکن دولت سعودیہ میں ابھی تک یہی دستور نافذ ہے۔ کئی مرتبہ نئے دستور کا معاملہ سامنے آیا

لیکن اس وجہ سے اسے ملتوی کرنا پڑا کہ آبادی کے مختلف حصوں کے رسوم و عوائد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ووٹ کا حق کسی کو حاصل نہیں تمام افسر بادشاہ اور اس کے وزیروں کے حکم سے مقرر ہوتے ہیں۔ بعض افسر مختلف آبادیوں کے اکابر مقرر کرتے ہیں۔ سلطنت کے لیئے تمام قواعد و ضوابط ریاض کی مرکزی حکومت کی جانب سے نافذ کیئے جاتے ہیں۔ یہ حکومت ایک قانون ساز مجلس کی مدد سے سب کام کرتی ہے۔ قانون ساز مجلس ابتدائی دور کے برطانوی دارالامرا سے ایک حد تک ملتی جلتی ہے۔ قبائلی اور مذہبی لیڈر اس کے رکن ہوتے ہیں۔ سرکاری مالیات، معاشی نشوو ارتقا، مراعات، قوانین، ضوابط، معاملات حج اور سول سروس اسی مجلس کے دائرہ اختیار میں ہیں۔

۱۹۵۳ء تک دولت سعودیہ میں مغربی ممالک جیسی مجلس وزراء کوئی نہ تھی۔ پھر ولی عہد کے لیئے ایک کابینہ تجویز ہوئی جس میں صدر کے علاوہ وزیر خارجہ، وزیر مال اور مجلس قانون ساز کا صدر بھی شریک ہونے تھے۔ اس کے دو حصے تھے، ایک دیوان یعنی نائب السلطنت اور اس کا عملہ، دوسرا صدارتی مجلس۔ وزارت خارجہ، وزارت داخلہ، وزارت مالیات، فوجی معاملات قانون ساز مجلس، عدالتیں اور مختلف صوبوں کی امارتیں سب صدر کے ماتحت رکھی گئی تھیں۔

۱۹۲۵ء میں تمام غیر ملکی معاملات کا انتظام بادشاہ خود کرتا تھا۔ پھر ایک محکمہ نظامت امور خارجہ کے نام سے قائم ہوا جسے آیندہ سال وزارت

کا درجہ دے دیا گیا اور امیر فیصل کو وزیر خارجہ بنا یا گیا ۔ اگرچہ تمام اہم معاملات بادشاہ سے استصواب کیے بغیر انجام نہ پاتے تھے ۔

تمام مالی معاملات کا انتظام ۱۹۲۸ء سے ۱۹۵۳ء تک شیخ عبداللہ سلیمان وزیر مالیات کے ہاتھ میں رہا اور شیخ موصوف دولت سعودیہ کے نہایت زبردست افراد میں محسوب ہونے لگا ۔ اس لیے کہ ہر وزارت مالی معاملات کے لیے وزیر مالیات ہی کی محتاج تھی ۔ شیخ عبداللہ کے لیے مختلف مشکلات پیش آتی رہیں جن میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، اول یہ کہ اسے ملک کے بعض بہت بڑے تاجروں کے ساتھ گہرا تعلق تھا جو انتہائی تیزی سے دولت کے انبار جمع کر رہے تھے ، دوسری مصیبت یہ تھی کہ جس ملک کا مالیہ انیس کروڑ ڈالر سے بھی اوپر تھا اس کا انتظام قدیم وضع کے ایک مالی ڈھانچے کی بنا پر کرنا بہت مشکل تھا ۔ با ایں ہمہ شیخ عبداللہ بڑی محنت سے کام کرتا رہا ۔ وہ کئی مرتبہ امریکہ گیا ۔ لمبے لمبے سفر کیے ، بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں لیکن اس کا کام شاہ ابن سعود کی وفات سے بہت پہلے اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ اس کے بس کا نہ رہا تھا ۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں ترقیاتی منصوبوں کی وزارت قائم ہوئی ۔ ان منصوبوں کے لیے ایک ڈائرکٹر جنرل (ناظم عمومی) مقرر ہوا ۔ اس کے مختلف شعبے تھے ، مثلاً پٹرول اور معدنیات کا شعبہ ، غیر ملکی کمپنیوں کا شعبہ ، قانونی معاملات کا شعبہ ، بری ، بحری اور فضائی مواصلات کا شعبہ ۔ یہ وزارت سرمایے کے لیے وزارت مالیات کی دست نگر تھی ۔

۱۹۴۴ء تک وزیر مالیات دفاعی ایجنسی کا سربراہ تھا اور براہ راست بادشاہ کی نگرانی میں یہ کام انجام دے رہا تھا۔ اسی سال موسم خزاں میں ایک فرمان کے ذریعے سے ایک نئی وزارت قائم کی گئی جس کا نام وزارت دفاع تھا اور فوجی معاملات کی نظارت عمومی بھی اسی کے حوالے ہوئی۔ امیر منصور کو یہ وزارت سونپی گئی اور ۱۹۵۱ء میں اپنی وفات تک امیر موصوف اس عہدے پر قائم رہا۔ اس وزارت کی اہمیت بہت بڑھ گئی اس لئے کہ دولت سعودیہ تلوار اور اونٹ کے دور حرب و ضرب سے نکل کر نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا ایک شعبہ پرواز کے لئے وقف تھا۔ اس شعبے میں دولت سعودیہ کے جنگی ہوائی جہازوں کا انتظام، نیز ان تجارتی ہوائی جہازوں کا انتظام ہوتا تھا، جو حکومت کی ملکیت میں تھے۔ پائلٹوں کی تعلیم و تربیت کے لیئے طائف میں ایک درسگاہ قائم کر دی گئی تھی۔ اس درسگاہ کا انتظام برطانیہ کے ایک فضائی مشن کے حوالے تھا۔ ہوائی اڈوں میں کام کرنے والے لوگوں کی تعلیم و تربیت ظہران میں ہوتی تھی اور یہ انتظام امریکہ کی ہوائی فوج نے سنبھال رکھا تھا۔

دولت سعودیہ کے نظام حکومت کے تعلق میں یہ بنیادی حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ تجدد کے باوجود اہم فیصلے اب بھی بادشاہ ہی کرتا ہے۔ یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیئے کہ دولت سعودیہ شاہ عبدالعزیز بن سعود کی تخلیق تھی۔ وہی حقیقتاً دولت سعودیہ تھا اور دولت سعودیہ محض اس کا ایک سایہ تھی۔ عبدالعزیز ابن سعود سے ملتے ہی فوراً احساس پیدا ہو جاتا تھا کہ ایک

ایسے شخص سے ملاقات ہو رہی ہے۔ جس میں خدا نے طبعی لیڈر کے تمام جوہر جمع کر دیے تھے۔ اس میں معاملہ فہمی کے ساتھ اخلاص اور مستحکم عزم کے ساتھ سادگی اور بے تکلفی جمع تھی۔ اس لئے ملکی اور بیرونی معاملات کے متعلق جو معلومات جمع کر رکھی تھیں وہ باہر سے آنے والے ہر شخص کو متاثر کرتی تھیں۔ جو لوگ ریاض پہنچتے تھے، وہ مختلف دائروں کے ماہر ہوتے تھے۔ مثلاً کسی کو مالیات میں درجہ تخصص حاصل ہوتا، کسی کو حفظان صحت میں اور کوئی شخص حمل و نقل کے معاملات میں حد درجہ ماہر ہوتا۔ عبدالعزیز ان سب سے ایسے انداز میں گفتگو کرتا جس سے ظاہر ہوتا کہ اسے ہر چیز کا حیرت انگیز حد تک صحیح اندازہ ہے۔ معاملات کے متعلق اس کا علم، دولت سعودیہ کے حدود سے باہر دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے پاس چار مترجم متواتر غیر ملکی زبانوں کی نشریات سنتے اور ہر وقت دنیا کی خبریں عربی میں ترجمہ کر کے سناتے۔ دوسری جنگ عظیم میں بعض اوقات حد درجہ نازک دور پیش آتے رہے۔ اس زمانے میں۔ نصف گھنٹے کے بعد خبریں اس کے پاس پہنچائی جاتی تھیں، اگرچہ وہ ریاض سے باہر بھی ہوتا

دوسری جنگ عظیم کی مختلف مہموں کا مطالعہ وہ بڑی دلچسپی سے کرتا رہا۔ اس کے مترجموں میں سے ایک اس امر کا سرگرم حامی تھا کہ اتحادیوں کو بلقان میں سے یورپ پر حملہ کرنا چاہیئے۔ بادشاہ ہمیشہ کہتا کہ یورپ پر حملے کے لیے بہترین مقام نارمنڈی ہے اور اصل حملے سے بہت پہلے پیشتر اس نے ایک خاکہ بھی بنا دیا تھا۔ جب حملہ ہوا تو بڑی حد تک اسی خاکے

کے مطابق تدبیریں اختیار کی گئیں۔ بادشاہ اخبار شاذ ہی دیکھتا تھا تاہم اسے تمام معاملات سے پوری آگاہی حاصل رہتی تھی اور یہ معاملات ادھر واشنگٹن، لندن یا ماسکو کے اخباروں میں شائع ہوتے تھے۔ ادھر ریاض میں ان پر بحث شروع ہو جاتی تھی۔

مرحوم بادشاہ کے محرکات میں سب سے بڑی قوت اس کا گہرا مذہبی ایمان تھا، یعنی اللہ تعالیٰ سے قرب کا ایک احساس اور یہ عقیدہ کہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ ہادی و رہنما ہے۔ یہ ایمان اس کی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھا۔ اس طرح وہ بہ یک وقت مذہبی اور سیاسی لیڈر بن گیا۔ وہ نماز، روزے اور حج کی پوری پابندی کرتا اور اپنی رعایا کی امامت کا فرض بڑی طمانیت اور سکونِ قلب سے بجا لاتا۔ اس کی ایک خوشی یہ تھی کہ محل میں ہر وقت ایک یا دو آدمی بلند آواز سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہیں۔

بادشاہ کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ وہابیوں کا مسلک رسول اللہ صلعم کی تعلیمات مقدسہ کی صحیح ترین تعبیر ہے۔ وہ دسمبر ۱۹۲۴ء میں مکہ معظمہ میں داخل ہوا۔ تو ان تمام غلط رسموں کو ختم کر دیا جو وہاں جاری ہو چکی تھیں، مثلاً مقبروں یا نام نہاد مقدس مقامات کی زیارت کے لیے حاجیوں سے روپے وصول کرنا۔ وہ قرآنی تعلیمات کا پورا پابند تھا اور عدل، غرباء و مساکین کے ساتھ حسن سلوک اور دوسرے معاملات میں اسلامی اصول ہی سے ہدایت حاصل کرتا تھا۔ وہ شراب نوشی، فحش کاری، مخلوط غسل، مغربی رقص یا عورتوں کی بے پردگی کا سخت مخالف تھا۔

بادشاہ کو اپنے ملک کی ترقی کا بہت خیال تھا۔ ہر وہ چیز جو اس ترقی سے متعلق ہوتی، اس کی توجہات کا خاص مرکز تھی۔ مثلاً بڑے بڑے شہروں کے درمیان سڑکوں کا جال بچھا دینا۔ یا پانی کے زیر تحت الارض خزانے موجود ہیں ان سے بہتر طریقے پر کام لینا۔ خاصی مخالفت کے باوجود اس نے اصرار کیا کہ خلیج فارس سے دارالحکومت تک دہنا کے ریگستان میں سے ریل کی پٹڑی بچھائی جائے۔ یہ فاصلہ قریباً ساڑھے تین سو میل تھا۔ وہ کہتا تھا کہ شمالی افریقہ میں ریل کی جو سڑک بنائی گئی ہے، وہ بھی ایسے ہی ریگ زاروں سے گزری ہے۔ اس نے نکتہ چینیوں کو یہ حقیقت بھی یاد دلائی کہ ہفوف اور ریاض کے درمیان کوئی قابل ذکر قصبہ موجود نہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مغربی حصے کو دیکھو وہاں ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ شہر بن گئے، حالانکہ پہلے یہ موجود نہ تھے۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ نل کنوئیں لگائے جائیں تاکہ بدو وہاں کھیتی باڑی شروع کر دیں۔ ساتھ ساتھ شہروں کی بنیاد رکھی جائے اس کا خیال تھا کہ اس طرح تدریجاً بدوؤں کو فائدہ پہنچے گا اور ریل میں آمدو رفت بڑھ جائے گی۔ یہ ریل مکمل ہو چکی ہے اور نتائج کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ بادشاہ اس پٹڑی کے بنوانے میں بالکل حق بجانب تھا۔ اس لیے کہ جو سامان ریاض بھیجا جاتا تھا اس کے خرچ میں معتدبہ کمی آگئی ہے۔

مرحوم ابن سعود ملکی معاملات جس انداز میں سطے کرتا تھا اس کے متعلق یہاں تین کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔

ایک عورت مقدمہ عدالت میں لائی کہ کھجور کے ایک درخت پر سے ایک آدمی

میرے شوہر پر گر پڑا۔ اس وجہ سے میرے شوہر کی موت واقع ہوئی۔ لہٰذا مجھے بدلہ دلایا جائے۔ ابتدائی عدالت نے بہ اصرار مدعیہ سے کہا کہ اس حادثے کے بدلے میں روپیہ لے لے۔ عورت نے اصرار کیا کہ میں تو اپنے شوہر کی موت کے بدلے میں ملزم کی موت ہی کی طلبگار ہوں۔ یہ مقدمہ مختلف عدالتوں میں چکر لگاتا ہوا بادشاہ کے پاس پہنچا جو دولت سعودیہ کی سب سے بڑی عدالت عالیہ ہے۔ بادشاہ نے مقدمہ سن کر عورت سے کہا: بے شک قرآن مجید کے حکم کے مطابق تو ملزم کی موت کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ملزم بھی اسی طرح مرے جس طرح تیرا شوہر مرا تھا۔ ہم اسے کھجور کے درخت کے نیچے باندھ کر بٹھا دیتے ہیں اور کسی کو اوپر سے اس پر گرانا چاہیئے، یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ چونکہ تیرا اس معاملے سے خاص تعلق ہے، لہٰذا تجھے اوپر سے گرائے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ عورت نے چپ چاپ روپیہ لیا۔ اور چلی گئی۔

دوسری کہانی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بادشاہ نے چوری اور رہزنی کو کیوں کر روکا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بدو بادشاہ کے کیمپ میں آیا اور بتایا کہ دور جنوب میں ربع الخالی کے بیرونی حصے میں ایک کنواں ہے جس پر قیمتی قہوے کی ایک بوری پڑی ہے۔ میں اس کے متعلق اطلاع دینے کے لیئے آیا ہوں بادشاہ نے کہا شاباش بھئی اسے تین زیال دے دو۔ اس لیے کہ اس نے اطلاع بہم پہنچائی۔ ساتھ ہی تین تازیانے لگاؤ۔ بدو نے پوچھا بھلا یہ سزا مجھے کس لیئے دی جا رہی ہے؟ جواب ملا: اس لیئے کہ تو نے بتایا کہ بوری قیمتی قہوے سے بھری ہوئی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ تو نے اسے کھولا حالانکہ میری

سلطنت میں کسی شخص کو اجازت نہیں کہ دوسرے کی ملکیت کو چھوئے۔
تیسری کہانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب کسی معاملے میں اس سے اتفاقیہ بے انصافی ہو جاتی تھی تو اس کی تلافی کے لیے آمادہ رہتا تھا۔ جب اہل حرم ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے تو بادشاہ کی ہر بیگم کو ایک ٹکٹ مل جاتا تھا۔ جس کے مطابق وہ خود اس کے بچے، رشتہ دار اور ملازم ایک مستقل ہوائی جہاز میں سفر کرنے کے حقدار بن جاتے تھے ۱۹۴۹ء کے موسم بہار میں ایک بیگم کو ٹکٹ ملا جس میں ذکر تھا کہ وہ پندرہ لواحقین اور سامان کے ساتھ سفر کر سکتی ہے۔ سامان عموماً بہت وزنی ہوتا ہے۔ خاتون نے مزید رشتے داروں کو ساتھ لینے کی غرض سے پندرہ کا ہندسہ بدل کر پینتیس بنا دیا۔ ہوائی اڈے پر جو افسر تھا، اس نے اس ٹکٹ کے مطابق سفر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ساتھ ہی کہا کہ اس طرح ہوائی جہاز میں وزن خطرناک حد تک زیادہ ہو جائے گا، بیگم نے بادشاہ سے شکایت کی اور اسے خوب غصہ دلا دیا۔ فوراً ایک اےڈی کانگ کے ذریعے سے افسر کے نام حکم پہنچا کہ جب تک میرے سپاہی گرفتاری کے لیے نہ آجائیں، اپنی جگہ سے مت ہلو۔ افسر کی خوش نصیبی تھی کہ اس موقع پر بادشاہ کا فرزند منصور بھی موجود تھا۔ وہ وزیر دفاع ہونے کی حیثیت میں محکمہ پرواز کا بھی نگران تھا۔ اس نے پورا واقعہ سن لیا اور اس افسر کو مکہ معظمہ بھیج دیا۔ دوسرے دن پورے حالات بادشاہ کے گوش گزار کر دیئے گئے۔ اس نے منصور اور افسر کو معاف کر دیا اور اپنی بیگم پر سخت خفا ہوا۔

جو شخص دولت سعودیہ میں کچھ دیر رہے وہ مرحوم بادشاہ کے متعلق ایسی کہانیاں ضرور سنے گا۔ جنھوں نے افسانوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے بدو آگ جلا کر بیٹھتے ہیں یا تاجر سودا خریدنے کے لیے جاتے ہیں۔ تو ایسی کہانیاں ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ شاہ ابن سعود اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے لیکن اس کے سوانح حیات اور کارنامے اس سرزمین کی روایات کا جزو بن چکے ہیں۔ جیسے اس کی بدولت اتحاد و استحکام کی نعمت ملی۔ کوئی عرب اپنے لیے اس سے بڑی یادگار تعمیر نہیں کر سکتا۔
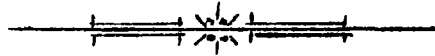
چوتھا باب

شاہ سعود، آل سعود

آل سعود اور ان کے دارالحکومت کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنا ہو تو ضروری ہے کہ سیاح جدہ سے ریاض تک اونٹ پر سفر کرتے۔ اگر وہ اکیس روز اس سفر میں بسر کرنے کے لیے تیار نہ ہو، ساتھ ہی عرب کے مغربی حصوں کے متعلق بہتر تصور کا خواہاں ہو، جو ہوائی جہاز کے ذریعے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا، تو مناسب یہ ہوگا کہ وہ ایسے ٹرک پر سفر کرے، جس میں ریت پر چلنے کے لیے بڑے بڑے ٹائر لگے ہوں۔ آل سعود نے اپنی مملکت میں ایسا امن قائم کر رکھا ہے کہ اجنبی سیاح اندیشۂ آزار کے بغیر پورے عرب میں سے گزر سکتا ہے یہ سفر دشوار اور تکلیف دہ ضرور ہوگا، مگر مناسب سامان ساتھ لے لینا چاہیے اور ایک دو سپاہی بھی ہمراہ ہوں۔ تو قطعاً کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ ضروری سامان میں کمبل، انگیٹھی، کوئلے کی بوریاں، کھانے کی چیزوں کے ڈبے، جن میں پھلوں

کارس بھی شامل ہونا چاہیئے، موٹر کی درستی کے اوزار، فالتو ٹائر، ٹائروں کی مرمت کے سامان کا تھیلا، پینے اور موٹر میں ڈالنے کا پانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انعام کے لیئے ریال کی بھی خاصی مقدار رکھ لینے چاہیئے۔

جدہ سے جو بڑی سڑک ریاض کو جاتی ہے۔ وہ حدود حرم میں سے گزرتی ہے۔ جس میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے۔ لہذا ایک دشوار گزار چکر کاٹنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ شرکت معدنیات سعودیہ کی سڑک اختیار کر لی جائے ڈیڑھ سو میل کی مسافت طے کر چکنے کے بعد برکۂ زبیدہ سے شرکت کی سڑک چھوڑ کر ایک میدان میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر زیادہ بارش ہو جائے تو اس حصّے میں سیلاب آجاتا ہے۔ اگر موسم خشک ہو تو بیس میل کی مسافت طے کر چکنے کے بعد سیاح مکہ سے ریاض جانے والی شاہراہ پر پہنچ جاتا ہے۔ جو "شارع ملکی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں صرف ایک دقت پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زمین کے ایسے ٹکڑے آجاتے ہیں جن میں ریت کے موٹے موٹے دل پھیلے ہوتے ہیں۔ یہاں پہنچکر سیاح کو اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس کی سواری صحرائی علاقے میں چلنے کے قابل ہے یا نہیں۔

اس سڑک پر سب سے پہلا قابل ذکر مقام موآیہ ہے، جہاں دولت سعودیہ نے اٹھارہ ہزار گیلن پٹرول کا ذخیرہ قائم کر رکھا ہے۔ پاس ہی موٹروں کی مرمت کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں۔ نیز ریڈیو اور تار کا ایک مرکز بھی ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو یہ شاہراہ سڑک نہیں رہتی۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ اونٹوں کے راستے کو ذرا چوڑا کر دیا گیا ہے۔ قریباً پچیس میل تک ایک ناہموار راستے پر چکولے

لگتے ہیں۔ آگے ایک خشک علاقہ آتا ہے۔ جہاں نہ ہرن ہیں اور نہ کوئی درخت بلکہ صحرا کی روئیدگی بھی نہیں ملتی۔ کوئی ایک سو میل کا فاصلہ طے کر لیا جائے تو سیاح عفیف نام کے گاؤں میں پہنچتا ہے، جہاں کوئی دو سو آدمی آباد ہیں۔ یہ لوگ سیاحوں اور مسافروں کے ہاتھ انڈے مرغیاں اور بھیڑیں فروخت کر کے گزارا کرتے ہیں۔ یہاں اکثر موٹر سوار ٹھہر جاتے ہیں تاکہ پٹرول اور کھانے پینے کی چیزیں لے لیں۔ آبادی سے باہر ٹھہرنا زیادہ مناسب ہے اور لوگ سڑک کے پاس ہی کھلے میدان میں مقیم ہو جاتے ہیں۔

خیمہ لگ جانے تو چند بدو پانی یا خوراک کی طلب میں پہنچ جاتے ہیں۔ غروب آفتاب کے بعد خنکی شروع ہو جاتی ہے۔ کوئلے یا صحرائی جھاڑیاں سلگا کر آگ کا بندوبست کر لیا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد آگ بجھا دی جاتی ہے اور مسافر کمبل اوڑھ کر ریت پر لیٹ جاتا ہے۔ رات کی ہوا خاردار جھاڑیوں اور گھاس میں سے سرسر کرتی ہوئی آتی ہے۔ سر پر عرب کی صاف فضا میں تارے جگمگ جگمگ کرتے ہیں اور دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت سقف کا منظر پیدا ہو جاتا ہے۔

صبح اٹھتے ہی یمنی قہوہ مل جاتا ہے اور عفیف کے پورے ابلے ہوئے انڈے پھلوں کے رس کے ساتھ کھا لیے جاتے ہیں۔ اس مقام سے ایک سو پندرہ میل کی مسافت تک "شارع ملکی" ہموار میدانوں سے گزرتا ہے۔ پھر سیاح دوادمی پہنچ جاتا ہے۔ یہاں دو نخلستان ہیں جن کے ارد گرد چھوٹی سنگلاخ پہاڑیاں ہیں۔ اس جگہ کوئی چار ہزار عرب آباد ہیں، جو کھجوروں اور سبزیوں کی کاشت کرتے ہیں۔ دونوں نخلستانوں کے درمیان

مٹی کی دیواروں کا قلعہ ہے جس میں پٹرول کی بھی خاصی مقدار موجود رہتی ہے اور لاسلکی کا ایک برج بھی موجود ہے۔

دوادمی سے آگے بڑھیں تو نجد کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہی علاقہ عرب کی وسطی سطح مرتفع اور اس کا قلب ہے۔ اپریل کے مہینے تک یہاں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ سن کے پیلے پیلے پھول اور "صعتر" یعنی جنگلی پودینہ وغیرہ چیزیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اپریل کے مہینے میں نجد کو دیکھنا جب اطراف کے سیاہ خیموں سے دھوئیں کی لہریں اٹھ رہی ہوں، اونٹ کا دودھ پینا، اور رگوں میں بجلی کی لہریں دوڑا دینے والی خالص ہوا میں سانس لینا عربوں کے نزدیک زندگی کی اصل نعمتیں ہیں۔ اس زرخیز میدان میں چالیس میل طے کر چکنے کے بعد سرابی افق پر ایک نقطہ سا نمودار ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ پھیلتے پھیلتے تانبے کے رنگ کی ریت کی پٹی بن جاتا ہے یہ نفود السر ہے۔ ریت کی یہ پٹی سعودی دارالحکومت کو شمالی عرب کی ریت سے محفوظ کیے ہوئے ہے۔ بہت سے امریکیوں کا خیال ہے کہ دولتِ سعودیہ مسلسل لہریں لینے والی ریت کا ایک سمندر ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ شمالی جانب یقیناً ریت کی ایک جھیل ہے جسے "نفود" کہتے ہیں مشہور برطانوی سیاح بلنٹ نے بتایا تھا کہ اس کا رنگ ریوند چینی اور میگنیشیا سے ملتا جلتا ہے۔ جنوبی جانب ربع الخالی واقع ہے۔ جو ریت کا ایک وسیع مواج سمندر ہے۔ ہواؤں کا رخ شمالی اور مغربی ہے۔ نفود کی ریت آہستہ آہستہ دو راستوں سے ربع الخالی کی طرف بڑھتی ہے۔ ایک نفود السر کا راستہ جو ریاض کے مغرب میں واقع ہے دوسرا دہنا کا راستہ جو ریاض اور خلیج فارس کے درمیان ریت کے ٹیلے بناتا چلا گیا ہے جس

جگہ شاہراہ ملکی "نفود السّر" کو عبور کرتا ہے۔ یہاں یہ ریگ زار کا عرض تقریباً پندرہ میل ہوگا۔ تانبے کے رنگ کے شاندار ٹیلے جن میں سے بعض پچاس پچاس فٹ کی بلندی تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ ہر سال تقریباً تیس فٹ کی رفتار سے جنوب کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ ان میں بعض کی شکل ہلال کی سی ہے اور ان کی پشت ہوا کی جانب رہتی ہے۔ موسم گرما میں یا بعد دوپہر یہاں سے گزرنا ہو تو ریت میں گزرنے والے ٹائر موٹر میں لگا لینے چاہئیں۔ بہرحال بہتر یہی ہے کہ دوسری سواریوں کے نشان سے ہٹ کر چلا جائے اور رفتار تیز رکھی جائے۔

"نفود السّر" سے آگے بڑھیں تو چالیس میل پر مرّہ نام مقام آتا ہے۔ جو مکہ اور ریاض کے درمیان سب سے بڑی آبادی ہے۔ اس قصبے کے اردگرد فصیل بنی ہوئی ہے۔ ریڈیو کا انتظام ہے، پٹرول ہر وقت دستیاب رہتا ہے۔ نیز یہاں بہت سے باغات ہیں۔ اس کا موقع اور محل خاص طور پر اہم ہے۔ مغربی جانب نفود السّر کا ریگ زار اپنے ٹیلوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مشرقی جانب جبل طویق کھڑا ہے اور پر جانے کا راستہ ڈھلوان تنگ اور ناہموار ہے۔ اوپر پہنچ جانے کے بعد سڑک ریت کی وادیوں میں سے بل کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ بہت سے مسافر رات گزارنے کے لیے یہاں بھی ٹھہر جاتے ہیں۔ گویا سفر میں یہ ان کی دوسری منزل ہوتی ہے۔ کھلا انھیں سطح مرتفع کی ٹھنڈی ہوا سے محفوظ رکھتے ہیں۔ واضح رہے یہ مقام بحیرہ قلزم سے تین ہزار فٹ اونچا ہے۔

اگلی صبح کو اٹھیں تو جنوبی اور مشرقی رخ اختیار کیا جاتا ہے۔ تیس میل کا فاصلہ طے کر چکنے کے بعد قصبہ حلیلہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں ایک پرانی عرب آبادی تھی۔ جو ویران ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں یہ قصبہ از سر نو بسایا گیا۔ اس حصے میں دولت سعودیہ کی آبادی سب سے زیادہ گھنی ہے۔ سطح مرتفع میں جابجا گاؤں، کنوؤں کے اردگرد بس گئے ہیں۔

کھیتوں میں سبزیاں، کھجور، جَو، گندم وغیرہ چیزیں خوب پیدا ہوتی ہیں جبکہ کے ارد گرد دُور دُور تک یہ میدان نظر آتا ہے۔ راستے میں سبزہ کہیں نہیں۔ پھر کھجوروں کے جھنڈ آجاتے ہیں یا دیواروں سے گھرے ہوئے باغ۔ سامنے مٹی کی اونچی دیواریں یہ بتاتی ہیں کہ ریاض پہنچ گئے۔ جو شخص ہوائی جہاز میں ریاض جائے، اس کا تجربہ موٹر میں جانے والے سیاح سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دولتِ سعودیہ یا ارامکو کا ہوائی جہاز چار گھنٹے میں ریاض پہنچا دیتا ہے۔ ہوائی جہاز پہلے جس میدان میں اترتے تھے، وہ شہر سے خاصی دُور تھا۔ موجودہ اڈہ شہر سے صرف دو میل کے فاصلے پر ہے۔ امریکی کمپنی نے یہاں پتھر کی بہت سی عمارتیں بنا دی ہیں۔ اور ہوائی جہازوں کے لئے دو پرواز گاہیں بن گئی ہیں، جن پر روشنی کا انتظام کر دیا گیا ہے تاکہ رات کے وقت بھی ہوائی جہاز بے تکلف اتر سکے۔

مغربی ملکوں سے سیاح ریاض پہنچیں تو دولتِ سعودیہ کی محافظ فوج سلامی دیتی ہے۔ یہ عرب سبز رنگ کا لباس پہنتے ہیں، جس کی وضع قطع یورپی ہوتی ہے۔ سروں پر سُرخ رنگ کا چوخانہ رومال ہوتا ہے جسے عام طور پر مندیل کہا جاتا ہے اس پر سیاہ ریشم کا عقال ہوتا ہے۔ کوئی بڑا سرکاری مہمان آنے والا ہو تو پیشوائی کے لیے وزیرِ دربار آتا ہے۔ وہ سیاح کو ایک سفید خیمے میں لے جاتا ہے، جس میں اعلےٰ درجے کے قالین بچھے رہتے ہیں اور اردگرد کرسیاں پڑی ہوتی ہیں۔ کوئی پندرہ منٹ تک بادشاہ کی صحت اور سفر کے متعلق بات چیت کے بعد سیاحوں کو موٹروں میں سوار کرا دیا جاتا ہے۔

ریاض کی دیواریں مٹی کی ہیں۔ ایک زمانے میں اس کی فصیل میں پچاس برج

اور ان کے علاوہ دو مے تھے۔ جامع مسجد اور قلعہ بھی مٹی ہی کے ہیں جو آمنے سامنے واقع ہیں۔ قصبے کی سب سے بڑی عمارت سفید رنگ کا شاہی محل ہے۔ جو مرحوم ابن سعود نے بنوایا تھا۔ اس کے کئی حصے ہیں۔ عورتوں بچوں اور ملازموں کی قیام گاہوں کے علاوہ اس میں بہت سے ہال، باریابی کے ایوان، دفاتر اور دوسرے کمرے ہیں۔ شاہ سعود اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔ اس کا اپنا نیا محل بھی قریب ہی واقع ہے۔

جو سیاح سرکاری مہمانوں کی حیثیت میں ریاض پہنچتے ہیں انھیں بدلیعہ محل میں لے جاتے ہیں، جو ریاض سے آگے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر مغربی جانب کی وادی میں واقع ہے۔ اس میں دورِ جدید کی مختلف چیزیں جمع کر دی گئی ہیں۔ محل کی کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوئے ہیں۔ ساز و سامان کی کوئی کمی نہیں۔ ملازم غسل کے لیئے پانی گرم کر دیتے ہیں۔ کھانا بڑا اچھا ملتا ہے۔ بادشاہ سے ملاقات کے لیے محل میں جانا پڑے تو تجربہ کار سیاحوں پر بھی اک گونہ اضطراب طاری ہو جاتا ہے۔ موٹر بجلی کے مرکز کے پاس سے گزرتی ہے، جو ۱۹۲۶ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ پھر شہر میں سے ہو کر چلتے ہیں۔ ڈرائیور کو مسلسل ہارن بجاتا پڑتا ہے۔ آواز سنتے ہی لوگ ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔ مکانوں کی کھڑکیاں عموماً دوسری منزلوں سے شروع ہوتی ہیں اور کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوتی ہیں۔ محل کے دروازے پر محافظ فوج سلامی دیتی ہے۔ اندرونی دروازے سے گزرتے ہی پتھر کے ایک تنگ زینے پر سے ہوتے ہوئے ایک آراستہ بالاخانے میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں آداب دربار کی پیروی کرتے ہوئے عربی لباس پہنا جاتا ہے۔ یہ ہو چکتا ہے تو مہمانوں کو مجلس میں درجے کے مطابق بٹھا دیتے ہیں۔ ہال ایک سو فٹ لمبا چالیس فٹ چوڑا اور بیس فٹ

اونچا ہے۔ بھاری ستونوں کی ایک قطار وسط میں سے گزرتی ہے۔ رنگ و روغن سے انہیں سنگِ مرمر کے مشابہ بنا دیا گیا ہے۔ دائیں ہاتھ کی دیوار میں سلاخ دار کھڑکیاں ہیں۔ دیواروں کے ساتھ صوفے لگے ہوئے ہیں۔ جن پر نہایت عمدہ زربفت چڑھا ہوا ہے۔ ہال کے دائیں گوشے میں جو سب سے بڑا صوفا ہے اس پر شاہ سعود بن عبدالعزیز بیٹھتا ہے۔ اکاون سال کی عمر، چہرے کا رنگ ہسپانیوں جیسا ہے۔ خط و خال ابھرے ہوئے۔ ناک کا بانسا عربوں کی طرح بلند ہے۔ آنکھوں پر ہلکے سیاہ رنگ کے چشمے۔ بادشاہ مہمانوں کا استقبال کھڑے ہو کر کرتا ہے۔ اور گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر دائیں جانب کے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیتا ہے۔ بیرونی لوگوں کے ساتھ ترجمان کے ذریعے سے باتیں ہوتی ہیں۔ مال و دولت کی فراوانی کے باوجود بادشاہ بہت سادہ لباس پہنتا ہے۔ ایک چغہ عموماً زیب بدن دیکھا گیا جو گھٹنوں تک لمبا ہوتا ہے ظاہری وضع قطع کے اعتبار سے اسے تبت نوابی کے سفید سوتی گاؤن جیسا سمجھنا چاہیئے۔ اوپر سیاہ یا کتھئی رنگ کی عبا ہوتی ہے۔ جس کے کناروں پر سنہری کلابتون لگا رہتا ہے۔ سر پر سیاہ "قطیفہ" اور اس پر سنہری کلابتوں کا عقال۔ یہ عرب میں بادشاہی کا خاص نشان ہے۔ مرحوم ابن سعود سفید اور سرخ خانہ دار "قطیفہ" پسند کرتے تھے۔ موجودہ حکمران بھی وقتاً فوقتاً دلیسے "قطیفے" استعمال کرتا ہے۔ سعود اپنے والد کے برابر کشیدہ قامت نہیں، پھر بھی قد چھ فٹ دو انچ سے کم نہ ہوگا۔ بینائی ذرا کمزور ہے۔

سعود جنوری ۱۹۰۲ء کو اسی شب میں پیدا ہوا تھا جس شب میں اس کے والد نے چند جانبازوں کے ساتھ ریاض فتح کیا تھا۔ اس سے بڑا ایک بھائی ترکی نام

تھا۔ جو ۱۹۱۷ء۔ ۱۹۱۹ء کے دبائی انفلوئنزا میں انتقال کر گیا۔ تاہم سعود کی ولی عہدی کا اعلان ۱۱ مئی ۱۹۳۳ء تک نہ ہوا، اس لیئے کہ عربوں کے نزدیک ولی عہدی اور جانشینی کا فیصلہ محض عمر میں اولیت کی بنا پر نہیں، بلکہ قیادت کی صلاحیت اور کردار کی موزونیت کی بنا پر ہونا چاہیئے۔ مرحوم ابن سعود ہر نقطۂ نگاہ سے اپنے فرزندوں کی صلاحیت کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ ان کا تیسرا بیٹا محمد جو ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا تھا، بڑا فیاض، جوانمرد اور بے پروائی کی حد تک منچلا تھا۔ لیکن یہ خصوصیتیں بدوی قبائل کی سرداری کے لیئے تو موزوں تھیں۔ ایک بہت بڑے ملک کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیئے توازن اور بالغ نظری و پختہ کاری کے جن اوصاف کی ضرورت تھی، وہ اس میں موجود نہ تھے۔ دوسرا بیٹا فیصل بڑا ہوشیار اور عقلمند تھا۔ وزیر خارجہ کی حیثیت میں اسے بہت زیادہ وقت باہر صرف کرنا پڑا، اور مغربی دنیا میں لمبی مدت تک قیامت عربی بدوؤں جیسی راسخ العقیدہ قوم میں ہر دلعزیزی کے لیئے موزوں نہ سمجھی جا سکتی تھی۔ ان دونوں کے برعکس سعود نہ تو بہت زیادہ منچلا تھا، اور نہ بہت زیادہ متین فہم جسمانی وضع و ساخت میں وہ اپنے والد سے ایک حد تک ملتا جلتا تھا۔ اور فکر و نظر کے لحاظ سے وہ ایسا موزوں حکمران تھا جس کے ساتھ بدوی اور حضری دونوں یکساں وفاداری پر آمادہ ہوں۔ وہ نہایت اچھا سوار اور نہایت عمدہ تیغ زن تھا۔ یمن کے ساتھ جنگ کی نوبت آئی تو سعودی فوج کے مشرقی محاذ کی کمان اسی کے سپرد تھی۔ اس موقع پر وہ نہ صرف بہادر اور قابل سالار ہی ثابت ہوا، بلکہ خوش نصیبی بھی اس کے ہمرکاب رہی۔ چونکہ وہ اپنے والد کی اولاد میں سب سے زیادہ متقی اور پابند شرع تھا۔ اس لیئے نماز میں امامت خود کرتا اور قرآن مجید کی تلاوت

بھی اس کے لیئے مسرت کا باعث ہوتی - اسلامی اداروں خصوصاً مسجدوں کی درستی اور بحالی کے لیئے اس نے ہمیشہ گراں قدر امداد دی -

امیر سعود کی قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ یہ ہے - کہ بدوی قبائل کے ساتھ اس کے تعلقات بڑے گہرے ہیں - جوانی کے عالم میں وہ شکار کھیلنے کے لیئے نکلتا تھا یا جنگ میں جاتا تھا تو قبائلی سرداروں میں اس نے بڑی ہر دلعزیزی پیدا کر لی تھی - والد نے قبائلی معاملات اسی کے سپرد کر دیئے تھے اور مختلف قبیلوں کو جو مالی امداد ملتی تھی وہ بھی سعود ہی کے ذریعے سے تقسیم ہوتی تھی - انجام کار مرحوم ابن سعود نے اسے ولی عہد نامزد کر دینے کا فیصلہ کر لیا -

وہ پہلی مرتبہ چوبیس سال کی عمر میں وطن سے باہر نکلا اور ایک طبیب سے آنکھوں کے متعلق مشورے کے لیئے مصر گیا - ۱۹۳۵ء میں اس نے یورپ کے مختلف مرکزوں کا دورہ کیا - شاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی کے موقع پر وہ دولت سعودیہ کے نمائندے کی حیثیت میں شامل ہوا اور شاہ جارج ششم کی تاجپوشی کی تقریب میں بھی موجود تھا - ۱۹۴۰ء میں اٹلی گیا ، ۱۹۴۶ء میں عربوں کی اس کانفرنس میں شریک ہوا جو مصر میں منعقد کی گئی تھی -

جنوری ۱۹۴۷ء میں وہ امریکہ جانے کے لیے ظہران سے ہوائی جہاز میں سوار ہوا - اس موقعہ پر بڑی عظیم الشان تقریب کا انتظام کیا گیا تھا - موسم کی خرابی کے باعث امیر سعود کا ہوائی جہاز دو دن تک لنڈن میں رکا رہا - اس موقع پر گلبنکیان[1] نام ایک ارمنی نے امیر موصوف سے مفصل ملاقاتیں کیں - اور تیل کی بین الاقوامی

---

[1] GULBENKIAN.

حالت کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہنچائیں۔ خود گل بنکیاں عراق پٹرولیم کمپنی میں پانچ فی صد حصوں کا مالک تھا۔ واشنگٹن میں امیر سعود کا استقبال بڑے شاندار طریقے پر کیا گیا۔ امیر نے صدر ٹرومین کو ایک تلوار پیش کی جس کا میان سنہری تھا اور اس پر جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ صدر ٹرومین نے اس تحفے کے بدلے میں اپنی دستخطی تصویر پیش کی۔

سعودی سفارت خانے میں اخباروں کے نمایندوں کا اجتماع ہوا۔ اس موقعے پر امیر سعود نے جو بیان دیا اس کا ایک حصہ ذیل میں درج ہے:

"ہمارے آپ کے ملکوں نے دنیا میں جو کردار ادا کیا ہے اس نے ہمیں باہم قریب تر لے آیا ہے۔ میرا ملک اسلام کی ارض مقدس اور عربوں کی دینداری کا گہوارہ ہے۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں اسلام کا ظہور ہوا۔ اسلام آج نسل انسانی کے بہت بڑے حصے کا مذہب ہے۔ یہی سرزمین ہے جس کی طرف دنیا کے تمام حصوں میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کے دل اور ان کی نگاہیں دن میں پانچ وقت متوجہ ہوتی ہیں۔ یہی سرزمین ہے جس نے دنیا کی مختلف قوموں اور آبادیوں کو ایک بہت بڑی روحانی روشنی اور دنیا و عقبیٰ میں نجات کی امید عطا کی ہے۔
دوسری طرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ جمہوریت کی علمدار ہیں۔ یہ سرزمین صنعت و حرفت اور سائنس کی ترقیات کا مرکز ہے اور دنیا میں آزادی سے محبت رکھنے والے جتنے قلوب ہیں وہ رہنمائی اور فیضان کے لیے اسی ملک کی طرف دیکھتے ہیں۔"

امیر سعود نے اخباری نمایندوں سے اسی بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کی

جیسے وہ بدو سرداروں کے مجمعے میں بیٹھ کر کرنے کا عادی تھا انھوں نے تمام سوالات کا جواب بڑی خوش اسلوبی سے دیا۔ امیر موصوف کو نی آدھ گھنٹے کے لیے سینٹ کے اجلاس میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ عین اسی موقع پر سینٹ کے ایک ممبر نے صدر جمہوریہ پر اس لیے شدید نکتہ چینی کی کہ انھیں فوجی مصارف کا اتنا زیادہ اختیار دے دیا گیا ہے۔ امیر موصوف صدر حکومت پر اس نکتہ چینی سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ میری لینڈ[1] کا سرکاری زرعی مرکز بھی اس نے دیکھا اور وہاں ان پھلوں کے پودوں سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا جو نسبتاً خشک آب و ہوا کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ اسی طرح بھیڑوں کی اس قسم میں بھی بڑی گہری دلچسپی لی۔ جو غیر معمولی طور پر جفاکش ہوتی ہیں۔

امیر سعود نے واشنگٹن میں صدر جمہوریہ امریکہ سے بھی ایک گھنٹے تک مفصل گفتگو کی۔ ایک موقعے پر امیر سے کہا گیا کہ نیویارک اتنا بڑا شہر ہے کہ مشرق قریب کے تمام شہر بھی ملا دیے جائیں تو ان کی آبادی اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی صرف ایک فلک بوس عمارت میں پانچ ہزار آدمی کام کر رہے ہیں۔ امیر سعود نے فوراً کہا کہ میرے والد کے محل میں بھی قریباً اتنے ہی کارکن موجود ہیں۔ نیویارک کو دیکھ کر امیر سعود نے کہا کہ میں پہلے سمجھتا تھا میرے بھائی اس شہر کا ذکر کرتے ہوئے مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ انھوں نے کہا تھا وہ حقیقت کا محض ایک حصہ تھا۔ سفارت خانۂ دولت سعودیہ میں نہایت

---

[1] Maryland. جمہوریہ امریکہ کی ایک ریاست جس کا مشہور شہر بالٹی مور ہے۔

پرتکلف دعوت طعام کا انتظام کیا گیا، جہاں سالم دنبے بڑے بڑے قابوں میں رکھ کر پیش کیے گئے اور ان کے پیٹوں میں چاول، خرما، بادام اور دوسرے مسالے بھرے ہوئے تھے۔

امیر سعود نے ایک دن پرنسٹن یونیورسٹی دیکھنے میں صرف کیا جہاں عربیات کے مشہور ماہر ڈاکٹر فلپ کے ہٹی[1] نے امیر موصوف کو مختلف حصے دکھائے۔ امیر یونیورسٹی کا عربی کتب خانہ دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ نیز اس بات پر اسے سخت تعجب تھا کہ طلبہ کی اتنی بڑی تعداد عربی زبان اور مشرق وسطی کے مسائل کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہے۔ ایک دن امیر سعود نیڈرلینڈ کے بینک کے تہ خانوں میں پہنچا، جہاں چالیس کھرب ڈالر کی سنہری سلاخیں پڑی تھیں۔ ایک شخص نے امیر موصوف سے مخاطب ہو کر کہا: "آپ کی دولت تیل ہے اور وہ زمین کے اندر محفوظ ہے۔ ہماری دولت سونا ہے اور ہم اسے یہاں رکھتے ہیں۔" امیر نے فوراً جواب دیا: "اب ہم تیل نکال نکال کر آپ کو بھیج رہے ہیں۔ اور آپ اپنا سونا نکال نکال کر ہمارے حوالے کر رہے ہیں۔ دعا کیجیے کہ یہ لین دین ہم دونوں کے لیے خوشگواری کا باعث ہو۔"

---

[1] Philips K. Hitti مشہور لبنانی مسیحی عرب، جو پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہے، اور جس نے تاریخ عرب، تاریخ شام اور تاریخ لبنان جیسی تصانیف کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ پرنسٹن یونیورسٹی نیوجرسی ریاست میں ہے۔ جو نیویارک سے متصل ہے۔

امیر سعود نے لیک سکسس[i] میں انجمن اقوام متحدہ کا دفتر بھی دیکھا اور فرمایا مسلمان ہر سال حج کے موقعہ پر مکہ معظمہ میں جمع ہوتے ہیں مجھے یہ مقام دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، جہاں دنیا بھر کے نمائندے جمہوری مقاصد کی حفاظت کے لیے ہر سال جمع ہوتے ہیں۔ عربی امریکی آئل کمپنی کے مہمان کی حیثیت میں امیر موصوف نے ریاستہائے متحدہ کا دورہ کیا۔ وہ پٹس برگ[ii]، ڈیٹ رائٹ[iii] اور شکاگو کے صنعتی مرکزوں کے علاوہ ٹکساس[iv] ایری زونا[v] اور کیلیفورنیا[vi] بھی گیا، جہاں کی گرم و خشک ہوا اور اکثر ریگستانی زمین خود امیر موصوف کے ملک سے زیادہ ملتی جلتی تھی۔ اس دورے میں امیر نے بولڈر ڈیم[vii] بھی دیکھا، جہاں پانی کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہے۔ اس سے بجلی بھی حاصل کی جا رہی ہے۔ نہریں اور سرنگیں بھی بنی ہوئی ہیں جو کیلیفورنیا کے جنوبی حصے میں پانی پہنچاتی ہیں، حالانکہ فاصلہ دو سو چالیس میل سے کم نہیں۔ امیر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: "میں نے جو کچھ دیکھا اس میں سب سے زیادہ متاثر اس منصوبے سے ہوا۔ یہ واقعی امریکہ کی عظمت کا نشان ہے۔ کہ قدرت کے وسائل پر عوام کی بہبود کے لیے قابو پالیا گیا۔ ایسے منصوبوں سے متعلق ہمیں آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

(i) Lake Success انجمن اقوام متحدہ کا مرکز جو نیویارک کے نزدیک ہے

(ii) Pittsburgh ریاست پنسلوینیا میں (iii) Detroit ریاست مشی گن میں جہاں فورڈ موٹروں کا کارخانہ ہے

(iv) Texas (v) Arizona

(vi) California جمہوریہ امریکہ کی ایک ریاست

(vii) Boulder Dam نیواڈا Nevada ہے جو کیلیفورنیا کے مشرق میں واقع ہے۔ بولڈر ڈیم یا بند بولڈر اسی ریاست میں ہے اور یہ انجنیری کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

اس دورے سے چھ سال بعد ۹ رنومبر ۱۹۵۳ء کو امیر سعود تخت نشین ہوئے چھ سال کا یہ زمانہ ولی عہد کے لیے روز افزوں ذمہ داریوں کا زمانہ تھا۔ بیرونی دنیا سمجھ رہی تھی کہ امیر سعود اپنے باپ کے زیر سایہ فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور خود ان کے ذمے کوئی کام کاج نہیں حقیقت یہ ہے کہ ولی عہد اپنے سن رسیدہ والد کی نگرانی میں آہستہ آہستہ حکمرانی کی زیادہ تر ذمہ داریاں سنبھالتا چلا جا رہا تھا - سالہا سال سے شاہی محلات اور دور دور تک پھیلے ہوئے شاہی املاک کا انتظام اسی کے سپرد تھا - قبائلی معاملات بھی اسی کے حوالے تھے - پھر آہستہ آہستہ تیل کی مراعات کے متعلق "ارامکو" کے ساتھ گفت و شنید بھی اس کے ذمے لگا دی گئی - امریکی سفیر کے ساتھ سیاسی تعلقات کا معاملہ بھی اسی کو سونپ دیا گیا - سب سے آخر میں ظہران کے ہوائی اڈے کا معاملہ تھا - اس بارے میں جو مسائل پیدا ہوتے، امریکی کمانڈر کے ساتھ امیر سعود ہی بات چیت کرتا - امیر فیصل بدستور وزیر خارجہ تھا، لیکن امیر سعود کو بھی معاملات خارجہ کے بعض پہلوؤں میں حصہ لینا پڑتا - مثلاً دولت سعودیہ اور خلیج فارس کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ساتھ سرحدوں کے متعلق اختلافات تھے - یہ ریاستیں برطانیہ کے زیر حمایت تھیں - اس وجہ سے اختلافات کے متعلق برطانوی نمائندوں ہی سے گفتگو کرنا پڑتی - بہت افواہیں اڑیں کہ امیر سعود اس سلطنت کو متحد نہ رکھ سکے گا، جو اس کے والد نے پیدا کی تھی، اور اسے اپنے بھائیوں پر بھی پورا قابو حاصل نہیں، لیکن ولی عہد نے انتظام مملکت میں ایسی صلاحیتوں کی نمائش کی کہ

بھائیوں کے بیٹے بھی اس کی سرداری قبول کر لینے میں تامل کی کوئی وجہ نہ رہی اس سلسلے میں پہلا مظاہرہ امیر فیصل نے کیا ۱۹۴۸ء میں امیر فیصل انجمن اقوام متحدہ کے اجلاس سے واپس آیا تو امیر سعود نے ریاض کے ہوائی اڈے پر اس کا استقبال کیا۔ دونوں بھائی کھلی موٹر میں سوار ہوئے۔ امیر سعود موٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا، امیر فیصل بھائی کے قدموں میں موٹر کے فرش پر بیٹھ گیا۔ بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ محض نمائش ہی نمائش ہے لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ حقیقت یہی تھی اور مرحوم بادشاہ نے امیر سعود کو ولی عہد بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا، بالکل درست تھا۔

۱۹۵۰ء کے وسط میں شاہ عبدالعزیز ابن سعود کی صحت میں نمایاں خرابی شروع ہوئی اسے پہلے رات، کے وقت کام چھوڑ دینا پڑا۔ پھر دن میں بھی سرکاری معاملات پر توجہ کے اوقات پہلے سے کم کر دیئے گئے۔ صرف صبح کے وقت چند گھنٹے وہ ضروری کام دیکھ لیتا تھا۔ حکومت کا سارا بوجھ آہستہ آہستہ امیر سعود کے کندھوں پر آ پڑا۔ ستمبر ۱۹۵۳ء میں ملک عبدالعزیز بن سعود طائف میں تھا، جب اس پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ اس وقت تک امیر سعود حکمرانی کے تمام معاملات سنبھال چکا تھا۔ والد کے انتقال تک امیر موصوف دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ سلطنت کے سپہ سالار اعظم اور وزیر اعظم کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ ۹۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو وزارت بنا دی گئی، جو اس کے روبرو جواب دہ تھی۔ یہ دراصل ۱۹۳۲ء کے ایک شاہی فرمان پر عمل پیرائی کا پہلا قدم تھا۔ ستمبر میں ملک عبدالعزیز کی صحت تین روز کے

بعد سنبھل گئی لیکن یہ واضح ہو چکا تھا کہ انجام زیادہ دور نہیں۔ بادشاہ سٹریچر میں سوار ہو کر طائف سے ریاض جانے پر راضی نہ ہوا۔ ۸ - نومبر کو اس کی صحت پھر بگڑ گئی۔ دولت سعودیہ کے تمام ہوائی جہازوں کی پرواز روک دی گئی اس لیئے کہ سارے ہوائی جہاز شاہی خاندان کے مختلف افراد کو طائف پہنچانے کی غرض سے فراہم کر لیئے گئے۔ بلکہ جو افراد ملک سے باہر تھے انہیں واپس لانے کے لیے غیر ملکی جہاز کرائے پر لیئے گئے۔ تھوڑی دیر تک یہ خیال رہا کہ بادشاہ کا فولادی ڈھانچہ اس مشکل سے بھی بخیر و عافیت گزر جائے گا لیکن تہتر سال کی عمر تھی، جو پوری کی پوری انتہائی جفاکشی میں گزری تھی، اور گیارہ پرانے زخم تازہ ہو گئے تھے۔ ۹ - نومبر کی صبح کو چھ بجے کے قریب شاہ عبدالعزیز بن سعود جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ ایک گھنٹہ بعد مرحوم کے تمام فرزند طائف کے محل میں جمع ہوئے۔ انھوں نے امیر سعود کے ساتھ حلف وفاداری کی تجدید کی اور امیر فیصل کو نیا ولی عہد چن لیا گیا۔

دوسرے روز مرحوم بادشاہ کی میت ہوائی جہاز کے ذریعے سے ریاض پہنچا دی گئی اور اسے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ پانچ روز تک سرکاری حیثیت میں سوگ منایا گیا۔ بازار بند رہے، پرچم سرنگوں رکھے گئے۔ لوگ بلند آواز سے بات نہیں کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ حالات معمول پر آ گئے۔

ملک عبدالعزیز کی وفات کے تھوڑے دیر بعد نئے بادشاہ نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ میں والد کے نقش قدم پر چلوں گا۔ ان تمام لوگوں

کی حمایت کروں گا۔ جو مرحوم کے حامی تھے۔ زیادہ تر افسر اپنے اپنے عہدوں پر بحال رہیں گے۔ اور دولت سعودیہ کی خارجہ پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ ہو گی۔ تقریر کا ایک حصہ یہ تھا :۔

میں ملک کے نظم و نسق اور دوسرے معاملات میں مذہبی احکام پر چلتا رہوں گا۔ خدائے قادر و توانا کی امداد حاصل کرنا میرا نصب العین ہو گا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ خدا کے کلام پاک اور رسول اکرم صلعم کے ارشادات کا پابند رہوں گا۔ میری تلوار اور میری زبان ان احکام کے نفاذ کے لیے وقف رہے گی اور میں اپنی محبوب رعایا کو مطمئن اور خوشحال رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھوں گا۔ میں ملک کی سیاسی، معاشی اور مجلسی ترقی کے لیے کام کرتا رہوں گا۔ ملک کے مفاد کا نگران رہوں گا۔ عوام کے حقوق کی حفاظت کروں گا۔ ان حقوق کی راہ میں جتنی مشکلات پیش آئیں گی، ان پر قابو پاؤں گا۔ جو مظاہرہ خلاف اخلاق اور شرمناک ہو گا اس کا قلع قمع کر ڈالوں گا۔ اپنی فوجی اور قومی توتوں پر میری توجہ خاص طور پر مبذول رہے گی۔ تمام اسلامی اور عرب ممالک کے ساتھ اسلامی اور عربی برادری کے رشتے زیادہ سے زیادہ مستحکم کروں گا۔ ان غیر ممالک کے ساتھ میری دوستی برابر جاری رہے گی، جو مرحوم بادشاہ کی مشفقانہ توجہات سے مستفید ہوتے رہے۔ میری کوشش یہ ہو گی کہ امن عالم کی حفاظت کے سلسلے میں میرا ملک اپنا اصل مقام حاصل کر لے۔"

نئے بادشاہ نے تمام قیدی رہا کر دیئے۔ غیر ملکیوں پر جو پابندیاں ضرورتاً عائد کی گئی تھیں، وہ اٹھا دی گئیں۔ تخت نشینی کے بعد بادشاہ کا زیادہ وقت جدہ میں گزرا، جہاں اس نے غیر ملکی سفیروں اور کاروباری آدمیوں سے ملاقاتیں کیں مکہ معظمہ میں وہ علمائے کرام سے بات چیت کرتا رہا۔ لیکن اس کی اصل سکونت ریاض ہی میں ہے، جہاں اس کے رشتہ دار، دوست یا دوسرے ملکوں کے حکمران آکر ملاقاتیں کرتے ہیں۔

مرحوم بادشاہ کی دانشمندی و دور اندیشی ہی کی برکت تھی کہ دولت سعودیہ کا موجودہ حکمران اپنے منصب کے تمام وظیفوں کے بارے میں پوری تربیت پا چکا ہے۔ سیاسی سمندر ساکن ہو تو وہ گہرائیوں میں بھی تیرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ابھی دیکھنا ہے کہ آیا وہ طوفانی سمندر میں بھی اسی طرح تیر سکتا ہے؟

مرحوم بادشاہ کے عہد حکومت کا آغاز ہوا تھا۔ تو جزیرہ نمائے عرب خانہ بدوش قبائل کے ایک ایسے وفاق کا نقشہ پیش کر رہا تھا، جیسا بربری دور کے آخر میں ہوگا۔ اس وفاق میں متحارب دیہات اور آزاد شہری ریاستیں بھی شامل تھیں۔ لیکن ایک نسل کے اندر اندر اتنا زبردست انقلاب آیا کہ اس وفاق نے ایک متحدہ وفاق کی شکل اختیار کر لی۔ جسے سرسری طور پر انگلستان کے ولیم فاتح کی سلطنت کے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ آیا تیس سال میں سیاسی ترقی دستوری بادشاہی

کی سمت میں ہو گی، یا رب کچھ درہم برہم ہو کر قدیم زمانے کی قبائلی حکومت عود کر آئے گی؟ مستقبل کی کلید شاہ سعود کے ہاتھ میں ہے ۔
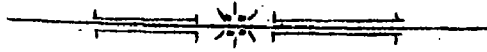
پانچواں باب :

الخرج کے زرعی فارم

الخرج بحیرہ قلزم کی جانب سے کم وبیش پانسو میل مشرق میں اور ساحل نفط[1] کی جانب سے کوئی پونے تین سو میل مغرب میں ہے۔ وہاں مٹھی بھر امریکی ماہرین زراعت نے، جو دولت سعودیہ کے اکھڑ اور ان پڑھ قبائیوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، صحرا کو گلزار بنا دیا ہے۔ یہاں کے زرعی فارم دولت سعودیہ کی جدید زرعی ترقیات کا پہلا سنگِ میل ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ایسے منصوبے کے ماتحت شروع ہوا ہے جس کے مکمل ہو جانے پر دولت سعودیہ کی زرعی پیداوار چار گنا ہو جائے گی۔

اس سلسلے میں حد درجہ ضروری امر یہ ہے کہ وسط عرب کے وسائل آب

---

[1] اس سے مراد خلیج فارس کا مغربی ساحل ہے جس کے ساتھ ساتھ تیل کے بے اندازہ ذخیرے موجود ہیں۔ تیل کو عربی میں "نفط" کہتے ہیں، اسلئے ساحل کا نام "ساحل نفط" ہے، آئیل کوسٹ OIL COAST یعنی تیل والا ساحل پڑ گیا۔

کا ایک سرسری نقشہ پیش نظر رکھ لیا جائے۔ یہاں پہاڑیوں کا ایک سلسلہ واقع ہے، جن میں سے بعض چار ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ اس سلسلے کو جبلِ طویق کہتے ہیں، جہاں سالانہ چار پانچ انچ بارش ہو جاتی ہے۔ طویق کے مشرقی دامن میں پانی زمین کے اندر جذب ہو کر پچاس فٹ سے آٹھ سو فٹ کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔ ہفوف دولت سعودیہ کا سب سے بڑا نخلستان ہے۔ یہاں پانی کوئی چالیس چشموں کی شکل میں سطح پر آگیا ہے۔ ان میں سے صرف ایک چشمہ بائیس ہزار گیلن پانی فی منٹ بہم پہنچاتا ہے۔ پھر یہ پانی خلیج فارس تک پہنچ گیا ہے اور متعدد چشموں کی شکل میں سمندر کے اندر جابجا پھوٹ نکلا ہے۔ بحرین کے موتی نکالنے والے غوطہ خوروں کا سالہا سال سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ ضرورت کے وقت غوطہ لگا کر سمندر کی تہ میں پہنچ جاتے ہیں اور میٹھے پانی کے چشموں سے پانی بھر لاتے ہیں۔

الخرج میں پانی نے سطح زمین کے اندر ہی اندر چونے کی چٹانوں کو تحلیل کر دیا اور جابجا ایسے گڑھے یا کھنڈ پیدا ہو گئے جنھیں پانی کے قدرتی کنویں قرار دینا چاہیے۔ ان میں سے دو کنویں یعنی ضلع سمح اور ایک اور چشمے کا قطر کم و بیش تین سو فٹ ہے، اور یہ چار سو بیس فٹ گہرے ہیں۔ دونوں میں پانی کی سطح کوئی تیس فٹ زمین کے نیچے ہے۔ جب پمپ جاری ہوں تو سطح نیچے چلی جاتی ہے اور زمین کے اندر دونوں کے درمیان تعلق ہے۔ زمانہ گزشتہ میں یہاں اونٹوں کے ذریعہ سے پانی نکالا جاتا تھا اور اس عہد کے نشان اب تک باقی ہیں۔ آس پاس آبادیوں کے نشان بھی ہیں، جو مدت ہوئی مٹ چکی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ مرحوم شاہ ابن سعود کے ظہور سے بیشتر عربوں کی قبائلی خانہ جنگی کے دور میں ان قدرتی کنووں سے استفادے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ۱۹۳۵ء میں شیخ عبداللہ سلیمان نے سب سے بڑے کنویں پر پمپ لگانے کا انتظام کر دیا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی نہر کے راستے پاس کی زرخیز زمین تک پہنچا دیا گیا تھا۔ عراق کا ایک انجنیئر اس سارے انتظام کا ذمہ دار تھا۔ چونکہ مشینری زیادہ اچھی نہ تھی، اس لئے نتائج محدود رہے۔

جب وسطِ عرب میں زیادہ غذائی اجناس کی ضرورت پڑی تو ۱۹۴۲ء میں مرحوم بادشاہ نے جمہوریہ امریکہ کے صدر روزویلٹ سے امداد کے لیئے اپیل کی۔ اس نے فوری ضروریات کے سرمایئے سے ایک رقم کا انتظام کر دیا۔ اور کارل ٹوچیل کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا، جس میں محکمہ زراعت اور محکمہ داخلہ کے آدمی بھی شریک تھے۔ اس وفد نے وسطِ عرب میں گیارہ ہزار میل کا سفر کر کے ایک رپورٹ تیار کی، جسے بعد کے زیادہ تر فلاحی منصوبوں کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیئے۔ پھر ایک زرعی فارم کے لیئے "ارامکو" نے بہتر پمپوں کا انتظام کر دیا جو الخرج میں ایک چشمے کے کنارے پر لگائے گئے۔ وہاں سے پندرہ کلومیٹر تقریباً دس میل) کے فاصلے پر آٹھ ہزار ایکڑ کا ایک ہموار قطعہ زمین موجود تھا اس تک سیمنٹ کی نہر بنا دی گئی۔ اس زرعی فارم کی ترقی کی رفتار بڑی سست تھی اور پیداوار اتنی محدود تھی کہ وسطِ عرب کے لیئے گندم، چاول، سبزیاں اور چارہ زیادہ تر باہر سے منگوانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں باہر سے غذائی سامان خریدنے میں مشکلات پیش آئیں تو خطرہ پیدا ہو گیا۔ کہ کہیں

جزیرۃ العرب کا سکون نہ بل جائے۔ چنانچہ حکومت امریکہ اور حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ عرب کی غذائی پیداوار بڑھانی چاہیئے۔ دسمبر ۱۹۴۲ء میں امریکہ نے دوسرا زرعی وفد بھیجا جس کی مالی اور عملی نگرانی غیر ملکی اقتصادی نظام[1] کے تابع تھی۔ ریاست ایری زونا[2] کے مسٹر ڈیوس اے راجرس[3] اس وفد کے رئیس تھے۔ وفد کا مدعا یہ تھا کہ دولت سعودیہ کو غذائی اعتبار سے خود کفیل بنا دے اور عربوں کو زراعت وآبیاری کے نہایت عمدہ طریقے سکھا دے۔

ان لوگوں کو بڑی خوفناک مادی مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑا جس تہذیب سے یہ مانوس تھے وہ پلنے تین سو میل کے فاصلے پر ظہران میں موجود تھی۔ درمیانی فاصلہ ریت کے ٹیلوں سے معمور تھا جن میں سے بعض ایک ایک سو فٹ بلند تھے اور ان میں سے گزرنے کی دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو اونٹوں کی پشت پر سوار ہوتے یا ایسی موٹروں سے کام لیتے جن میں ریت پر چلنے کے ٹائر لگے ہوتے۔ ٹرک موٹریں یا زرعی مشینری امریکہ سے منگوانا سہل نہ تھا۔ اس لیئے کہ جنگ شد و مد سے جاری تھی۔ اس سے بھی بڑی مصیبت یہ تھی کہ جو سامان خلیج فارس کے ساحل پر پہنچ جاتا اسے الخرج کیونکر پہنچایا جاتا اور پورا ایندھن (پیٹرول) ظہران ہی سے لایا جا سکتا تھا۔ بعض اوقات ٹریکٹروں کو نیز ان ڈیزل انجنوں کو بند کرنا پڑتا، جن کی بنا پر پمپ چلتے تھے۔ مکانوں کا بھی مناسب انتظام کوئی نہ تھا۔ ارکان وفد نے گرمی کے چھ مہینے دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں بسر کیئے۔ جہاں تیل کی کمپنی کے بھیجے ہوئے

(i) Foreign Economic Administration (ii) Arizona.
(iii) David A. Rogers

انجینئر رہتے تھے ۔ پھر ریت کے تودے ہر لحظہ متحرک رہتے اور آبادی کی روش یا تو مخالفانہ تھی یا کم از کم بے پروایانہ ضرور تھی ۔ درجہ حرارت سایے میں ۱۲۵ تھا ۔ ریڈیو کے سوا بیرونی دنیا سے اور کوئی تعلق نہ تھا ۔ ان تمام مشکلات کے باوجود راجرس نے حوصلے اور حسن تدبیر سے کام لے کر منصوبے پر عمل پیرائی کا سلسلہ جاری رکھا ۔ ۱۹۲۵ء میں کام شروع ہوا ۔ نیرہ سو مزدور یاد شاہ نے مہیا کر دیئے ساتھ دبلے سے بیل تھے جنھیں دُمیں مروڑ مروڑ کر چلایا جاتا ۔ اور چند ٹریکٹر تھے ۔ آبپاری کی نہریں وسیع کر دی گئیں اور کنوؤں کا پانی پیاسی زمین میں پہنچنے لگا ۔

فصل بوئی جا چکی تھی کہ جبل طویق کے دامن میں زبردست بارش ہوئی ۔ ایک وادی پانی سے بھر گئی ۔ یکایک سیلاب آگیا اور وہ اس جوش و خروش سے آیا کہ نصف میل کی چوڑائی میں ہر چیز بہا لے گیا ۔ بڑی نہر کا ایک اہم حصہ بھی برباد ہو گیا اور اس سے چھوٹی چھوٹی نہروں کا جو وسیع سلسلہ جاری کیا گیا تھا ۔ وہ بھی باقی نہ رہا ۔

راجرس نے پھر آدمی فراہم کیے اور ایک مہینے کی محنت سے سب کچھ از سر نو تیار کر لیا ۔ دوبارہ فصلیں بوئی گئیں ۔ اور صحرائی علاقہ گندم، لوسرن اور سبزیوں کی روئیدگی سے سبزہ زار بن گیا ۔ عین اس موقعے پر ٹڈی دل نمودار ہوا اور پانچ میل کی چوڑائی میں زمین پر ٹڈیوں کا ایسا فرش بچھ گیا کہ آدمی قدم رکھتا تو کم و بیش ایک درجن ٹڈیاں کچلی جائیں ۔ پینتالیس روز تک اس دل کے خلاف سلسلۂ جنگ جاری رہا ۔ کھائیاں کھودی گئیں، مٹی کے بند بنائے

گئے۔ جلتے ہوئے تیل کی ایک حدِ فاصل قائم کر دی گئی۔ عرب مزے لے لے کر ٹڈیاں کھاتے ہیں۔ وہ جد و جہد کرتے کرتے تھک گئے اور بولے مشیتِ الٰہی کے خلاف لڑنا حماقت ہے۔ اور قدرت کی طرف سے غذا کا جو سامان ہو گیا ہے اسے تباہ نہ کرنا چاہیئے۔ امریکیوں نے جد و جہد کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ دن میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے محنت و مشقت کرتے رہے۔ آخر میں فصلوں کا صرف ایک حصہ بچایا جا سکا۔ یہ لوگ بال بچوں کو چھوڑ کر نصف کرۂ ارض طے کر کے وہاں پہنچے تھے۔ انھیں کوئی مشکل ہراساں نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ بیج کا نیا ذخیرہ منگوا کر از سرِ نو کاشت شروع کر دی گئی۔ یہ آسمانی آفت ایک لحاظ سے سرچشمۂ برکت ثابت ہوئی، اس لیئے کہ معلوم ہو گیا اگر مناسب پانی اور مناسب توجہ مل جائے تو بہت سی مقامی فصلیں امریکی فصلوں سے زیادہ پیداوار دیتی ہیں۔

ابتدا میں خود عرب بھی امریکیوں کو دیکھ کر سر کر جبیں ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دنیائے اسلام کے قلب میں یہ کافر کیوں آ گئے۔ راجرس کو مزدور مہیا کرنے کے لیئے بہت کوشش کرنی پڑتی تھی۔ بھرتی کے بعد مزدوروں کو سکھایا جاتا کہ کام کیوں کر کرنا ہو گا۔ انھیں لمبے دستے والے بیلچے دے دیئے جاتے، جو کبھی انھوں نے دیکھے نہ تھے۔ بعض نے ان کے دستے کاٹ کر اپنے دستوں جیسے بنا لیئے۔ ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اونٹوں کی مینگنیوں کو کبھی کھاد کے طور پر استعمال نہ کیا تھا۔ جب راجرس نے بادشاہ کے اصطبل سے بھترا ٹوٹ لیئے تاکہ ارد گرد بکھرا دے۔ شاہ کی مینگنیاں فراہم کرائیں تو فتریانوں نے اس میسج کے مجنونانہ اوہام کا عجیب انداز میں مذاق اڑایا۔ اگر بادشاہ کی طرف سے امریکیوں

کی اطاعت کا حکم جاری نہ ہو چکا ہوتا تو سب کسان بغاوت کر دیتے۔ مہینوں بعد یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ جس زمین میں مینگنیوں کی کھاد استعمال ہوئی تھی، اس کی پیداوار دوسری زمینوں کے مقابلے میں تین چار گنا زیادہ رہی۔ اس وقت عربوں نے اعتراف کیا کہ اونٹ کی مینگنیاں جلانے کے علاوہ اور کام بھی دے سکتی ہیں۔

صدیوں تک عرب کھیتی باڑی میں اس نظریے پر عمل پیرا رہے کہ اگر تھوڑا پانی فصل کے لیے مفید ہے۔ تو پانی کی بہت بڑی مقدار بدرجہا زیادہ مفید ہوگی چاہیئے۔ چنانچہ مقامی کاشتکار اپنے کھیتوں کو عموماً پانی سے بھرا رکھتے۔ اس طرح پانی بھی بے کار جاتا اور فصلوں کو بھی نقصان پہنچتا۔ علاوہ بریں وہ سمجھتے تھے کہ فصل جتنی گھنی ہوگی اتنی ہی پیداوار بڑھے گی۔ چنانچہ وہ اس کے لیئے تیار نہ تھے کہ فصل کے پودے یا پھلوں کے درخت ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر ہونے چاہیئں۔ چنانچہ بار بار کے تجربوں سے انہیں بتایا گیا کہ پانی کا محدود استعمال ہی مناسب ہے اور درختوں یا پودوں کے درمیان خاص فاصلہ ہونا چاہیئے۔

۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوگئی اور بادشاہ نے الخرج کے زرعی منصوبوں کا خرچ برکھتے ہوئے اپنے ذمے لے لیا کہ میری قوم کو غذائی اجناس کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ کھیتی باڑی میں رہنمائی کے محتاج ہیں۔ الخرج کے زرعی فارم یہ دونوں مقصد پورے کر رہے ہیں۔ لہذا ان میں جو کچھ خرچ ہوگا، وہ میں دونگا۔ اس وقت بادشاہ کو تیل کی رائلٹی بڑی کثیر مقدار میں ملنے لگی تھی۔

اس کے بعد امریکہ نے تیسرا زرعی وفد الخرج بھیجا جس کا صدر ریاست اوٹا[1] کے زرعی کالج کا پروفیسر فرنیکلن سٹیورٹ ہیرس[2] تھا۔ اس کے ساتھ دو اور ماہرین زراعت بھی تھے۔ الخرج کے دورے کے بعد انھوں نے جو رپورٹ پیش کی، اس کا مفاد یہ تھا کہ مشکلات کے باوجود ترقی کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے زرعی فارموں کی توسیع کا فرمان جاری کر دیا اور ہر خرچ کی ذمے داری خود قبول کر لی۔ "ارامکو" نے ضرورت کے مطابق آدمی مہیا کرنے کا ذمہ اٹھا لیا۔ ۱۹۴۶ء میں رابرس واپس جا چکا تھا اور ۱۹۴۷ء میں ولی عہد نے امریکہ کا دورہ کیا تو کئی دن رابرس کے ساتھ ایری زونا میں بسر کیے۔ اس وقت سے الخرج کے فارموں میں قریباً دو درجن امریکی ماہرین زراعت کا کام کر رہے ہیں۔ ابتدا میں نگرانی ٹکساس کے کینتھ جے ایڈورڈز[3] کے ہاتھ میں تھی۔ بعد میں اس کے مددگار فرینک بروک شیئر[4] کو نگران بنا دیا گیا۔ فرنک شیئر کی نگرانی میں فارم بحیثیت مجموعی تین ہزار ایکڑ تک پہنچ گئے اور امید ہے کہ دس ہزار ایکڑ سے بھی زیادہ رقبہ زیر کاشت آ جائے گا۔

جو شخص فارموں کو دیکھنا چاہے اسے تین جدا گانہ فارموں پر ضرور جانا چاہیے۔ کنکریٹ کی بنی ہوئی آبپاری کی نالیوں کے ساتھ ساتھ صاف ستھری سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ نالیوں کے دونوں کناروں پر یوکلپٹس اور ببول کے

---

[1] Utah جمہوریہ امریکہ کی یہ ریاست نیواڈا کے مشرق اور ایری زونا کے شمال میں ہے

[2] (ii) Franklin Stewart Harris

[3] (iii) Keneth J. Edwards [4] (iv) Frank Brookshior

درخت لگا دیئے گئے ہیں۔ دونوں جانب ٹوسرن کے سبز کھیت صحرا میں ایسے نظر آتے تھے۔ جیسے شطرنج کے مربع خانے ہوں۔ حال ہی میں نو سو ایکڑ گندم، تین سو ایکڑ باجرا، تین سو ستائیس ایکڑ جو، دو سو اٹھتر ایکڑ ٹوسرن، چھیالیس ایکڑ سوڈانی گھاس، اٹھائیس ایکڑ مکئی، دو ایکڑ گنا وغیرہ جنس بوئی گئی تھی۔ نصف ایکڑ میں انگور کی کاشت ہوئی تھی۔ غرض الخرج سے ٹرکوں اور موٹر کاروں پر مختلف چیزیں روزانہ ریاض پہنچ رہی ہیں۔ مثلاً تربوز، ٹماٹر، گاجر، مولی، کھیرے، گرمک (ایک قسم کا خربوزہ) پیاز، کدو، گوبھی، پھول گوبھی، کرم کلا، بینگن، سلاد، مٹر، سبز مرچ، شلجم وغیرہ۔ عرب میں چند سال پیشتر ان سبزیوں کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ بلکہ ان کا میسر آنا ہی محال تھا۔

جن فصلوں کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ان کے علاوہ الخرج کے فارموں میں بعض نئی فصلیں بھی رائج کی گئی ہیں۔ مثلاً آئرلینڈ کے اعلیٰ قسم کے آلو اور اسٹابیری۔ عراق سے ناشپاتی، انار، انجیر، خوبانی، سنگترے اور شفتالو کی مختلف قسمیں منگائی گئی ہیں۔ ریت کے اندر بڑھنے پھولنے والی پھلیاں بھی کاشت کی گئیں جن سے تیل نکلتا ہے اور یہ تیل آدمی بھی کھاتے ہیں، صنعت و حرفت میں بھی کام دیتا ہے۔ چاول کی مختلف قسموں کے متعلق تجربات جاری ہیں۔ چونکہ دولت سعودیہ کثیر مقدار میں چاول درآمد کرتی ہے۔ اس جنس کی پیداوار ملک کے لئے مفید ہوگی۔

جو لوگ فارموں میں کام کاج کرتے ہیں ان کا معیار زندگی بہتر بنانے کے لیے بھی منتظموں نے پوری کوشش کی ہے۔ مثلاً کم تنخواہ والے ملازمین

چاہیں تو فارموں کے ذخیروں سے ایک چوتھائی رعایتی قیمت پر غذائی جنسیں خرید سکتے ہیں۔ نیز زیادہ تنخواہ پانے والے کارکنوں کے لیے سکونتی مکانوں کا بندوبست شروع ہو گیا ہے۔

نجد میں ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہاں درخت قریباً ناپید تھے درخت لگا کر ریت کو آگے بڑھنے سے روکا جا سکتا تھا یا لکڑی جلانے کے کام بھی آ سکتی تھی عمارتوں میں بھی استعمال ہو سکتی تھی۔ الخرج میں کوئی پینتیس ۳۵ ہزار درخت اسی غرض سے لگائے گئے کہ ریت کو روکا جا سکے۔ پچیس ہزار درخت املی اور ببول کے آٹھ آٹھ ایکڑ کے رقبوں میں لگ چکے ہیں جب یہ پرورش پا جائیں گے تو افریقہ سے بلیاں منگوانے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ الخرج میں دس ہزار درخت کھجور کے لگائے گئے۔ عرب خدا جانے کب سے کھجوروں کی پرورش کرتے چلے آئے ہیں۔ اب کیلیفورنیا سے اعلیٰ درجے کی پود منگائی گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں الخرج نے پہلے سے چار گنا کھجوریں پیدا کیں اور ان کی قسمیں بھی بڑی اچھی تھیں۔ پود کے ذخیرے بنا لیے گئے ہیں جن میں سے کھجور، انجیر، انار، شہتوت اور سنگترے، لیموں وغیرہ کی قلمیں مل سکتی ہیں۔ البتہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عرب کے اس حصے میں کھیتی باڑی کے لیے جو پانی استعمال ہوتا ہے اس میں نمک کی مقدار زیادہ ہے اور زمین کے جن قطعوں میں مدت تک آبیاری کا سلسلہ جاری رہا۔ اور پانی نکال دینے کا مناسب انتظام نہ تھا وہ بنجر ہو چکے ہیں۔ اب مختلف ذریعوں سے انھیں درست کیا جا رہا ہے۔

بڑی نہروں کی لمبائی بیس میل سے زیادہ ہو گی۔ ان کے علاوہ آبپاری کی نالیاں مجموعی طور پر پانسو میل سے کم لمبی نہ ہوں گی۔ پھر ایسے بند بھی بنا دیئے گئے ہیں کہ سیلاب آ جائے تو کھیتوں کی حفاظت کا کام دے سکیں۔ اگرچہ عرب میں مزدور بہت ارزاں مل جاتے ہیں لیکن تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ مشینوں کے ذریعے سے کام لینا زیادہ ارزاں رہتا ہے۔ مثلاً مغوف میں مشین کے ذریعے سے ہل چلایا گیا تو فی ایکڑ اٹھارہ ریال خرچ ہوئے۔ مزدوروں کے ذریعے سے یہی کام لیا گیا تو ایک ایکڑ پہ پینتیس ریال خرچ کرنے پڑے۔ علاوہ بریں مزدوروں کو ایک وقت کا کھانا بھی دیا گیا۔ چائے اور قہوہ بھی پلایا گیا۔

اب امریکی ماہرین بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے مکانوں میں ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔ بجلی کی روشنی لگ گئی ہے اور ضرورت کی تمام چیزیں مہیا ہو چکی ہیں۔ سب سے اچھا کمرہ وہ ہے جسے عربی کمرہ کہا جاتا ہے اس میں اعلیٰ درجے کے قالین بچھے ہوتے ہیں۔ گاؤ تکیے پڑے ہیں۔ نفیس پردے لگے ہوئے ہیں۔ اور بادشاہ نے اپنے محل سے نہایت عمدہ صوفے بھیج دیئے ہیں۔ جو ممتاز اصحاب فارم دیکھنے کے لیے آتے ہیں انھیں یہاں ٹھہرایا جاتا ہے۔ ان فارموں کو دیکھ کر شاہی خاندان کے افراد اور دوسرے بڑے بڑے مالکان اراضی نے اپنے ہاں کھیتی باڑی میں نئے طریقے جاری کر دیئے ہیں۔ وہ لوگ بیج یا قلمیں بھی یہاں سے لے جاتے ہیں۔ خود ملک سعود بھی عموماً الخرج آ جاتا ہے۔ اور تمام فارموں میں پھر کر زراعت کی ترقی کا معائنہ کرتا ہے۔ ایک مرتبہ وہ شیخ کویت کو بھی اپنے ساتھ لایا۔ تاکہ شیخ

الخرج کی سبزیوں اور پھلوں کی قسموں کا بخوبی مشاہدہ کر لے جب وہ واپس جانے لگا تو اس کے ہوائی جہاز میں بڑے بڑے تربوز اور دوسری چیزیں رکھ دی گئیں۔

شیخ عبداللہ سلیمان اور شاہی خاندان کے ممتاز افراد کی تائید کے باوجود چھ سال پیشتر تک ان فارموں پر سختی سے نکتہ چینی جاری تھی۔ نکتہ چینی کرنے والوں میں ایک طرف راسخ العقیدہ وہابی تھے، جو کہتے تھے کہ نجد کی مقدس سرزمین میں کافروں کو کیوں رکھا گیا ہے۔ دوسری طرف عام کسان معترض تھے۔ وہ کہتے تھے، کہ جو طریقے ہمارے آبا و اجداد کے لیے اچھے تھے وہی ہمارے لیے اچھے ہیں۔ اس مخالفت کو ختم کرنے کے لیے شیخ عبداللہ سلیمان نے مرحوم بادشاہ کو ۱۹۴۶ء کے موسم گرما میں آمادہ کیا کہ الخرج کا دورہ فرمائیں۔ چنانچہ وہ دو ہزار سے زیادہ آدمی ساتھ لائے جن میں ان کے رشتہ دار اور بڑے بڑے افسر شامل تھے۔ ان کی آمد سے پیشتر صدر مقام کے اردگرد چند میل تک ڈی ڈی ٹی چھڑک دی گئی۔ جہاں جہاں پانی ٹھہرا ہوا تھا اس پہ تیل ڈال دیا گیا۔ چنانچہ عربی حکمران کے دربار کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوا کہ آس پاس نہ کوئی مکھی ہے اور نہ مچھر۔ ولی عہد اس درجہ متاثر ہوا کہ اپنے محل میں بھی اسی پیمانے پر صفائی کرالی۔ بادشاہ کی آمد سے پہلے جہازوں کے اترنے کے لیے دو میدان تیار کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک شاہی محل کے قریب تھا اور دوسرا زرعی فارموں کے صدر دفتر کے پاس دو خاص زینے تیار کر لیے گئے۔ تاکہ بادشاہ کو ہوائی جہاز سے اترنے میں کوئی دقت پیش

نہ آئے۔ زینوں کو دیکھ کر بادشاہ اتنا خوش ہوا کہ فوراً زینے بنانے والے کو انعام سے نوازا۔

اتنے مہمان آجانے کی وجہ سے امریکی میزبانوں کو خاصی مشقتیں اٹھانا پڑیں۔ چنانچہ پانی لانے والے ٹرک رات دن نقل و حرکت میں رہتے تھے۔ تاکہ پیاسے عربوں کے لیئے زیادہ سے زیادہ مقدار میں پانی مہیا رہے۔ بعض اصحاب نے پہلی مرتبہ برف ملا پانی پیا۔

بادشاہ کے لیئے جو ریفریجریٹر ریاض سے بھیجا گیا تھا وہ بگڑ گیا تو رات کے وقت فارم کے مینجر کو جگا کر اس کی درستی کا انتظام کرایا گیا۔ مینجر نے ظہران سے مستری منگوانا چاہا اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے اپنا ریفریجریٹر بادشاہ کے حوالے کر دیا۔ اس موقعے پر فارم کے صدر دفتر میں تربوزوں کی دعوت ہوئی۔ بادشاہ، شہزادے اور وزیر عربی کمرے میں بیٹھے۔ جہاں قہوے کے ساتھ بڑے بڑے قابوں میں تربوز پیش کیئے گئے۔ باقی اصحاب کو دوسرے کمروں میں بٹھایا گیا۔ بادشاہ نے کہا، میری قوم کو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اگر میری مملکت میں ایسے فارم جگہ جگہ بن جائیں تو بدو خانہ بدوشی ترک کر دیں۔ اور سبز چراگاہوں میں مستقل طور پر مقیم ہو جائیں۔ بحیرہ قلزم سے خلیج فارس تک بے شمار فارم بن جانے چاہئیں۔

ایڈورڈز نے اپنے سولہ ماہرین زراعت کی مدد سے دولت سعودیہ کے مختلف حصوں میں چار اور فارم بنا دیئے ہیں۔ ایک قطیف میں دوسرا

ہفوف ہیں، تیسرا طائف ہیں اور چوتھا وادی فاطمہ ہیں۔

پیداوار بڑھ رہی ہے۔ فصلوں کی حالت بہتر ہو رہی ہے کھیتی باڑی کے نئے طریقوں کا علم ترقی پا رہا ہے اور عربوں میں اسے قبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ چند درجن امریکی دنیا کے ایک الگ تھلگ علاقے میں آئے تھے آہستہ آہستہ انھوں نے نمونے کے فارم قائم کئے۔ خلیج فارس سے بحیرۂ قلزم تک بسنے والے عربوں میں کھیتی باڑی اور کاشت کاری کا ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بدوؤں کی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔

چھٹا باب:

خیمہ نشین
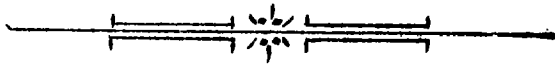
اگرچہ الخرج کے فارم ریاض کے جنوب میں ساحل خلیج فارس سے صرف پونے تین سو میل کے فاصلے پر ہیں، لیکن راستہ ایسا نہیں ہے جسے آسانی سے طے کیا جا سکے۔ یا ریت پر چلنے والے مخصوص ٹائروں، پانی کے خاص ذخیرے اور پٹرول کی زیادہ مقدار ساتھ لیے بغیر اس پر قدم رکھا جا سکے جب ٹرک فارم کی صاف ستھری عمارتوں اور کھیتوں کے مربع سبزہ زاروں سے باہر نکلتا ہے تو گرد و غبار کے بادلوں میں سے ہچکولے کھاتا ہوا مشرقی جانب کے ان بنجر میدانوں میں سے گزرتا ہے جن کے کنارے پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں کھڑی ہیں۔ درجہ حرارت موسم گرما کے عہد شباب سے پیشتر بھی سائے میں ایک سو بیس سے کم نہیں ہوتا۔ اور چلتے چلتے ہر آدھ گھنٹے کے بعد پانی بدل کر انجن کے ریڈی ایٹر کو ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں رکتے ہیں وہاں پانی بھی

پینا ضروری ہے اور پانی کے مشکیزے ٹرک کے ساتھ لٹکے رہتے ہیں۔ بعض ایسے میدان بھی آتے ہیں جہاں باریک سنگریزے بچھے ہوتے ہیں اور موٹر کی رفتار چالیس میل سے بھی زیادہ رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن عموماً رفتار اس سے نصف ہی رہتی ہے۔ وادی الخرج سے آگے بڑھیں تو سڑک تین ڈھلوانوں میں سے چکر کھاتی ہوئی ایک پتھریلے میدان میں پہنچکر بالکل سیدھی ہو جاتی ہے۔ مطلع صاف ہو تو سورج سرخ تھال کی شکل میں طلوع ہوتا ہے۔ اس وقت نظر آتا ہے کہ گرد و غبار کے چھوٹے چھوٹے بگولے ہموار میدان میں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں اور کبھی کبھی زور سے ٹرک کے ساتھ ٹکرا جاتے ہیں۔ عرب انھیں "جن" کہتے ہیں۔ دور سے معلوم ہوتا ہے کہ نیلے پانی کی جھیل کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ موٹر نزدیک آتی ہے تو یہ تصور ناپید ہو جاتا ہے۔

یکایک سرخ رنگ کی ایک چوٹی نمودار ہوتی ہے تاجو زیادہ اونچی نہیں۔ اس کے بعد دوسری، پھر تیسری اور تھوڑی دیر میں مشرقی افق پر چوٹیوں کی ایک غیر منقطع قطار سامنے آ جاتی ہے۔ ابتدا میں مسافر سمجھتا ہے کہ یہ محض سراب ہے۔ لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں یہ چوٹیاں مستقل ماحول کی صورت اختیار کرتی جاتی ہیں۔ یہ دہناء کے ٹیلے ہیں۔ یعنی تانبے کے رنگ کی ریت کا وہ مشرقی دریا جو شمالی عرب کے صحرائے نفود کو جنوب کے صحرائے ربع الخالی سے ملاتا ہے۔ دہناء چودہ سو میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی چوڑائی کم سے کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سو میل ہے۔ کہیں کہیں یہ دریائے ریگ چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ گیا ہے۔ لیکن عموماً یہ یکجا ہی کا ہے

اور اس کی بلندی چالیس فٹ سے ایک سو فٹ تک ہو گی۔ یہ ریگ زار شمالی عرب
کے ریتیلے پتھروں کی تحلیل سے پیدا ہوا تھا۔ ہواؤں کے زیر اثر یہ ریت دس فٹ
سے تیس فٹ تک جنوب کی جانب بڑھتی چلی جاتی ہے۔

جو راستہ الخرج سے نخلستان مغوف کی طرف آتا ہے، وہ دہنا کے ایک
حصے میں سے گزرتا ہے، جو سب سے زیادہ تنگ ہے، لیکن آبی دریاؤں کی طرح
دہنا کے دریائے ریگ کی کیفیت بھی یہی ہے کہ جب چوڑائی کم ہو جاتی ہے تو
گہرائی (دریائے ریگ کے تعلق میں اونچائی) بڑھ جاتی ہے۔ آدمی ہو یا جانور
یا موٹر اس میں سے گزرنا بڑا مشقت خیز ہے۔ جب تک "ارامکو" نے ریت پر
چلنے والے بڑے بڑے ٹائر نہیں بنوائے تھے، موٹروں پر ان ٹیلوں میں سے گزرنا
اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کئی درجن آدمی موٹروں کو دھکیلنے کے لئے
نہ لگائے جاتے۔ اگر صبح کی خنکی میں راستہ طے نہ کر لیا جائے تو حد درجہ گرم ٹائروں
میں ہوا کا دباؤ کم کر لینا چاہیئے۔ نیز میدان سے قدم بڑھاتے وقت موٹر کو ٹھنڈا
کر لینا مناسب ہے۔ کھلے ٹرک میں سوار ہو کر دہنا کے بلند ترین حصے میں
پہنچیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ساکن سمندر کی سطح پر لانچ میں بیٹھے
ہوئے بڑی بڑی سرخ لہروں میں سے گزر رہے ہیں۔ جب ایک ٹیلے کے
دامن میں پہنچ کر گرد و پیش نظر ڈالتے ہیں تو سطح زمین سے نیلے آسمان تک
سنگترے کے رنگ کی ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سمندر کی لہروں کی
طرح یہاں بھی ہر چالیسواں ٹیلہ ارد گرد کے ٹیلوں سے بلند تر نظر آتا ہے
یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کی چوٹی ریت کے

ہلکے سے بادلوں نے چھپا رکھی ہے ۔ دہنا ہر حالت میں ایک شاندار اور قابل دید منظر پیش کرتا ہے ، لیکن اس منظر کو انتہائی خوبصورت شکل میں دیکھنا ہو تو اسی میں خیمہ زن ہو جانا چاہیئے اور علی الصباح طلوع آفتاب کا نظارہ کرنا چاہیئے ۔ اس وقت ان ٹیلوں کی رنگینی واقعی حیرت انگیز بن جاتی ہے ۔ عربی صبح کی قلیل الاوقات شفق سرخی اور زردی کو پرے ہٹاتی چلی جاتی ہے اور آخر شب کے سائے تدریجاً پیچھے ہٹتے جاتے ہیں ۔

دہنا کو عموماً اسی راستے سے عبور کیا جاتا ہے ۔ جہاں سے عام لوگ گزرتے ہیں ، لیکن ہوائیں راستے کا نشان اس طرح مٹا دیتی ہیں کہ ہر مسافر محسوس کرتا ہے کہ صرف اسی کی سواری پہلی مرتبہ اس ساکن سمندر میں داخل ہو رہی ہے ۔ جب راستہ ناپید ہو جاتے تو ڈرائیور قطب نما کی مدد سے موٹر چلاتا ہے ۔ بعض مقامات پر نشان بھی بنے ہوئے ہیں ۔ یہ سفر اس درجہ مشکل ہے کہ صحرا میں سفر کے قابل ٹرک بھی ہر پندرہ منٹ کے بعد رکنے پڑتے ہیں تاکہ انہیں ٹھنڈا کر لیا جائے ۔

دہنا میں طلوع آفتاب جیسا ہی دوسرا خوشگوار نظارہ یہ ہے کہ قافلے کے اونٹوں کی قطار ان سرخ ٹیلوں میں چلتی ہوئی دیکھی جائے ۔ دُبلے پتلے عرب شتر سوار اپنے عقال کے کپڑے سے منہ ڈھانپ لیتے ہیں تاکہ ہوا اور ریت سے محفوظ رہیں ۔ وہ اونٹ ہی کا جزو معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صحرا کے جہاز پر مسافر سوار ہیں ۔ ابتدائی دور کے انسان اونٹ کے بغیر عرب کے صحراؤں میں سے گزر نہیں سکتے تھے ، بلکہ اونٹ کے بغیر وسط عرب کے لوگ

زندگی بھی بسر نہیں کر سکتے تھے اس لیئے کہ یہ جانور ان کے لیئے حمل و نقل ہی کا ذریعہ نہیں، بلکہ ان کی غذا بھی ہے۔ اور مشروب بھی، لباس بھی ہے اور دوا بھی۔ سب سے آخر میں یہ کہ آرائش حسن کا بھی یہی ایک ذریعہ ہے۔

عرب کے اونٹ ایک کوہان والے ہوتے ہیں۔ ان کی مختلف قسمیں ہیں، مثلاً سیاہی مائل اونٹ جو بد مزاج ہوتے ہیں۔ ان سے عموماً باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔ سرخ نما بھورے رنگ کی نسل جسے "عمانیہ" کہتے ہیں، اس لیئے کہ یہ نسل ابتدا میں عمان سے آئی تھی۔ یہ اونٹ بڑے تیز رفتار ہوتے ہیں، مگر ان میں دم زیادہ نہیں ہوتا۔ ہلکے بادامی رنگ کی نسل جسے "حرہ" کہتے ہیں۔ یہ نسل شمالی نجد کے اونٹ اور عمانیہ کے اختلاط سے پیدا ہوئی۔ اس نسل کے اونٹ عمانیہ جیسے تیز رفتار تو نہیں ہوتے، مگر ان میں قوت برداشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اونٹ بدو کی زندگی کا لاینفک جزو ہے۔ اور بدو کے نزدیک ہر شخص کی دولت کا شمار اونٹوں کی تعداد ہی سے کیا جاتا ہے۔ یہ جانور دونوں جانب دو دو سو پونڈ کا وزن اٹھا کر ایسے مقامات پر بے تکلف چلا جاتا ہے جہاں دوسرا جانور قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ رفتار قریباً دو میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ اور چلتے چلتے راستے کے آس پاس کی جھاڑیوں سے ایک دو نوالے بھی کھا لیتا ہے، لہٰذا اسے کھانے کے لیئے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگرچہ اونٹ روزانہ پانی پینا پسند کرتا ہے، لیکن اگر تین روز بھی اسے پانی نہ ملے تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اشد ضرورت پیش آ جائے تو یہ پانچ ان

پانی کے بغیر گزارلیتا ہے۔

باربرداری کے علاوہ اونٹ کا دودھ بدو کی خاص خوراک ہے۔ اگرچہ اس دودھ میں چکنائی نہیں ہوتی کہ مکھن نکالا جا سکے، تاہم اسے بلو کر ایسا پنیر بنایا جا سکتا ہے جسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ضرورت کے وقت اونٹ سے قے کرائی جاتی ہے اور جو لعاب اس کے معدے سے نکلتا ہے، اس سے راہ گم کردہ بدوؤں کی جانیں محفوظ رہتی ہیں۔ اونٹ کا گوشت بڑے مزے سے کھایا جاتا ہے۔ جوان اونٹ کا کوہان اس وجہ خوش ذائقہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر اہم دعوت کے موقعے پر یہ مہمانوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ عربوں کے نزدیک رسمی مواقع پر بہترین کھانا یہ ہے کہ سالم اونٹ کو بھونا جائے۔ اس کے پیٹ میں ایک بھنا ہوا دنبا ہو، دنبے کے پیٹ میں مرغی اور اس کے پیٹ میں ابلے ہوئے انڈے ہوں، نیز ان سب کے پیٹ میں چاول ہوں۔

اونٹ کی مینگنیاں عربوں کے لیے عام ایندھن کا کام دیتی ہیں۔ بہت سے مقامات پر بدو اونٹ کے چمڑے کی تھیلیوں میں مینگنیاں بھر کر فروخت کر دیتے ہیں۔ وہ اونٹ کے بالوں سے کپڑا بنتے ہیں۔ بعض اوقات خیمے اونٹ ہی کے بالوں کے ہوتے ہیں۔ سیاہ رنگ کی بکریوں کے بال بھی عموماً اسی غرض سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اونٹ کے چمڑے سے جوتے، پیٹیاں اور مشکیزے بنتے ہیں۔ گدھوں کے علاوہ اونٹ عرب میں ہل چلانے اور کنوؤں سے پانی نکالنے کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً نجد، تہامہ، یمن میں اب بھی اسی طریقے پر کھیتی باڑی ہوتی ہے۔

تاریخ عرب میں ایسی بہت سی کہانیاں مذکور ہیں کہ اونٹوں نے اپنی تیز رفتاری یا قوت برداشت یا پانی کے لیئے احساس کی بدولت آقاؤں کی جانیں بچالیں۔ اونٹوں پر بہت سی لڑائیاں بھی ہوئیں اور بے شمار واقعات قتل بھی پیش آئے بہت سے قبیلوں کی زندگیاں انہیں پالنے اور فروخت کرنے ہی پر موقوف ہیں۔ جابجا مشہور منڈیاں بنی ہوئی ہیں، جہاں اونٹ فروخت ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی منڈی شمالی نجد کے شہر بریدہ میں ہے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیان یہاں ہر سال پندرہ ہزار اونٹ فروخت ہوتے تھے۔ اب ریل، ٹرک اور ہوائی جہاز اونٹ کی جگہ لے رہے ہیں۔ اور تجارتی راستوں پر بھی قبضہ کرتے جا رہے ہیں۔ پچیس سال پیشتر شاہ ابن سعود اونٹ ہی پر سفر کرتے تھے۔ اب ان کے پاس موٹروں اور ہوائی جہازوں کے بیڑے موجود ہیں۔ تاہم اب بھی ریاض، نخلستان ہفوف اور خلیج فارس کے درمیان چار ہزار اونٹ تجارتی مال لانے لے جانے میں مصروف ہیں۔ لیکن ریگ زار میں چلنے والے ٹرک اور ریلوں پر چلنے والی گاڑیاں زیادہ عام ہو رہی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کے مقابلے میں گھوڑا جزیرۃ العرب میں بہت بعد پہنچا۔ غالباً یہ مصر سے آیا تھا۔ وسط عرب کی صحت بخش آب و ہوا میں پہنچنے کے بعد اس کی نسل خوب بڑھی۔ کیونکہ یہ علاقہ بیرونی دنیا سے منقطع تھا اس لیے گھوڑوں کی نسل میں باہر سے کوئی آمیزش نہ ہو سکی۔ اس طرح عربی گھوڑے کی تیزی و طراری، خوش اطواری اور قوت برداشت نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ بخدی گھوڑے سب سے بہتر ہوتے ہیں۔ اس لیئے کہ جو پانی وہ پیتے ہیں ان میں چونے کے اجزا

زیادہ ہیں، جن سے ہڈیاں خوب مضبوط ہو جاتی ہیں۔ نیز وہاں کی زمین میں سرمہ ہے جس سے گھوڑے کا رنگ سیاہی مائل نیلا ہو جاتا ہے۔ گھڑ دوڑ اب بھی جزیرۃ العرب میں ایک ہردلعزیز تفریح ہے۔ گزشتہ صدی میں حائل کے رشیدی خاندان کا اصطبل سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اب ابن سعود کے پاس بہترین گھوڑے موجود ہیں ؂

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عرب آٹھویں صدی مسیحی میں شمالی افریقہ کو مسخر کرتے ہوئے ہسپانیہ پہنچے اور گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں سے عربی گھوڑوں کی نسل پورے یورپ میں پھیلی۔ جب ولیم فاتح سنہ ۱۰۶۶ء میں انگلستان پر حملہ آور ہوا تو جو گھوڑے اپنے ساتھ لے گیا، وہ اسی ہسپانوی نسل کے تھے۔ صلیبی جنگوں میں ایک حکمران نے ہنری اول شاہ انگلستان کو دو عربی گھوڑے بطور تحفہ دیئے تھے۔ ملکہ الزبتھ کے عہد میں بہت سے عربی گھوڑے نسل کشی کے لیئے انگلستان لائے گئے۔ پھر جیمز اول کے زمانے میں عربی گھوڑے دوڑ کی غرض سے منگوائے گئے۔ اصطلاحاً کسی گھوڑے کو اس وقت تک اصیل قرار نہیں دیا جا سکتا، جب تک اس کا سلسلہ ان تین گھوڑوں تک نہ پہنچا دیا جائے۔ جو سترھویں صدی کے اوائل میں طویل بحری سفر طے کر کے انگلستان پہنچے تھے۔ اول برلی ٹرک[1]، دوسرا ڈارلی اریبین[2] تیسرا گوڈولفین اریبین[3] سنہ ۱۷۷۱ء میں انگلستان کے شائقین پر واضح ہو گیا۔ کہ اصیل گھوڑے خالص عربی نسل

(i) Byerly Turk (ii) Darly Arabian
(iii) Godophin Arabian.

کے گھوڑوں سے زیادہ تیز رفتار ہوتے ہیں۔ اگرچہ دوسری خصوصیتوں کے اعتبار سے خالص عربی گھوڑے عرب میں زیادہ پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ مدت پیشتر کی بات ہے۔ کہ عرب اپنے ہاں سے سانڈوں کے سوائے کوئی گھوڑا باہر نہ جانے دیتے تھے۔ گھوڑیاں نسل کشی کے لیئے محفوظ رکھی جاتی تھیں۔

صحرائی علاقے میں سفر کرنے کے لیئے گھوڑا اتنا مفید نہیں جتنا کہ گدھا اور اونٹ مفید ہوتا ہے۔ نیز گدھے اور اونٹ کے مقابلے میں گھوڑے کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس کے لیئے خاص خوراک کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ پانی کے بغیر وہ لمبے سفر نہیں کر سکتا۔ رفتار ریت کے ٹیلوں یا پہاڑی علاقوں میں خود بخود بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔ لہذا گھوڑے زیادہ تر بادشاہ یا اس کے بیٹوں یا بڑے بڑے مالکانِ اراضی کے اصطبلوں ہی تک محفوظ رہ گئے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں دولت سعودیہ کے بعض حصوں کے اندر اونٹ تین سو ریال میں مل جاتا تھا۔ گدھے کی قیمت ایک ہزار ریال تھی۔ اور گھوڑا تین ہزار ریال بلکہ اس سے بھی زیادہ قیمت پاتا تھا۔ جنگ میں بھی گھوڑے کی حیثیت ثانوی رہ گئی ہے۔ جب مرحوم ابن سعود نے عرب قبیلوں کے چھاپے روک دیئے تو رولز نیز دوسرے جنگجو قبیلے گھوڑوں کی جگہ موٹریں استعمال کرتے تھے۔ امیر فیصل (بن شاہ ابن سعود) نے ۱۹۳۱ء میں یمن کی ایک فوج کو شکست فاش دی تھی۔ تو ملکی کتب بند گاڑیاں استعمال کی گئی تھیں۔ شاہ سعود کی فوج میں بھی تعلیمی حیثیت اسی گروہ کو حاصل ہے، جس کے پاس موٹریں ہیں۔

عرب میں افریقی اصطلاح کے مطابق آج بڑا شکار بہت کم ہے۔ نہر

سویز کی کھدائی سے پیشتر حجاز کے پہاڑوں میں وقتاً فوقتاً شیر مل جاتے تھے اور شیر کے شکار کی تصویریں بھی "معبد ذوہب" کے قریب چٹانوں پر ملتی ہیں چیتے اور تیندوے بعض دور افتادہ پہاڑی علاقوں میں ملتے ہیں۔ سب سے زیادہ پرلطف شکار شتر مرغ کا ہوتا ہے، جو تھوڑے فاصلے تک گھوڑے سے بھی زیادہ تیز دوڑتا ہے۔

زہریلے سانپ نسبتاً بہت کم ہے۔ حشرات الارض میں سب سے بڑا وہ ہے جسے سوسمار کہتے ہیں۔ لگڑ بگڑ، بھیڑیئے، لومڑیاں اور خرگوش مختلف علاقوں میں یا چھوٹے چھوٹے گروہوں میں ملتے ہیں۔ برف جیسے سفید حلقے والے غزال نیز ہرنوں کی دوسری قسمیں صحراؤں میں پھرتی رہتی ہیں۔ جدہ کے غیر ملکی سفارت خانوں کے لوگ شکار کے لیے نکلتے ہیں تو جیپوں میں بیٹھ کر غزال ہی کا شکار کھیلتے ہیں۔

بہت سے عرب شیخ شکار کے لیے بازوں سے کام لیتے ہیں۔ بازوں کو شکار کے لئے تیار کرنا بڑا وقت لیتا ہے اور اس کے لیئے ایک سے زیادہ آدمیوں کو پورا وقت دینا پڑتا ہے۔ باز کا شکار عموماً نومبر سے مارچ تک کیا جاتا ہے۔ بازوں کی دو قسمیں ہیں۔ اول شکرے جن کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ دوسرے باز جن کے متعلق خیال ہے کہ وہ لڑنے میں شکروں سے زیادہ تیز اور حملے میں زیادہ بہادر ہوتے ہیں۔ باز کی تربیت کے سلسلے میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس کی آنکھیں بند کر دیتے ہیں اس غرض سے پلکوں میں ایک دھاگہ پھیر دیا جاتا ہے۔ بعد میں دھاگے کی جگہ غلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ باز کو سدھانے میں دو یا تین ہفتے لگ جاتے ہیں۔ اس

زمانے میں تربیت دینے والا شخص باز کو ہر وقت ساتھ لیئے رہتا ہے۔ خود چارہ دیتا ہے۔ سونے کے وقت بھی اپنے قریب رکھتا ہے۔ جب باز مالک پر بھروسا کرنے لگ جاتا ہے۔ اور پکار کا جواب دیتا ہے۔ تو پھر اس کے سامنے کسی پرندے کے پروں کو باندھ کر طعمے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں باز کی ٹانگ رشتے کے ساتھ بندھی رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عام سدھے ہوئے باز کی قیمت پچاس ساٹھ ریال سے کم نہیں ہوتی، مگر مشہور باز اس سے تین گنا بلکہ اور زیادہ قیمت پاتے ہیں۔

دہنا کے ریگ زار سے ذرا آگے اور مشرقی سمت کی وادیوں میں بدوؤں کے خیمے دیکھ کر یہ حقیقت تازہ ہو جاتی ہے۔ کہ اگرچہ اب تک صحیح مردم شماری نہیں ہوئی، تاہم یہ اندازہ درست ہے کہ عرب کی قریباً ایک تہائی آبادی خانہ بدوش ہے۔ یہ لوگ ان قبیلوں کی اولاد ہیں جو بہت پہلے زرخیز اور سیراب خطوں سے جبراً نکال دیئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض یمن میں رہتے تھے۔ شاید پانچویں صدی عیسوی میں بند مارب کے ٹوٹنے پر باہر نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے خشک اور بنجر ماحول سے مطابقت پیدا کر لی۔ وہ چند مہینے اپنے ریوڑ اس گھاس میں چراتے ہیں جو وادیوں کے کناروں پر اگ آتی ہے۔ پھر جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں میں جیسے جیسے بارش ہوتی جاتی ہے، ادھر منتقل ہوتے جاتے ہیں۔

دولت سعودیہ کے بدو ہی وہ اصل سرچشمہ ہیں جہاں سے وقتاً فوقتاً دوسری آبادیاں زندگی کی نئی روح حاصل کرتی رہیں۔ ان کے چار بڑے گروہ ہیں

سب سے بلند حیثیت بادیہ کی ہے۔ یہ لوگ سیاہ خیموں میں رہتے ہیں۔ سال بھر میں نو مہینے قلب صحرا کے اندر گزارتے ہیں۔ اونٹ پالتے ہیں۔ اپنے دائرے سے باہر شادی نہیں کرتے اور ساری دنیا کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ان میں سے جن لوگوں کو اعلا کا درجہ حاصل ہے، وہ اپنا سلسلہ نسب حضرت اسماعیل اور قحطان تک پہنچاتے ہیں اور ان کے نسب میں کہیں آمیزش نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ قحطان کے بیٹے یعرب ہی کی وجہ سے ملک اور ان کے باشندوں کا نام عرب پڑا۔ جن قبیلوں کو نسب کے اعتبار سے بلند سمجھا جاتا ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:۔ عنیزہ، شمر، حرب، مطیر، عجمان، ظافر، مرہ، قحطان، دواسر، مناصیر، تواسم، مویطط، بادیہ بھی انہی قبیلوں میں شامل ہیں۔ عوازم، رشائدہ اور رحلیمہ نسب خالص نہیں سمجھا جاتا، لہذا وہ اشراف میں داخل نہیں۔ صلوبہ بدوؤں میں سب سے زیادہ کم حیثیت والے شمار ہوتے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ان مسیحیوں کی اولاد ہیں جو صلیبی جنگوں میں شام پہنچے تھے۔

ان سے بود وباش میں ذرا پست لیکن نسل و خون میں ملتے جلتے وہ لوگ ہیں جنہیں "عرب دار" کہا جاتا ہے یعنی نیم خانہ بدوش لوگ۔ وہ اپنی اصل حیثیت اس وجہ سے زائل کر چکے ہیں کہ سال کا کچھ حصہ صحرا میں گزارتے ہیں اور کچھ حصہ آس پاس کے قصبوں مثلاً کویت میں۔ بعض "عرب دار" اشراف کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اپنے بدو بھائیوں میں شادیاں بھی کر لیتے ہیں۔ مگر عام طور پر انہیں پست ہی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ کسی بدو کو شہر میں آنا پڑے تو "عرب دار" کے ہاں ٹھہرنے میں اسے تکلف نہیں ہوتا۔ تیسرا گروہ

ان صحرائیوں کا ہے جنہیں سکرہ یا گلہ بان کہتے ہیں۔ وہ شہر میں بسنے والے عربوں نیز اہم قبیلوں کی بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ چونکہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ صحرا میں دور نہیں لے جا سکتے اس لیئے آبادیوں کے قریب ہی رہتے ہیں اور بدوؤں کی طرح پورے صحرا کو اپنا سرمائی وطن نہیں سمجھتے۔ سب سے نیچے وہ بدو ہیں جنہیں "حدیار" کہتے ہیں۔ یہ لوگ خیموں میں نہیں، گارے یا پتھر کے مستقل مکانوں میں رہتے ہیں۔ اس لیئے حقیقی بدو انھیں حقیر سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ شہروں سے ضروری چیزیں لے کر فروخت کے لیے صحرائی علاقے میں نکل جاتے ہیں تو کوئی بھی ان سے خریدنے میں تامل نہیں کرتا۔

بدوؤں کی سرداری شیخ کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ ہر شخص کو ایک خاص قبیلے کا فرد ہونا چاہیئے۔ اگرچہ شیخ قبیلہ کا بڑا بیٹا ہونا ضروری نہیں۔ شیخ کے بیٹے یا بھتیجے میں سے جو شخص جواں مردی اور قیادت کی خصوصیات کا جامع ہو اسے شیخ چن لیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں نصیبے یا "خنظ" کے بغیر دوسری خصوصیات قبیلے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ البتہ سردار کا سخی اور فیاض ہونا ضروری ہے۔

ہر قبیلے کے اپنے کنوئیں ہیں۔ جن کے اردگرد یہ لوگ موسم گرما یعنی جون سے اکتوبر تک خیمہ زن رہتے ہیں۔ جب بارشیں شروع ہو جاتی ہیں تو یہ اپنے صحرائی دائرے میں گھومنا شروع کر دیتے ہیں۔ بدوی قبیلوں کا دائرہ عموماً سوا سو میل شرقاً غرباً اور دو سو میل شمالاً جنوباً ہوتا ہے۔ خشک سالی کے وقت مختلف قبیلے اپنے حلیف قبیلے کے دائروں میں بھی چلے

جاتے ہیں۔ اس طرح مختلف قبیلوں کے درمیان ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً عجمان، مرہ، اور سخیدان، یا ظافر، شمر اور عوازم کے وفاق۔ اگر کسی قبیلے نے ایک یا زیادہ وفاق قائم کر رکھے ہیں تو اس سے صحرائی زندگی کے مجلسی نظام میں زیادہ استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔ جانور چرانے کے علاوہ سالانہ منڈیوں میں بھی جاتے ہوئے مختلف لوگ اپنے حلیف قبیلوں کے دائرے میں سے گزر جاتے ہیں۔

عنیزہ گرمیاں شام، عراق اور سردیاں شمالی عرب کے صحرائے نفوذ کے آس پاس گزارتے ہیں۔ یہ نہایت اہم قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ہے۔ ان کا گروہ چھوٹا ہو تو اپنے سیاہ خیمے ایک دائرے میں لگا لیتے ہیں۔ اگر تعداد زیادہ ہو تو پھر خیمے قطاروں میں لگتے ہیں۔ اس قبیلے کے دولت مند خاندان بھی عموماً ایک ہی خیمہ استعمال کرتے ہیں۔ البتہ کسی شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ اکٹھی خوشگوار زندگی بسر نہ کر سکتی ہوں تو بڑے خیمے کے پاس ایک چھوٹا خیمہ نصب کر لیا جاتا ہے۔ لیکن تعدادِ ازدواج بدوؤں میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ البتہ طلاق کا رواج موجود ہے۔ عنیزہ ماضی قریب تک قبائلی جنگوں میں سرگرم تھے اور ان میں خون کے انتقاموں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بہت سے بدو قبیلوں کی طرح یہ لوگ بھی کسی پر رات کے وقت حملہ نہیں کرتے، چھاپوں میں عورتوں، بچوں یا آدمیوں کو قیدی بھی نہیں بناتے، صرف مال لے کر چلے جاتے ہیں۔

عنیزہ ہی کی ایک شاخ روَلہ بھی ہے جن کی زیادہ تعداد شام میں مقیم ہے

کچھ لوگ دولت سعودیہ اور عراق میں رہتے ہیں۔ چند سال پیشتر تک وہ عموماً لڑائیوں میں لگے رہتے تھے۔ اس طرح انھیں اپنی جوانمردی، استقامت اور ہنرمندی دکھانے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے کم وبیش ۵۰ افراد چالیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے یا مارے جاتے۔ بہت سے دوسرے بدوؤں کی طرح رولہ بھی سیاہ خیموں میں رہتے ہیں جو بکریوں کے بالوں یا پٹ سن کے اُون سے بنے جاتے ہیں۔ فرش پر پہلے دریاں اور ان کے اوپر روئی بھرے ہوئے گدے بچھا لیتے ہیں اور فرش کے کنارے تکیے رکھ دیتے ہیں۔

عرب کا ایک قبیلہ جس کے حالات بیرونی دنیا تک اکثر پہنچتے رہے، قبیلہ حرب ہے جو حجاز میں رہتا ہے۔ چونکہ اس کا وطن بحیرۂ قلزم سے قریب ہے، اس لیے قبیلے میں سے بعض نے حبشنوں سے شادیاں کر لیں اور عام بدوؤں کی طرح ان کا نسب خالص نہیں رہا۔ یہ لوگ پہلے دمشق، مدینہ منورہ، جدہ، اور مکہ معظمہ آنے جانے والے قافلوں پر چھاپے مارا کرتے تھے۔ حجاز ریلوے بن گئی تو اس پر چھاپے مارنے کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا۔ پہلی جنگ عظیم میں یہ لوگ ترکوں کی طرف دار ہو کر لڑے۔ لارنس نے حجاز ریلوے تباہ کر دی۔ تو حرب نے پھر عازمین حج و زیارت پر چھاپے مارنے شروع کیے۔ شاہ ابن سعود حجاز پر قابض ہوا تو ان لوگوں کو بارہا متنبہ کیا۔ جب کوئی اثر نہ دیکھا تو ابن سعود نے اخوان کو ان کی گوشمالی کا حکم دے دیا۔ اخوان نے ایسی سخت سزا دی کہ اب ان کی بہت تھوڑی تعداد باقی رہ گئی ہے۔ بعض گروہوں میں سے صرف ایک آدمی زندہ بچا جس نے شکست کی خبر دوسرے گروہوں کو پہنچائی

حرب سے بھی بڑھ کر زیادہ اہم قبیلہ شمر ہے۔ یہ رشیدی خاندان انیسویں صدی کے آخری حصے میں وسط عرب پر قابض رہا۔ اس کا تعلق شمر ہی سے تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر حائل کے ارد گرد رہتے ہیں، لیکن شمالی جانب ان کا سلسلہ بہت دور شام اور عراق تک چلا جاتا ہے۔ شمر کا آخری بڑا سردار عبدالعزیز ابن متعب تھا، جو سنہ ۱۹۰۶ء تک حکمران رہا۔ وہ بڑا بہادر آدمی تھا۔ دوست اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دشمن اس سے ڈرتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں ایک رات وہ ابن سعود سے جنگ کی تیاری کے سلسلے میں فوجوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اتفاق سے راستہ بھول گیا۔ اور ابن سعود کے خیمے کو اپنا خیمہ سمجھ کر چلا جا رہا تھا کہ مارا گیا۔ شمر پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی طرف دار ہو کر لڑے، لیکن ان کی قیادت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء کو انھوں نے ابن سعود کی اطاعت قبول کر لی۔

دولت سعودیہ کے شمالی و مشرقی گوشے میں کویت سے قریب قبیلہ مطیر آباد ہے۔ یہ لوگ بڑے غیور اور جنگجو ہیں۔ اور مرحوم شاہ ابن سعود کے لیے خاصی مصیبت کا باعث بنے رہے۔ یہ امر توجہ طلب ہے۔ کہ اخوان کی زیادہ تعداد قبیلہ مطیر ہی میں سے تھی۔ مطیر کے جنوب میں عجمان رہتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان اتحاد تھا۔ اور ابن سعود کے خلاف جنگ میں انھوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا۔ عجمان ابتدا میں یمن سے آئے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر تک یہ لوگ کویت سے ربع الخالی کے شمالی کناروں تک اپنے ریوڑ چرایا کرتے تھے اگرچہ یہ لوگ بیرونی لوگوں سے دغا بازی میں بھی تامل نہیں کرتے، لیکن لڑنے

میں بہت بہادر ہیں۔ انہوں نے ابن سعود کو کئی مرتبہ شکست دی۔ ایک لڑائی میں ابن سعود کا بھائی سعد مارا گیا۔ انجام کار یہ بھی مسخر ہو گئے۔

دہنا کے ویران ریگ زار سے آگے بڑھیں تو دریائے ریگ اور چھوٹی چھوٹی ساحلی پہاڑیوں کے درمیان ایک میدان آتا ہے۔ جس میں باریک کنکر بچھے ہوئے ہیں اور کہیں کہیں گھاس کے ٹکڑے بھی ہیں۔ وہاں سیاہ بھیڑ یں اور بادامی رنگ کے اونٹوں کے چلنے پھرنے کے وسیع نشان ملتے ہیں۔ یہ مناصیر قبیلے کا مقام ہے۔ جو قطر کی سرحد سے شمالی سمت میں عیقاقی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں مناصیر عرب کے مشہور جنگجو قبیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور انہوں نے ہمسایوں کو لوٹ کر بڑی دولت جمع کر لی تھی۔ اب بھی جگہ جگہ پچیس پچیس فٹ بلند گول برج دکھائی دیتے ہیں۔ جو ایک زمانے میں گلہ بانوں نے مناصیر سے بچاؤ کے لیئے تعمیر کیئے تھے۔ دولت سعودیہ کے اندر تو بڑے پُر امن طریق پر زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۴۸ء تک شیخ ابو ظبی سے برسر پیکار رہتے۔ ابو ظبی عمان کے اس حصے میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کے ساتھ انگریزوں نے معاہدہ کر رکھا ہے۔

بدو اجنبیوں کے ساتھ اس وقت تک سرد مہری کا برتاؤ کرتے ہیں جب تک ان کے حلیف قبیلوں میں سے کوئی شخص اجنبیوں کی رہبری کے لیئے ساتھ نہ ہو۔ اگر ثابت ہو جائے کہ رہبر کا تعلق کسی حلیف قبیلے سے ہے۔ یا اس کے ساتھ قبیلے کا کوئی خونی رشتہ ہے۔ تو سرد مہری کی جگہ گرمجوشی لے لیتی ہے۔ اور اصرار کیا جاتا ہے۔ کہ مسافر ٹھہر جائے۔ عورتیں اور بچے خیمے میں ایک طرف

ہو جاتے ہیں۔ مزید قالین بچھا لیئے جاتے ہیں اور قہوے کا دور شروع ہو جاتا ہے
قہوے کے بعد مسافر کو کھانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اور کم و بیش تین گھنٹوں
میں مہمان کی شان کے لائق کھانا تیار ہو جاتا ہے۔ بات چیت یا تو بارش اور
گھاس کے متعلق ہو گی۔ یا پیٹرول اور اونٹوں کے متعلق یا لڑائیوں کا ذکر چھڑ
جائے گا۔ مسافر، بادشاہ، تیل کی کمپنی، بحرین، جدہ، قاہرہ وغیرہ کی خبریں سناتا ہے
اگر کسی شہری عرب کو بتایا جائے کہ امید ہے۔ آپ سے واشنگٹن میں ملاقات ہو گی
تو وہ اس ملاقات کی خوشی کے سلسلے میں بڑے دلکش الفاظ استعمال کرے گا، لیکن
اگر کسی بدو سے یہی بات کہی جائے تو وہ جواب دے گا، اس ذکر سے کیا فائدہ ہم سب
جانتے ہیں کہ میں کبھی واشنگٹن نہیں جا سکتا۔ گویا وہ بتا دیتا ہے کہ فضول باتوں
میں وقت کیوں ضائع کیا جائے۔

بدوؤں کے خیمے صحرائی زندگی کے عین مطابق بنائے جاتے ہیں۔ شام
کے وقت ایک طرف کا پردہ اٹھا دیا جاتا ہے تاکہ ہوا اندر آنے لگے۔ شیخ کا خیمہ
کم و بیش پچھتر فٹ لمبا ہوتا ہے۔ گھومتے پھرنے کے لیے اس سے زیادہ بڑا خیمہ بنایا
نہیں جا سکتا۔ خیموں میں چوبوں ہی کے مطابق رسے استعمال ہوتے ہیں۔ بدوؤں
کے خیمے عام طور پر دو یا تین حصوں میں بٹے رہتے ہیں۔ ان کے پردوں پر خوب
کشیدہ کاری کی جاتی ہے یہ سب کام عورتوں کا ہوتا ہے۔ مردوں کے حصے میں قالین
بچھا لیئے جاتے ہیں۔ اور تکیوں کے علاوہ کم از کم اونٹ کا ایک زین ضرور رکھا جاتا ہے۔ اور
چند بندوقیں لٹکی ہوئی نظر آئیں گی۔ قہوہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ قہوے میں بن[1] کے

---

[1] قہوہ درختوں سے توڑا جاتا ہے تو لیتے کی طرح اس کے دانے ہوتے ہیں۔ انھیں "بن" کہتے ہیں
اسے کوٹ کر گرم پانی میں جوش دیا جاتا ہے۔ تو قہوہ تیار ہوتا ہے۔ عرب بدوؤں میں فرنگیوں کی طرح قہوے کے
ساتھ شکر کا دستور نہیں۔

علاوہ الائچی ڈالی جاتی ہے۔ آگ جلانے کے لئے لکڑی اور اونٹ کی مینگنیاں استعمال کرتے ہیں۔ عورتوں والے حصے میں عموماً چھوٹے چھوٹے قالین اور پرانی چٹائیاں ہوتی ہیں ان کے علاوہ کھانے کے برتن، کھجور، چینی، آٹا اور دوسری ضرورت کی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ عام دستور یہ ہے کہ عورتوں کا حصہ خیمے کی انتہائی مغربی جانب ہوتا ہے۔ جہاں گرمی کے موسم میں بھی ہوا آتی جاتی رہتی ہے۔ شکاری کتے عورتوں والے حصے میں بھی آجا سکتے ہیں، لیکن جو کتے نگہبانی کرتے ہیں، وہ ہمیشہ خیموں کے باہر رہتے ہیں۔ خیمے عموماً اس جگہ لگائے جاتے ہیں۔ جہاں پانی اور چراگاہیں قریب ہوں۔ ایک ہفتے یا دو ہفتے کے بعد خیمے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔

دولت سعودیہ کے صحرائی علاقے میں قدرتی وسائل ایسے نہیں جو بدوؤں کے لئے کفایت کر سکیں۔ اور انھیں جو چیز کھانے کے قابل ملتی ہے کھا جاتے ہیں۔ تھوڑے کے سوا ہر چیز عورتیں پکانی ہیں۔ پانی بھی وہی لاتی ہیں۔ البتہ اگر پانی فاصلے پر ہو تو اس کا لانا گلہ بانوں کے ذمے ہوتا ہے۔

پانی سے بڑھ کر جو زیادہ مقدار میں اونٹ کا دودھ پیا جاتا ہے۔ دودھ یا تو تازہ تازہ پی لیا جاتا ہے۔ یا اسے چمڑے کے ایک مشکیزے میں بھر کر رکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس میں ترشی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مشروب گرم آب وہوا میں معدے کے لیے بہت سازگار ہوتا ہے۔ خانہ بدوش عموماً اپنے گلوں اور ریوڑوں کو نئی چراگاہوں کی تلاش میں لیے پھرتے رہتے ہیں۔

نخلستانوں میں رہنے والے عرب باشندوں کی عام غذا کھجور ہے وہ بدو بھی کھجوریں ہی استعمال کرتے ہیں، جو ضرورت کے مطابق جنس مہیا کر لیتے ہیں۔ کھجوریں

ناشتے، دوپہر کے کھانے اور رات کے کھانے میں استعمال ہوتی ہیں بعض بدوؤں نے ان نخلستانوں پر قبضہ جما رکھا ہے جہاں کوئی نہیں رہتا۔ وہ سال میں دو مرتبہ اپنے نخلستانوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ پھل آنے کے وقت، دوسری مرتبہ پھل پکنے کے وقت۔ دولت مند گھرانوں میں عموماً روٹی کھائی جاتی ہے۔ لیکن بدوؤں کے دو تہائی خاندان بمشکل سال بھر میں ایک مرتبہ روٹی پکاتے ہیں۔ بعض عورتوں نے زندگی میں صرف ایک آدھ مرتبہ روٹی پکائی ہو گی۔ عام طریقہ یہ ہے کہ گندھے ہوئے آٹے کو خوب پھیلا لیا جاتا ہے۔ پک چکنے کے بعد وہی روٹی رکابی کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہی کانٹے، چمچے اور رومال کا کام دیتی ہے۔ گرمی کے موسم میں عموماً خمیر کے بغیر روٹی پکائی جاتی ہے۔ سردی میں شام کے وقت آٹے میں خمیر ملا دیا جاتا ہے۔ اور دوسرے دن روٹی پکتی ہے۔ اکثر بدو آٹے میں نمک اور پانی ملا کر اسے جوش دے لیتے ہیں۔ اس طرح ایک پتلا سا مرکب تیار ہو جاتا ہے۔ جو شام کے کھانے میں استعمال ہوتا ہے۔ عرب میں گیہوں بہت مہنگے ہیں۔ غریب بدو باجرے، چنے یا مکئی کا آٹا استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات تلوں کا آٹا گھی اور پانی میں گوندھ کر دلیے کی طرح پکا لیتے ہیں۔

چاول عرب میں بہت زیادہ کھائے جاتے ہیں۔ بدوؤں کے لیے یہ بڑا امیرانہ کھانا ہے۔ چنانچہ وہ چاول کم کھاتے ہیں۔ ان کی ایک غذا "بسیسہ"[1] کہلاتی ہے یہ پتلا سا حریرہ ہوتا ہے۔ جو آٹے اور شہد سے بنتا ہے۔ ایک کھانا "عدد وسہ" ہے۔ کھجوروں کو آٹے اور گھی میں ابال کر پتلا سا حریرہ بنا لیا جاتا ہے۔ ایک کھانے

---

[1] Basese.

کا نام حمیسا ہے، یعنی روٹی کو دودھ میں ابال لیا جاتا ہے۔ اور اس پر اونٹ کی چربی پھیلا لی جاتی ہے۔

بدو ٹڈیاں بھی بڑے مزے سے کھاتے ہیں۔ عرب میں فصلیں زیادہ نہیں بوئی جاتیں۔ جہاں بوئی جاتی ہیں، وہاں ہر وقت ٹڈی دل کا خطرہ لگا رہتا ہے جس شخص نے عرب میں سفر کیا ہو وہی جان سکتا ہے کہ یہ دل جب آتے ہیں تو کس طرح فضا تاریک ہو جاتی ہے۔ امریکی ماہرین ان کی بیخ کنی کے لیے سالہا سال تک کوشش کرتے رہے۔ اور جدہ میں ان کا ایک مستقل دفتر قائم ہو گیا تھا۔ جہاں سے صحراؤں میں پھرنے والے ٹرک کویت سے یمن اور عقبہ سے عمان تک گشت کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے ملک کے اندر ہزاروں میل کا سفر کیا ان لوگوں کو ایک مشکل یہ پیش آئی کہ بدو ٹڈیاں پسند کرتے تھے۔ اور انھیں ختم کرنے پر سخت معترض ہوتے تھے۔ جب ٹڈیوں کا دل آتا ہے تو پورا قبیلہ خیموں سے باہر نکل کر انھیں مارنے لگ جاتا ہے۔ اس طرح بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیتے ہیں۔ انھیں دھوپ میں سکھا کر آٹے کی طرح پیس لیا جاتا ہے یا دھاگوں میں پرو لیا جاتا ہے تاکہ ضرورت کے وقت کھایا جا سکے۔

عربی امریکی تیل کی کمپنی نے شروع میں جن بدوؤں کو ملازم رکھا، یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ بہت جلد تھک جاتے تھے۔ اور آٹھ گھنٹے کی مقررہ میعاد مزدوری پوری نہیں کر سکتے تھے۔ کمپنی نے چھ مہینے تک انھیں گوشت کھلایا تو وہ بہت قوی ہو گئے۔ بحالت موجودہ بدو گائے کا گوشت بالکل نہیں کھاتے اس لیے کہ عرب میں ایسی چراگاہیں ہی نہیں جو گائے کی پرورش کے لئے کفایت کر سکیں۔

بھیڑیں، بکریاں اور اونٹ اتنی قیمتی جنسیں ہیں کہ بدو انھیں صرف خاص تقریبات پر ذبح کرتے ہیں۔ البتہ وہ غزال، موسمار اور اس قسم کے دوسرے شکار ضرور کھاتے ہیں جو لوگ خلیج فارس یا بحیرۂ قلزم کے قریب بستے ہیں وہ مختلف قسم کی مچھلیاں بھی استعمال کرتے ہیں۔

تاہم یہ واضح کر دینا چاہیئے کہ قبائلیوں کی خوراک بہت سادہ ہوتی ہے۔ ناشتے میں عموماً مٹھی بھر کھجوریں کھائی جاتی ہیں۔ دوپہر کا کھانا دوپہر سے کسی قدر پہلے کھا لیا جاتا ہے اس میں اونٹ کا دودھ استعمال کرتے ہیں۔ رات کا کھانا اصل کھانا ہوتا ہے۔ جو سورج ڈوبنے کے تھوڑی دیر بعد کھایا جاتا ہے۔ جن کھانوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ زیادہ تر رات ہی کے کھانے میں کھائے جاتے ہیں۔

کھانا مختلف ٹکڑیوں میں کھایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے سن رسیدہ آدمیوں کی باری آتی ہے اور مہمان انھی کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ پھر جوان آدمیوں کی باری آتی ہے۔ سب سے آخر میں عورتیں اور بچے کھاتے ہیں۔ ان کا مشروب صرف قہوہ ہے۔

بدوؤں کی زندگی سخت مشکلات میں گزرتی ہے اور وہ ہر اس شخص کو حقیر سمجھتے ہیں جو ان کی طرح جفاکشی کی زندگی بسر نہ کرے۔ اگرچہ ان کے پاس کھانے اور پہننے کا سامان بہت کم ہوتا ہے تاہم وہ کسی کی خدمت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ البتہ مرحوم شاہ ابن سعود موجودہ شاہ سعود، شیخ کویت یا دوسرے عمائد کے تحفے ضرور قبول کر لیتے تھے۔ بدو تین چیزوں کی بہت قدر کرتے ہیں، اوّل شرف و غیرت جسے خودداری اور حب وطن کا مرکب سمجھنا چاہیئے، دوم خاندانی عزت جس کا تعلق زیادہ تر مستورات سے ہے، سوم مہمان داری اور ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک جنھیں خاندان کا جزو مان لیا جائے۔
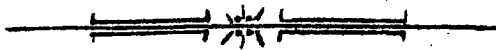
ساتواں باب:

نخلستان نشین

دہنانے اپنی مشرقی جانب سرخ ریت کے بے ترتیب ٹکڑے ایک سنگلاخ سطح مرتفع پر بکھیر دیئے ہیں۔ مسافر کا ٹرک دو گھنٹے تک اس خطے میں چلتا رہتا ہے۔ پھر پانی کا ایک ذخیرہ آتا ہے جس کے ساتھ کچھ عمارتیں اور خیمے ہیں۔ یہ مقام الہافی کہلاتا ہے۔ یہاں موٹروں کے لیے تیل کا ذخیرہ بھی موجود ہے اور معمولی مرمت بھی ہو جاتی ہے۔ جنگ کے زمانے میں عربی امریکی تیل کمپنی نے یہاں اونٹوں کے لیے پانی کا ایک کنواں تیار کر دیا تھا۔ یہی کنواں آج کل ان ٹرکوں کی منزل ہے، جو ضرورت کی چیزیں ہفوف سے ریاض لے جاتے ہیں۔ اس کنوئیں کے ارد گرد ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہو گیا ہے۔ مسافر الہافی پہنچ کر ٹرک سے اترتا ہے۔ اور سٹیشن والے سے اپنا تعارف کراتا ہے۔ اس کو کچھ کھانے کے لیے مل جاتا ہے۔ پینے کے لیے قہوہ بھی ہوتا ہے اور کوکا کولا بھی یہاں ٹرکوں والے بھی جمع ہو جاتے ہیں اور اونٹوں والے بھی اور اس

امر پر بحث کرتے ہیں کہ جب دمام سے ریاض تک ریل چلنے لگے گی تو آیا اس وقت بھی اونٹوں اور ٹرکوں کو سامان لانے لے جانے کے لیے استعمال کیا جائے گا؟[1]

شام کی خنکی میں موٹر کا سفر بہت خوشگوار ہوتا ہے، اس لیے کہ انجن بار بار گرم نہ ہوگا اور موٹر کی رفتار کم و بیش چالیس میل فی گھنٹہ رکھی جائیگی۔

الہافی سے ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد افق پر روشنی کی جھلک نمودار ہوتی ہے۔ یہ مقام عیقائق ہے، جہاں تیل کا بہت بڑا چشمہ ہے۔ زمین سے جو تیل نکلتا ہے اس میں گیس شامل ہوتی ہے جسے بہت مضر سمجھا جاتا ہے۔ اس مقام پر گیس کو تیل سے الگ کرتے ہیں اور وہاں سے گیس پائپ کے ذریعے سے قطیعے کے ایک کنارے پہنچا دی گئی ہے۔ اسی گیس سے ان میناروں میں روشنی ہوتی ہے، جو اسی میل کے فاصلے سے نظر آتے ہیں۔ جیسے جیسے تیل کے چشمے مغربی جانب نکلتے آتے ہیں ان میناروں کی روشنی بھی آگے آگے بڑھتی جاتی ہے۔

موٹر پھرتی ہوئی بھیڑوں کے ریوڑ سے بچتی بچاتی دو گھنٹے میں ہفوف کے مغربی دروازے پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ عرب کا سب سے بڑا نخلستان ہے، جہاں دولت سعودیہ کے قریباً ایک لاکھ افراد کھجوروں کے جھنڈوں اور متعدد چشموں کے پانیوں کے کنارے رہتے ہیں۔ شہر کے بیرونی حصے میں وہ عرب سپاہی ٹرک کے پائیدانوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ مسافروں کو ابن سعود کے وزیر مال شیخ عبداللہ سلیمان کے محل پر پہنچا دیتے ہیں۔ محل کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ وہ بندوقوں کے کندوں سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ دربان بیدار ہوتا ہے، ساتھ ہی ایک درجن نوکروں کو جگا لیتا ہے۔ دروازہ چونکہ تنگ ہے اس لیے اس میں سے ٹرک

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ حصہ اس وقت تک لکھا جا چکا تھا جب ریل مکمل نہیں ہوئی تھی۔

نہیں گزر سکتا۔ مسافر اتر کر اندر چلے جاتے ہیں۔ ملازم سامان اٹھا لیتے ہیں۔ اس طرح یہ گروہ اندرونی دروازے پر پہنچ جاتا ہے، جہاں روشنی موجود ہے۔

ایک چوڑے زینے پر چڑھتے ہوئے مسافر دوسری منزل پر چلے جاتے ہیں۔ وہاں ملازم مسافروں کا منہ ہاتھ دھلاتے ہیں۔ پھر وہ ایک اور زینے پر چڑھتے ہوئے چھت پر چلے جاتے ہیں۔ جہاں نہایت عمدہ قالین بچھے ہوتے ہیں۔ وہاں ایک گھنٹے تک قہوے کا دور چلتا ہے اور سرکاری افسروں سے باتیں ہوتی ہیں۔ سر پر تارے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ اردگرد کے کنوئیں چلنے کی آواز شب بھر جاری رہتی ہے۔ پھر مسافر کھانے کے بڑے کمرے میں جمع ہوتے ہیں۔ دروازے پر تین ملازم ٹھہرے رہتے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں پانی کا آفتابہ ہوتا ہے دوسرے کے ہاتھ میں سیلابچی اور تیسرے کے ہاتھ میں تولیہ۔ ہاتھ منہ دھوکر مسافر اندر جاتے ہیں۔ فرش پر دسترخوان بچھا ہوتا ہے جو کم وبیش بیس فٹ لمبا اور آٹھ فٹ چوڑا ہوگا۔ ان کے سامنے بڑے بڑے تھالوں میں سالم بھنے ہوئے دنبے لگ جاتے ہیں۔ جن سے یخنی نکل نکل کر چاولوں میں گرتی ہے۔ ان کے علاوہ مٹر، لوبیا، آلو، ٹماٹر، چاول شوربا، مرغ وغیرہ مختلف پلیٹوں میں لگے ہوتے ہیں۔ چھری، کانٹا یا چمچے استعمال نہیں کیے جاتے۔ ہاتھ سے سب کچھ کھانا پڑتا ہے۔ ہر نشست پر کم وبیش دس مختلف کھانے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہفوف کی کھجوریں اور دوسرے میوے ان کے علاوہ ہیں۔ ان میں سے صرف ایک حصہ ہی کھایا جاتا ہے، لیکن عرب میں کھانا ضائع نہیں ہوتا۔ بیرونی مہمان اٹھ جاتے ہیں اور ہاتھ دھوکر پھر چھت پر جا بیٹھتے ہیں، تو عرب مہمان کھانے کے کمرے میں پہنچ جاتے

جاتے ہیں ۔ وہ کھا چکتے ہیں تو باقی غذا عورتوں اور بچوں کی قیام گاہوں میں پہنچا دی جاتی ہے۔ سب سے آخر میں گھر کے ملازم اور ان کے بعد گھر سے باہر کے ملازم اور غلام کھاتے ہیں اس طرح ایک وقت کا کھانا کم و بیش پچاس یا اس سے بھی زیادہ آدمی کھاتے ہیں۔ عرب میزبان مہمانوں سے یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا کہ آپ کیا کھائیں گے۔ جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے، دسترخوان پر لگا دیتا ہے۔ آپ جو چیز کھانا چاہیں کھا لیں بچھت پر پہنچ کر مسافر یا مہمان سو جاتے ہیں۔ صبح موذن کی صدا انھیں بیدار کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ نماز سونے سے بہتر ہے۔ (الصلوٰۃ خیر من النوم) ناشتے میں انڈوں کے علاوہ ٹماٹر، چاول، کھجوریں اور قہوہ ہوتا ہے۔

ہم لوگ ناشتے کے بعد المحل کے سخت گیر اور کم سخن امیر سعود بن جلوی کے محل کی طرف روانہ ہوئے۔ دربار کے باب داخلہ کے اندر بیس جنگجو آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور چہروں سے بڑے درشت خو نظر آتے تھے۔ ہم ان سے گزرتے ہوئے پنجاہ سالہ امیر کے پاس پہنچے اور مصافحہ کیا۔ امیر متوسط قد کا آدمی ہے داڑھی بالکل سیاہ، ناک لمبی، آنکھوں سے سرد مہری اور درشتی ٹپکتی تھی۔ امیر کا والد عبداللہ ابن جلوی مرحوم شاہ ابن سعود کا عزیز ترین دوست تھا۔ جنوری ۱۹۰۲ء کے واقعے میں وہ مرحوم بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد ہی عبدالعزیز اس شاہراہ پہ روانہ ہوا جو اسے عرب کے بہت بڑے حصے کا مالک بنا دینے والی تھی۔ عبداللہ بن جلوی نے ۱۹۲ء میں وفات پائی۔ سعود بن جلوی بہت آہستہ بات کرتا ہے اتنا آہستہ کہ آواز کانوں تک بمشکل پہنچتی ہے جب اس کی طبیعت ناساز ہو تو محض شکریے کے دو حرف ادا کر دیتا ہے۔ بامزاج پر

کر لیتا ہے۔ جب مزاج درست ہو تو اس کی رفیقانہ باتیں دل پر اس طرح نقش ہو جاتی ہیں کہ مدت تک یاد رہتی ہیں۔ گفتگو میں کبھی یہ ذکر آجاتا ہے کہ امریکہ والے مینہ برسانے کے جو تجربے کر رہے ہیں، آیا ان سے عرب میں بھی کام لینا ممکن ہوگا۔ کبھی الحسا میں عدل و انصاف کے اختیار کردہ طریقوں کا ذکر آجاتا ہے۔ امیر سعود بن جلوی اسلامی شریعت کے مطابق عدل و انصاف میں خاص شہرت کا مالک ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آج عرب میں لوگ اس سے زیادہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ یقیناً اس نے صوبہ الحسا میں قیام امن کمال پر پہنچا دیا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی ڈرائیور تنہا بھی صحرا میں رات گزارے تو اس کو کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا، حالانکہ پہلے مسلح محافظوں کا ایک جتھا بھی کسی کے لیئے یقینی حفاظت کا ذریعہ نہ سمجھا جاتا تھا[1]۔ کوئی شخص لرزہ براندام ہوئے بغیر امیر کے سامنے قیدی کی حیثیت میں پیش ہونے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ لیکن دوست کی حیثیت میں امیر، عرب کی مہمان نوازی کی بلند ترین روایات پیش کرتا ہے۔

امیر نے اچانک آہستہ سے کہا "قہوہ"۔ جو جنگجو دروازے کے پاس بیٹھے تھے انھوں نے پکار کر کہا "قہوہ"۔ اسی طرح یہ آواز باورچی خانے تک جا پہنچی اور قہوہ آگیا۔ لیکن اب یہ طریقہ بھی بدل رہا ہے۔ اس لیے کہ امیر کے

---

[1] حسن نظم، قیام امن اور عدل میں خاص شہرت عبداللہ ابن جلوی نے حاصل کی تھی اور جب وہ زندہ تھا تو لوگ دولت سعودیہ میں ان سے زیادہ کسی سے نہ ڈرتے تھے۔ بالکل وہی طرز عمل سعود ابن عبداللہ ابن جلوی نے اختیار کیا۔

قریب ایک بٹن لگا دیا گیا ہے، جس کے دباتے ہی قہوہ پلانے والا حاضر ہو جاتا ہے
امیر کے سلام سے فارغ ہو کر ہم ہفوف کے دورے پر روانہ ہوئے اور
وہ چشمے دیکھے جو نخلستانوں کو سیراب کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا چشمہ عین
الحقل ہے جو ہر منٹ میں بائیس ہزار گیلن سے زیادہ ٹھنڈا اور خالص پانی نکالتا
ہے۔ ایک اور چشمے پر تھوڑے فاصلے تک دیواریں بنا دی گئی ہیں۔ یہ حصہ عورتوں
کے غسل کے لیئے وقف ہے۔ ایک تیسرے چشمے پر ڈاک بنگلہ بنا ہوا ہے اور اس
تک سڑک تیار کر دی گئی ہے۔ یہ بنگلہ خاص بادشاہ کے استعمال کے لئے ہے۔ بہت
سے چشموں کا پانی گہرے نیلے رنگ کا ہے۔ عرب ان میں چھلانگیں لگاتے ہیں اور
مزے سے نہاتے ہیں۔ چشموں سے بہت سی چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی گئی ہیں، جو
کھجوروں اور دوسرے میووں کے باغوں، نیز غلے اور سبزیوں کے کھیتوں کو
سیراب کرتی ہے۔

باہر کا دورہ کر چکنے کے بعد ہم پھر شہر میں داخل ہوئے۔ داخلے کا دروازہ
تنگ ہے اور سعودی سپاہی وہاں پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ سامنے بڑی منڈی ہے،
جس میں ایک طرف اونٹوں کو گھٹنے باندھ کر بٹھا رکھا ہے۔ ایک مسقف اور ایک
کھلا بازار ہے، جہاں سے عرب قہوے کے برتن اور دوسری چیزیں خریدتے
ہیں۔ ہفوف کے زیادہ تر مکان دو منزلے ہیں اور ان کی کھڑکیاں بازار کی
طرف نہیں، بلکہ اندر صحن کی طرف کھلتی ہیں۔ بڑے مکانوں کے لیے مشرقی افریقہ
سے شہتیر منگائے جاتے ہیں۔ چھوٹے مکانوں کے لیے کھجور کے تنے استعمال
ہوتے ہیں۔ کنبے کے افراد بڑھ جائیں تو نیا مکان بنوا لیتے ہیں۔ اگر نئے مکان

کے لیئے زمین نہ مل سکے، تو چھت پر بنے کمرے تعمیر کیئے جاتے ہیں۔ ان کا زینہ باہر کی طرف رکھا جاتا ہے۔ تعمیر کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ دروازے کھڑکیاں اور شہ نشین خوب منقش ہوتے ہیں۔ چونکہ دیواریں بہت چوڑی رکھی جاتی ہیں اور ان میں کھڑکیاں کم ہوتی ہیں، اس لیئے مکان گرمیوں کے موسم میں بھی ٹھنڈے رہتے ہیں۔ میزوں اور کرسیوں کی جگہ کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے دیوان بنا دیئے جاتے ہیں، جن پر رنگین گدّے رکھے رہتے ہیں۔ لیمپوں کے ذریعے سے کمروں میں روشنی ہوتی ہے۔ فرشوں پر ایرانی قالین بچھے ہوتے ہیں۔ غسلخانے عموماً چھوٹے دیکھے گئے۔ گرمیوں کے موسم میں ہموار چھتوں پر لوگ کھانا کھاتے ہیں اور وہیں سوتے ہیں۔ اگرچہ بازار اور گلیاں صاف نہیں ہوتیں۔ لیکن مکانوں کے اندر صفائی بہت اعلیٰ پیمانے پر دیکھی گئی ہے۔ البتہ بار بار ڈی ڈی ٹی چھڑکنے کے باوجود نہ دن کے وقت مکھیوں سے نجات ملتی ہے اور نہ رات کے وقت مچھروں سے۔ عورتیں سخت پردہ کرتی ہیں۔ بچے دس سال کی عمر تک بے تکلف باہر آجا سکتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکے مردوں کے ساتھ کام شروع کر دیتے ہیں، لڑکیاں گھر میں عورتوں کی مدد کرتی ہیں کسی عورت کو ضرورت کے لیئے باہر جانا ہو تو وہ شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتی۔ چونکہ پردے کی سخت پابندی ہے، اس لیے لڑکوں لڑکیوں کی شادیاں ماں باپ ہی کرتے ہیں۔ شام کی خنکی میں مفوضہ کے بازار اور گلیاں کھچا کھچ بھر جاتی ہیں۔ جب موذن کی صدا مسجدوں سے بلند ہوتی ہے۔ تو عرب سب کام کاج چھوڑ کر نماز ادا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ اول کلمہ توحید، دوم نماز، سوم زکواۃ، چہارم رمضان، پنجم حج، حج کا ایک خاص وقت مقرر ہے۔ اسے عام طور پر حج اکبر کہتے ہیں۔ حج اصغر یعنی عمرہ ہر وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔ سعودیوں کے علاوہ حج کے لیے ہر سال ڈیڑھ لاکھ کے قریب آدمی مغرب میں مراکش تک سے اور مشرق میں فلپینیز تک سے مکہ معظمہ آتے ہیں۔ اس طرح کروڑوں مسلمانوں کے فکر و نظر میں ہر سال وحدت کا انتظام ہوتا رہتا ہے۔ جو دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ محض ایک مذہبی فریضہ ہی نہیں بلکہ اسلامی دنیا کا ایک بہت بڑا اجتماع بھی ہے۔ انہی پانچ ارکان اسلام کو مرکز بنا کر عربوں نے اپنی زندگی کا نقشہ تیار کیا۔

کھجور غالباً قدیم ترین زمانے سے عرب میں کاشت ہوتی چلی آ رہی ہے۔ صدیوں سے یہ دستور ہے کہ جو شگوفے مادہ کھجور کے تنوں کی جڑوں میں پیدا ہوتے ہیں، انھیں الگ کر کے ریتلی زمین میں لگا دیا جاتا ہے۔ دوسرے سال یہ مضبوط درخت بن جاتے ہیں اور آٹھویں سال پھل دینے لگ جاتے ہیں تیرھویں سال کھجور کا درخت کمال پر پہنچ جاتا ہے اور اس کی عمر کم و بیش ایک سو سال ہوتی ہے۔ اسے نشو و نما دینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ سر پر سورج کی روشنی پڑتی رہے اور جڑیں سیراب رکھی جائیں۔ اس کے لیے مینہ کی ضرورت نہیں، البتہ ہوا ضروری ہے جو اسے آراستہ کرتی رہتی ہے۔ پھل صرف مادہ کھجور کو لگتا ہے، لیکن وہ خود بخود پھل نہیں دے سکتی، لہذا کھجوروں کے جھنڈ میں چند نر پودے بھی لگا دیئے جاتے ہیں۔ جب موسم بہار کی ابتدا ہوتی ہے تو کھجوروں کا مالک یا اس کے کارکن نر درختوں کی زیرہ یعنی زیرہ مادہ درختوں کے پوف میں پہنچا دیتے ہیں اور اس طرح

پھل لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ کھجوروں کے بڑے بڑے گچھے ہوتے ہیں۔ جو پکنے پر دس دس بارہ بارہ سیر کے ہو جاتے ہیں۔ اگست میں کھجوریں ملائم، شیریں اور حد درجہ نرم ہو جاتی ہیں، لیکن اگر اسی حالت میں انھیں باہر بھیج دیا جائے تو سڑ جائیں گی۔ لہٰذا صرف وہی کھجوریں اگست میں اتاری جاتی ہیں، جو مقامی استعمال کے لیے ضروری ہوں۔ باقی خوشے ستمبر تک درختوں ہی پر رہتے ہیں اور زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ پوری پکی ہوئی کھجوروں میں اٹھاون فی صد شکر ہوتی ہے اور وہ آسانی سے محفوظ رکھی جا سکتی ہیں۔ عرب میں کھجوروں کی ستر سے بھی زیادہ قسمیں ہیں۔ بعض صرف مقامی طور پر کھائی جاتی ہیں اور بعض باہر کے ملکوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ عربی زبان میں کھجور کے لیے پانسو سے بھی زیادہ الفاظ ہیں۔ مفوف کی بہترین قسم وہ ہے، جسے "خلاص" کہا جاتا ہے۔

کھجور سے اور کام بھی لیے جاتے ہیں۔ مثلاً اس کی گٹھلیاں پیس کر جانوروں کو کھلائی جاتی ہیں۔ پتوں سے چٹائیاں بنتی ہیں۔ ریشوں سے رسے بٹتے ہیں۔ تنے مکان بناتے وقت شہتیر کا کام دیتے ہیں۔ اور اس امر پہ تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ نخلستانوں میں رہنے والے لوگوں کو "اہل خرما" یا "کھجوروں والے" کہتے ہیں۔
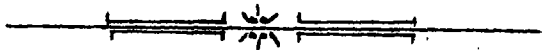
آٹھواں باب:

تیل کی عربی وامریکی کمپنی

آسٹریلیا کا مشہور سرمایہ دار ولیم ناکس ڈارسی[1] اپنے ایک دوست سے باتیں کر رہا تھا۔ اس دوران میں ذکر آ گیا کہ موٹریں وسیع پیمانے پر استعمال ہونے لگیں گی اور ان کے لیے پٹرول کی بہت بڑی مقدار مہیا رکھنا لازم ہوگا۔ یہ سنتے ہی ڈارسی ان سرزمینوں کی تلاش میں لگ گیا جہاں تیل کے ذخیرے ہونے کا امکان تھا۔ اس نے کاروبار کے لیے جس شخص کو مینیجر مقرر کر رکھا تھا، اس کی ملاقات اتفاقاً ایک ایرانی سے ہو گئی جس نے حکومت ایران سے تیل کے بعض چشموں سے متعلق مراعات حاصل کر رکھی تھیں اور زمانہ قدیم سے لوگوں کا گمان تھا کہ وہاں تیل ہے۔ ڈارسی کے مینیجر نے اس ایرانی کے ساتھ معاملہ طے کیا اور مئی ۱۹۰۱ء میں مظفر الدین قاچار شاہ ایران سے ساٹھ سال کے لیے تیل نکالنے کا اجارہ لے لیا گیا۔۔۔۔۔۔

---

[1] Knox D, Arcy

اس اجارے میں ایران کے پانچ شمالی صوبے مستثنیٰ رکھے گئے۔ سات سال تک
کمپنی کے آدمی تلاش میں لگے رہے۔ آخر ۱۹۰۸ء میں مسجد سلیمان کے نزدیک ایک
چشمہ مل گیا۔ اس کے بعد اینگلو پرشین آئل کمپنی[1] بن گئی۔ اور برطانوی کارکنوں
نے ایران کے عظیم الشان چشموں میں کام شروع کر دیا۔

چونکہ تیل کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی۔ اس لیے خلیج فارس کے علاقوں میں
تیل کی تلاش کے لیے کشمکش زیادہ تیز ہو گئی۔ امریکہ کے ایک امیر البحر نے ترکی
مقبوضات میں تھوڑی دیر کے لیے اجارہ لے لیا تھا۔ جرمنی اور برطانیہ کی فرموں نے
عراق میں مراعات حاصل کیں۔ پھر پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جرمن ان علاقوں
سے نکالے گئے۔ فرانسیسی اور امریکی فرمیں اس کمپنی میں شامل ہو گئیں، جو عراق
پٹرولیم کمپنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اس میں بیشتر حصے اہل برطانیہ کے تھے۔
ایران و عراق کے چشمے بڑے وسیع ثابت ہوئے۔ اب تیل کا کاروبار کرنے والی فرمیں خلیج
کے مغربی سواحل کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ایک فوجی افسر نے جو زمیندار بھی تھا اور تاجر
بھی، شیخ بحرین اور ابن سعود سے اجاروں کے وعدے حاصل کر لیے۔ اس کا
نام میجر فرینک ہومز[2] تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابن سعود نے تازہ تازہ
الحسا فتح کیا تھا اور اجارہ اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے حوالے کر دینے پر آمادگی
ظاہر کی تھی۔ اپریل ۱۹۲۶ء تک کمپنی کے ماہرین ارضیات نے دیکھ بھال کے

---

[1] Anglo Persian Oil Company بعد میں ملک کا نام ایران تجویز ہوا۔ تو کمپنی کا نام اینگلو ایرانین آئل کمپنی ہو گیا۔

[2] Frank Holmes

بعد یہ فیصلہ کیا کہ بحرین یا مشرقی عرب میں تیل کے ایسے ذخیرے نہیں مل سکتے جن کی بنا پر وہاں کاروبار شروع کیا جا سکے۔ یہ مشورہ کوتہ اندیشی پر مبنی تھا۔ میجر ہومز نے کیلیے فورنیا کی سٹینڈرڈ آئل کمپنی سے بات چیت کی۔ چنانچہ اس کمپنی کے کارکنوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۲۶ء کو بحرین میں ایک چشمہ دریافت کر لیا، جہاں سے کاروباری پیمانے پر تیل حاصل کیا جا سکتا تھا اور عربی امریکی آئل کمپنی قائم ہو گئی۔ فریڈ اے ڈیویز اس کمپنی کے بورڈ کا صدر تھا، اس کی رہنمائی میں یہ کام انجام پایا۔ پھر دوسرے چشمے دریافت ہوئے تو واضح ہو گیا کہ بحرین کی زمین میں تیل کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ٹیکساس کمپنی کو بھی اس میں برابر کا حصے دار بنا لیا گیا، اس لیے کہ وہ کمپنی تیل کی فروخت میں بہت سہولتیں پیدا کر سکتی تھی۔ بحرین میں کام آسان نہ تھا، کیونکہ گرمی حد سے زیادہ تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کارکن بعض اوقات جزیرے کی سب سے اونچی چوٹی پر بیٹھ جاتے تاکہ سمندر کی تھوڑی بہت ہوا سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس دوران میں وہ بلن لگا کر عرب کے ریتیلے ساحل کا بھی معائنہ کرتے رہتے تھے، جہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ واقع تھا۔ ایک خاص پہاڑی جو دمام گاؤں کے پیچھے واقع تھی ہمیشہ ان کی نظریں اپنی طرف کھینچتی، اس لیے کہ اس کی وضع قطع بحرین کی پہاڑیوں ہی سی تھی۔

چنانچہ کمپنیوں نے پہلے میجر ہومز سے کہا بعد ازاں عربیات کے مشہور ماہر سینٹ جان فلبی کی وساطت سے فائدہ اٹھا کر شاہ ابن سعود سے اجارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۲ء کے موسم خزاں میں مشہور امریکی انجینئر کارل ٹویچل

ل Fred A. Davies

بھی اس گفتگو میں شامل ہو گیا۔ اسے شاہ ابن سعود نے پانی کے ذخیرے اور سونے کی کانیں دریافت کرنے کے کام پر لگایا تھا۔ اور بادشاہ سے اس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ فروری ۱۹۳۳ئ میں طویل تیل کے ایک بہت بڑے امریکی تاجر لائڈ ہملٹن کو لے کر جدہ پہنچا تو عراق پٹرولیم کمپنی کے نمائندے اسی عمارت میں ٹھہرے ہوئے تھے، جہاں ان لوگوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔ شاہ ابن سعود نے تمام حقائق کا اندازہ کرتے ہوئے امریکیوں کی شرکت کو ترجیح دی اور یہی مناسب سمجھا کہ اپنے ملک کی اقتصادیات کو اس ملک سے وابستہ کیا جائے جو طاقتور بھی ہے اور دور واقع ہے۔ نیز اسے سامراج سے کوئی علاقہ نہیں اور وہاں تیل کے بڑے بڑے ماہر موجود ہیں۔

اجارے کا فیصلہ ہونے ہی والا تھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے معیار طلا ختم کر دیا اور ملک سے سونے کی برآمد روک دی گئی تاہم یہ طے ہو گیا کہ شاہ ابن سعود کو سرفی ٹن تیل پر چار سنہری شلنگ یا ان کے برابر ڈالر یا پاؤنڈ دیئے جائیں گے۔ ابتدا میں اجارے کا دائرہ دو لاکھ اسی ہزار مربع میل تک محدود رکھا گیا تھا۔ بعد میں اسے بڑھا دیا گیا اور مشرقی ساحل سے ہلالی شکل میں وہ پورا خطہ شامل کر لیا گیا جو جنوبی سمت میں ربع الخالی سے گزرتا ہوا مغرب میں سرحدات یمن تک جاتا ہے۔ شاہ ابن سعود نے ۱۴۔ جولائی ۱۹۳۳ئ کو اجارے کی تصدیق کر دی۔ ۱۹۳۹ئ میں زیر اجارہ رقبہ چار لاکھ چالیس ہزار مربع میل تک پہنچ گیا تھا۔ ۱۹۴۸ئ میں بعض اور کمپنیاں حصے دار بنالی گئیں تاکہ

Loyd Hamilton

پوری سرزمین عرب میں سے گزرنے والی پائپ لائن بچھانے کے لیے سرمایہ فراہم ہو جائے۔ اس طرح خلیج فارس سے تیل براہ راست بحیرہ روم تک پہنچا دیا گیا۔

انکشافی جماعتیں مرتب کرنے میں کچھ وقت لگا، اس لیے کہ دولتِ سعودیہ کے حالات بہت کم معلوم تھے۔ ستمبر ۱۹۳۳ء میں ماہرین کی پہلی جماعت دولت سعودیہ میں جُبلیل کے مقام پر لنگر انداز ہوئی جو ظہران سے تیس میل شمال میں ہے۔ ایک کچا مکان کرایے پر لے لیا گیا۔ فوجی پلنگ سونے کے لیے تھے۔ ایک چھوٹی سی سفری میز ساتھ تھی۔ چند عربوں کو ملازم رکھ کر اس کمپنی کا کام شروع کر دیا گیا۔

سب سے پہلے وہ تمام کا جائزہ لیا گیا۔ پھر مختلف پارٹیاں ٹرکوں میں یا اونٹوں پر سوار ہو کر اندرونِ ملک کی طرف بڑھیں۔ باریک کنکریٹ والے میدان یا پتھریلے علاقے میں تو موٹریں آسانی سے چلتی رہتی ہیں۔ لیکن جب متحرک ریت سے سابقہ پڑا تو پہلے ریت میں دھنس کر رک گئے۔ آخر خاص وضع کے ٹائر حاصل کیے گئے۔ ان کی موٹائی اونٹ کے نقش پا اور اس کے بوجھ کی مناسبت سے تجویز ہوئی۔ تجربات کے بعد "ارامکو"[1] یعنی عربی امریکی کمپنی نے خاص ٹائر تیار کر لیے اور اب موٹریں بے تکلف ہر طرف دوڑتی پھرتی ہیں۔

۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء کے موسم سرما میں تحقیقات اور دریافت کا کام

---

[1] پہلے بتایا جا چکا ہے کہ "ارامکو" Arabian American Oil Company کا مخفف ہے۔ AR Arabia سے AM American اور Company سے CO لے کر لفظ بنایا گیا ہے ARAMCO

جاری رہا۔ دو دو آدمیوں کی تین پارٹیاں ہفوف تک پھر نکلیں۔ کھجوروں، بکری کے گوشت اور اُونٹ کے دودھ کے سوا ضرورت کی ہر چیز چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بحرین سے منگائی جاتی تھی۔ پینے کے پانی کا مسئلہ بڑا اہم تھا جب تک پانی کے لیے ایک نل کنواں تیار نہ کر لیا گیا ضرورت کے مطابق پانی باہر سے بڑے بڑے کنستروں میں بھر کر لایا جاتا تھا۔

ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ گودی بنانے کے لیے بہترین جگہ کونسی ہو گی۔ پہلے یہ خیال تھا کہ گودی دمام میں بنائی جائے پھر ایک چھوٹے سے گاؤں الخوبر کو اس غرض سے منتخب کیا گیا جو چند میل جنوب میں واقع تھا۔ چنانچہ وہاں گودی بنا دی گئی۔ اب دولت سعودیہ کے مشرقی ساحل پر چار گودیاں ہیں۔ ایک دمام میں جو سات میل لمبی ہے، دوسری راس تنورہ میں جہاں سے تیل لادا جاتا ہے دو چھوٹی گودیاں اور ہیں۔ ایک الخوبر میں اور دوسری راس المشعب میں۔

۲۶ ستمبر ۱۹۳۳ء کو ایک اور پارٹی الخوبر میں اتری اور سات میل اندر جا کر خیمہ زن ہوئی، جہاں آج کل ظہران کے ہوائی اڈے کو جانے والی سڑک الخوبر والی شاہراہ میں ملتی ہے۔ یہ مقام صرف پانی کے قرب کے باعث مناسب سمجھا گیا تھا۔ پارٹی کے پاس کل چار خیمے تھے۔ ایک میں چینی باورچی کھانا پکاتا اور سوتا تھا، دوسرے میں پارٹی کے لوگ کھانا کھاتے تھے، تیسرے میں سوتے تھے۔ اور چوتھا دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا جس میں ضرورت کی چیزیں بھی رکھی رہتی تھیں۔ وہ لوگ بحرین سے دو ٹیرکی[1] بھی اپنے ساتھ لائے تھے

[1] ٹرکی Turkey جسے قبل مرغ یا پیرو کہتے ہیں۔

تاکہ نوروز کی دعوت میں استعمال کریں۔ عرب ان پرندوں کو بڑے شوق کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ۳۰ دسمبر کو دونوں پیرو غائب ہو گئے اور شبہ یہ ہوا کہ عرب مزدور اٹھا کر لے گئے ہیں۔ تلاش کی گئی تو پتا چلا کہ دونوں پیرو کتے نے کھا لیے اور وہ اتفاق سے ایک کنوئیں میں گر کر مر گیا۔ کتا کنوئیں سے نکالا گیا تو واقعہ درست ثابت ہوا اور کمپنی کے کارکنوں کو نوروز پیرو کے بغیر ہی گزارنا پڑا۔

پہلے پہل الخوبر سے ایک معمولی سڑک اس چشمے تک تیار کر لی گئی جہاں تیل دریافت ہوا تھا۔ یہ مقام آج کل ظہران مشہور ہے۔ یہ سڑک چار میل لمبی تھی۔ پھر کارکنوں کے لیے دفتر اور رہنے سہنے کے لیے مکان الخوبر میں بنا لیے گئے۔ ساتھ ساتھ تفتیش اور دریافت کا کام جاری رہا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۳۵ء کو پہلا چشمہ برمایا گیا۔ اگست میں تیل نمودار ہوا۔ دسمبر میں برمانے کا سلسلہ اس سطح پر پہنچا جہاں بحرین میں تیل ملا تھا اور معلوم ہوا کہ وہاں تیل کم ہے البتہ گیس کی مقدار بڑی خاصی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ایک چشمے سے تیل نکل کر اوپر اچھلنے لگا تو تھوڑی دیر کے لیے خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ ۱۹۳۷ء کے اواخر تک لاکھوں ڈالر خرچ ہو چکے تھے۔ اور شدید محنت و مشقت اٹھا چکنے کے باوجود یہی نظر آ رہا تھا کہ مشرقی عرب میں تیل نہیں، صرف ریت کے ٹیلے ہیں۔ آخر برمانے کا سلسلہ چار ہزار چھ سو فٹ کی گہرائی تک پہنچا دیا گیا نتیجہ پھر بھی کچھ نہ نکلا ہر طرف سے مایوس ہو کر برما مزید گہرائی میں پہنچا دیا گیا اور مارچ ۱۹۳۸ء میں تیل کے وسیع ذخیرے مل گئے۔ رات رات میں پوری صورت حال بالکل بدل گئی۔ مشینوں اور آدمیوں کا ریلا شروع ہو گیا۔ نئے چشمے برمائے گئے۔ پرانے چشموں کو مزید گہرا کر دیا گیا۔ ظہران سے الخوبر تک پائپ لائن بچھا دی گئی۔ ساتھ ہی تیل کے ذخیرے کی ٹنکیاں تیار ہو گئیں۔ ستمبر ۱۹۳۸ء میں ساحل عرب کا تیل پہلی مرتبہ بحرین پہنچا۔ دولت سعودیہ کو اقرار کے مطابق

پچاس ہزار سنہری پاؤنڈ رائلٹی کے دیئے گئے۔

مئی ۱۹۳۹ء میں ایک تقریب ترتیب دی گئی جس کا مدعا یہ تھا کہ تیل سمندر میں سے گزرنے والی پائپ لائن میں سے کیلی فورنیا کی کمپنی کے ایک ٹینکر تک پہنچایا جائے۔ اس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لیئے شاہ ابن سعود کو دعوت دی گئی۔ اس غرض سے خیموں کا ایک شہر آباد ہوگیا۔ مئی ۱۹۳۹ء میں شاہ ابن سعود اور ان کے رفیق چار سو موٹروں میں راس تنورہ پہنچے اور یہ رسم ادا ہوئی۔ پھر ظہران کے شمال میں ایک مقام پر تیل مل گیا۔ اسی طرح عبقائق میں تیل کے چشمے دریافت ہوئے یہ چالیس میل مغرب میں ریت کے ٹیلوں کے اندر واقع ہے۔

ستمبر ۱۹۴۰ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی اور تجارت کے عام راستے رک گئے چنانچہ عرب کا تیل افریقہ کا چکر کاٹتے ہوئے اوقیانوس کے پار پہنچایا جاتا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۰ء میں ایک مرتبہ نصف درجن اطالوی بم بار جہازوں نے بحرین اور ظہران پر بم بھی برسائے تھے اور تیل کی ایک لائن بھی توڑ ڈالی تھی۔ اس سے زیادہ نہ نقصان ہوا نہ کوئی موت ہوئی۔ ظہران سے وہ ربع الخالی کی طرف نکل گئے جہاں سے اسمرا واقع ارتریا پہنچنا چاہتے تھے۔ بعض راستے میں گر بھی گئے۔ اس لیئے کہ یہ کوئی جہازوں کے گزرنے کی رپورٹیں پہنچاتے رہے۔

جنگ کی وجہ سے تیل کے کاروبار میں توسیع کا سلسلہ رکا رہا۔ با ایں ہمہ روزانہ بارہ ہزار بیرل[1] تیل روزانہ جزیرہ بحرین پہنچتا تھا۔ امریکہ کے بہت سے

---

[1] Barrel بیرل پیپے یا کنستر کو کہتے ہیں اور عام اندازے کے مطابق اس میں پانچ مکعب فٹ تیل آتا ہے۔

کارکن واپس چلے گئے عورتیں اور بچے کراچی اور بمبئی پہنچا دیئے گئے۔

اس زمانے میں "ارامکو" کے اجارے کی حیثیت چنداں امید افزا نہ تھی۔ عراق میں بغاوت ہوئی جس سے واضح ہو گیا کہ عربی دنیا کے بعض حصوں میں بے اطمینانی موجود ہے۔ جنرل رومیل شمالی افریقہ میں ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا، جہاں سے وہ کسی بھی وقت وادی نیل سے گزر کر آگے بڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ کمپنی کے بڑے بڑے کارکن کام کاج چھوڑ کر چلے گئے۔ سنہ ۱۹۴۲ء کے آخر میں ساحل نفط کی امریکی آبادی باقی سے افراد سے زیادہ نہ تھی۔ جب رومیل کی پیش قدمی رک گئی اور امریکہ کی جنگی مشینری کا پہلا دُنیل کا محتاج ہوا۔ تو پھر دولت سعودیہ پر توجہ مبذول ہوئی۔ یہ بھی سنا گیا کہ ارامکو کا سارا کاروبار حکومت خریدلینا چاہتی ہے۔ کم از کم وہ اس بات کے حق میں ضرور تھی کہ ظہران سے بحیرہ روم تک اپنے خرچ پر پائپ لائن بچھادے۔ چنانچہ پھر بڑی سرگرمی سے کام شروع ہو گیا۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں تیل صاف کرنے کی ایک مشین مکمل ہو چکی تھی جس میں تین ہزار بیرل تیل روزانہ صاف ہو سکتا تھا لیکن دولت سعودیہ میں اس سے بڑی مشین کی ضرورت تھی، چنانچہ نو مہینے کی کوشش سے راس تنورہ میں ایک ایسا کارخانہ مکمل کر دیا گیا جس میں روزانہ پچاس ہزار بیرل تیل صاف ہو سکتا تھا۔ اس کارخانے نے ستمبر سنہ ۱۹۴۵ء میں کام شروع کیا اور آجکل یہ ایک لاکھ بیس ہزار بیرل تیل صاف کرتا ہے۔

ساحل کے ساتھ ساتھ نئے قصبے آباد ہو گئے ہیں۔ خصوصاً ظہران، راس

منورہ اور عبقائق۔ ان میں سڑکوں پہ جا بجا جو نشان لگے ہوئے ہیں، ان میں دو زبانیں استعمال کی گئی ہیں، یعنی انگریزی اور عربی۔ کمپنی کے مکانوں میں کمروں کو ٹھنڈا رکھنے کا انتظام ہے۔ وہاں ڈائننگ ہال بھی ہیں، تھیٹر بھی کھیلوں کے کمرے بھی، اور تفریحی مرکز بھی ہر قصبے کے ساتھ نہانے کے ٹینک ہیں۔ ٹینس اور کرکٹ کھیلنے کے میدان ہیں۔ سیکڑوں آرام دہ بنگلوں میں بجلی لگی ہوئی ہے اور دورِ حاضر کے تمدن کی تمام آرائشیں اور سہولتیں موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ کے باشندے معتدل آب و ہوا میں کام کرتے ہیں۔ اسی آب و ہوا میں کھاتے پیتے ہیں۔ اسی میں سوتے ہیں۔ حالانکہ عرب کے موسم گرما میں درجہ حرارت ۱۲۰ سے کم نہیں ہوتا اور سردیوں میں درجہ انجماد کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ بارش کا اوسط ساڑھے تین انچ ہے۔ ظہران میں بڑی گہرائی سے پینے کا پانی حاصل کیا گیا ہے، جو پوری آبادی کے لیے کفایت کرتا ہے۔ سرگرم لوگوں نے اپنے بنگلوں میں پھولوں اور سبزے کا انتظام کر لیا ہے۔ جن کارکنوں کی تنخواہیں کم ہیں، ان کے لیے ٹھنڈے کمروں کا انتظام ہے اور یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے بال بچوں کو اس وقت تک نہیں لاتے جب تک چوبیس مہینے کی مدت ملازمت پوری نہ کر لیں۔ اس دوران میں کمپنی نئے مکان تیار کرتی جاتی ہے۔ چنانچہ سویڈن سے ایسے مکان منگوا لیے گئے ہیں جنھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ مقامی پتھروں سے بھی کچھ مکان بنا دیے گئے ہیں۔ تاکہ ضرورت پوری ہو سکے۔

۱۹۵۳ء میں تین ہزار سات سو امریکی ملازم دولت سعودیہ میں موجود تھے

پانسو سے زائد بیویاں اور چار سو کے قریب بچے تھے۔ عورتیں ایسے بنگلوں میں رہتی ہیں جنھیں ٹھنڈا رکھنے کا خاص انتظام کر لیا گیا ہے۔ وہ اپنے بحرینی عراقی یمنی یا ہندوستانی ملازموں کی مدد سے گھر کا کام کاج پورا کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے کلبوں اور پارٹیوں کا انتظام کر رکھا ہے۔ وقتاً فوقتاً گانے کی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ پھولوں کی نمائش ہوتی ہے۔ کبھی کبھار مختلف ضرورتوں کے لیے امدادی کام شروع کر دیتی ہیں۔

ظہران اور راس تنورہ میں بڑے بڑے سینما بن گئے ہیں۔ ٹیکسیاں اور بسیں چلتی ہیں۔ ٹیلیفون کا انتظام موجود ہے۔ چار انجنوں والے ہوائی جہاز امریکہ آتے جاتے ہیں۔ دمام اور الخوبر میں ضرورت کی چیزیں بے تکلف خریدی جا سکتی ہیں۔ ظہران کی پرواز گاہ میں حکومت نے ایک درمیانے درجے کا ہوٹل بھی بنا دیا ہے، جس میں آنے جانے والے لوگ ٹھہر سکتے ہیں۔

امریکی لوگ فرصت کے اوقات میں مصروف پائے جاتے ہیں: تاکہ عربوں کے طریق بود و ماند کے متعلق اطلاعات حاصل کریں۔ کبھی کشتیوں میں بیٹھ کر بحرین پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سے موتی، ایرانی قالین یا دوسری چیزیں خرید لاتے ہیں یا تاریخ سے پیشتر کے قبرستانوں اور پرانے پرتگیزی قلعے کو دیکھ آتے ہیں۔ دمام کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملی جلی آبادی کا ایک ایسا مرکز بن جائے جہاں تعلیم یافتہ عرب قیام پذیر ہو سکیں۔ وہ اب نہ تو امریکیوں میں رہنا اپنے لیے موزوں سمجھتے ہیں اور نہ غیر تعلیم یافتہ مقامی آبادی میں گزارا کر سکتے ہیں۔

تمام امریکنوں کو چوبیس مہینے کی ملازمت پوری کرنے پر چودہ روز کی رخصت پوری تنخواہ کے ساتھ ملتی ہے - اور یہ تنخواہ وہ قاہرہ، بیروت - تہران، اسمرا یا مشرق قریب کے کسی دوسرے شہر میں لے سکتے ہیں - نیز ہر دو سال کے کے بعد پوری تنخواہ پر انہیں دو مہینے کے لیئے امریکہ جانے کی رخصت مل سکتی ہے - تنخواہیں اڑھائی سو ڈالر ماہوار سے آٹھ سو ڈالر ماہوار تک جاتی ہیں - ان میں سے خاصی بڑی رقمیں بچائی جاسکتی ہیں، اس لیے کہ دولت سعودیہ میں زیادہ خرچ کا کوئی امکان نہیں -

اکثر امریکیوں نے دو سال سے زیادہ کے اقرار نامے کر رکھے ہیں اور بعض مستقل طور پر وہاں مقیم ہو رہے ہیں - اس لیئے کہ تنخواہ اچھی ملتی ہے اور دولت سعودیہ کے اس حصے میں آب و ہوا ویسی ہی ہے جیسی ٹیکساس اور اوکلاہوما[1] کے مشرقی حصوں میں ہے - ارامکو نے ۱۹۴۷ء میں نیویارک کے نزدیک ایک درسگاہ قائم کی تھی جس میں کارکنوں کو تربیت دی جاتی تھی - ۱۹۵۱ء میں یہ درسگاہ صیدا[2] منتقل کر دی گئی ہے - وہاں کارکنوں کو عربی بولی سکھائی جاتی ہے - اور کام کے متعلق بھی ضروری باتیں بتائی جاتی ہیں

---

[1] Oklahoma جمہوری امریکہ کی ایک ریاست جو ٹیکساس کے شمال اور کنساس کے جنوب اور ارکن ساس کے مغرب میں ہے - [2] Sidon جو ایک زمانے میں تمام کی مشہور بندرگاہ تھی - صور (Pyre) کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا ہے - آج کل یہ لبنان کی بندرگاہ ہے - بیروت سے جنوب کی طرف چلیں - تو پہلے صیدا آئے گا پھر صور -

ساتھ ساتھ دولت سعودیہ کی تاریخ ،جغرافیہ، عادات، رسوم اور قانون کے متعلق اطلاعات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

تیل کی کمپنی بننے سے پیشتر الحسا ایک صحرائی سا علاقہ تھا۔ ایک زمانے میں خلیج فارس کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ کویت سے مسقط تک کھجوروں کے بڑے بڑے باغ تھے وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ صرف چند آثار رہ گئے مثلاً قطیف میں۔ وہ بھی ریت کے بڑھتے ہوئے سیل کے باعث خطرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس علاقے کے چھوٹے چھوٹے دیہات کے باشندوں کے لیئے کھجوروں کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ کمپنی نے دوسرے ذرائع سے لوگوں کی شکم پری کا انتظام کر دیا۔ جنگ کے زمانے میں جہازوں کی آمد و رفت کم تھی اس لیئے کمپنی نے سبزیوں کی کاشت کا انتظام کیا۔ مرغیاں پالیں اور دودھ کے لیئے گایوں کے بڑے بڑے ریوڑ رکھے۔ جب جہازوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تو ان چیزوں کی ضرورت نہ رہی۔ اب آرامکو اس پیمانے پر رسد کی بہم رسانی کا انتظام کر رہی ہے۔ کہ چھوٹے درجے کی یورپی ریاست اپنی فوج کے لیئے ویسا انتظام کرتی ہو گی۔ منجمد گوشت اور دوسرا سامان جہازوں میں پہنچ رہا ہے۔ تمام افسر اور دوسرے بہت سے لوگ اپنے بنگلوں میں تیار شدہ کھانا کھاتے ہیں جن کے ہاں کھانا پکانے کا انتظام نہیں، انھیں ڈائننگ ہال میں بڑی صاف ستھری چیزیں مل جاتی ہیں۔

امریکیوں کے علاوہ کمپنی میں بارہ سو اطالوی بھی ہیں، جن میں سے زیادہ تر اریٹریا سے آئے تھے سال میں سے بعض حبشی تھے۔ بعض عمارے شاہ ابن سعود

نے یہ شرط لگا رکھی تھی کہ امریکیوں کے بعد سب سے بہتر سلوک میری رعایا کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ اطالوی اس سلسلے میں کہیں نہ آتے تھے۔ ان کے لیے ایک مشکل یہ پیش آئی کہ دولت سعودیہ کے مقررہ قاعدے کے مطابق وہ اپنے بال بچے نہ منگا سکتے تھے۔ چنانچہ کمپنی کو ان کے لیئے ظہران، عبقائق اور راس تنورہ میں نئے مکانوں کا بندوبست کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ آٹھ سو فلسطینی پناہ گزینوں کو بھی ملازم رکھا گیا، جو مختلف فنون میں ماہر تھے۔ امریکیوں اور اطالویوں کے علاوہ کمپنی کے پاس چودہ ہزار عرب ملازم ہیں۔ جن میں سے بہت بڑی تعداد دولت سعودیہ کے باشندوں کی ہے۔ کچھ لوگ عراق، بحرین، عدن اور دوسرے علاقوں سے بھی آئے ہوئے ہیں۔ کارکنوں کی اتنی بڑی تعداد جمع کر لینا بجائے خود بہت اہم تھا۔ پھر وہ لوگ تیل نکالنے، ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے اور صاف کرنے کے کاموں سے واقف نہ تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے مختلف کام سیکھ لیئے۔ بعض ٹرک، بسیں، بل ڈوزر، سڑکیں ہموار کرنے والے ٹریکٹر چلاتے ہیں۔ بعض گیس کے سٹیشنوں اور مرمت کی دکانوں پر کام کرتے ہیں۔ تیل نکالنے میں جو عرب ملازم ہیں، ان میں سے بہتیرے دس سال سے کام کر رہے ہیں اور انہوں نے ماہر امریکیوں کی نگرانی میں خاصا کام سیکھ لیا ہے بعض مختلف مشینوں میں بھی کام کرنے لگے ہیں۔ لمبی ملازمت کرنے والوں کو کمپنی تمغے دیتی ہے، مثلاً جو دس سال یا پندرہ سال تک کام کر چکے ہوں۔ احمد رشید دسمبر ۱۹۳۳ء سے ملازم چلا آتا ہے۔ اس کا ایک بیٹا بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا ہے۔ ایک بھتیجا پنسلوینیا (امریکہ) کی یونیورسٹی میں علم حاصل کر رہا ہے۔

جب کمپنی کا کام شروع ہوا تھا، عام مزدوروں کو نصف ریال روزانہ مزدوری ملتی تھی۔ اب مزدوری کی شرح آغاز میں تین ریال یومیہ ہے اور بعض پندرہ ریال یومیہ پاتے ہیں۔ ماہوار تنخواہیں نوّے ریال سے ڈیڑھ ہزار ریال تک جاتی ہیں۔ جو کارکن غیر شادی شدہ ہیں۔ انھیں کھانے کی چیزیں بڑی ارزاں مل جاتی ہیں۔ رہنے کے لیے مکان ہیں، جن کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا۔ ایندھن اور روشنی مفت مہیا کی جاتی ہے۔

دسمبر ۱۹۴۷ء میں کمپنی نے ایک فلاحی منصوبہ بنایا تھا، جس کا مفاد یہ تھا۔ کہ جو ملازم اپنی پانچ یا دس فی صد تنخواہ کمپنی کے پاس جمع کرائے گا، اسے بونس ملے گا۔ غرض جو ملازم پندرہ سال یا زیادہ مدت کی ملازمت کے بعد الگ ہوتا ہے، وہ اپنی بچت پر سو فی صد بونس پاتا ہے۔

کمپنی نے تمام امریکیوں اور دوسرے ملازموں کے لیے طبی امداد کا انتظام بہت عمدہ کر رکھا ہے۔ ۱۹۵۳ء کے اختتام پر محکمۂ طبابت میں ایک سو سے زیادہ امریکی کام کر رہے تھے۔ ان میں ڈاکٹر بھی تھے دندان ساز بھی اور نرسیں بھی، ایسے لوگ بھی جو آنکھ، کان، ناک اور گلے کی بیماریوں کے ماہر تھے۔ ان کے علاوہ ہندوستانی اور اطالوی ڈاکٹر بھی ہیں۔ ایک مہینے کے معالجات کا تجزیہ کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ پچیس ہزار نو سو اڑتیس آدمی ایسے تھے جنھوں نے دوائیں لیں اور سات سو ستانوے آدمی ہسپتال میں رہے۔ کمپنی کے نقطۂ نگاہ سے موسمی بخار خاص توجہ کا محتاج ہے اس لیے کہ قطیف کے نخلستانوں میں اٹھانوے فی صد لوگ موسمی بخار ہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کمپنی کے ملازموں میں موسمی بخار

قریب قریب منفقود ہو چکا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں بمقام ظہران ایک ہسپتال قائم کیا گیا تھا، جس میں دور حاضر کی تمام ضروری سہولتیں مہیا تھیں۔ یہ صرف عربوں کے لیئے تھا۔ اس میں پنیسٹھ بستر تھے۔ اب یہ بہت پھیل گیا ہے۔

تیل کے سلسلے میں کمپنی نے امریکی وضع کے تین مستقل گاؤں تعمیر کیئے اور بہت سے کیمپ بنائے۔ بارہ ہزار عربوں کو تربیت دے کر وہ ملازمت میں لے چکی ہے۔

ایک ضروری امر یہ ہے کہ عرب کارکنوں کو خواہ وہ کوئی کام کر رہے ہوں اوقات میں پانچ مرتبہ نماز کے لیئے اجازت ملنی چاہیئے اور جمعہ کے دن ضروری ہے کہ وہ مسجد میں پہنچیں اور وہاں نماز ادا کریں۔ مسکرات میں سے نہ کوئی چیز اُن کے ہاتھ بیچی جا سکتی ہے اور نہ انھیں بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ لازمی ہے کہ ان کے لیے تعلیم کا جو بھی انتظام ہو، قرآنی اصول پر ہو۔ البتہ ثانوی زبان کے طور پر وہ انگریزی پڑھ سکتے ہیں اور مختلف فنون سیکھ سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے لیئے زکوٰۃ اور حج کی ترغیب کا سلسلہ جاری رہے۔

آج کل (۱۹۵۳ء تک) ساڑھے آٹھ لاکھ بیرل تیل یومیہ نکالا جا رہا ہے اور دس لاکھ بیرل یومیہ تک ترقی کی امید ہے۔ ۱۹۵۰ء کے آخر تک شاہ ابن سعود کو چار سنہری شلنگ فی ٹن رائلٹی ملتی تھی۔ دسمبر ۱۹۵۰ء میں نیا معاہدہ ہوا، جسے "معاہدۂ جدہ" کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق حکومت کمپنی کو حصول ہونے والے منافعے کا نصف حصہ لیتی ہے۔ گویا فی الحال تیل سے بادشاہ کی آمدنی میں کروڑ ڈالر سالانہ ہے۔ یہ رقم دولت سعودیہ کی آمدنی کا نوے فی صد حصہ ہے۔

کمپنی کی وجہ سے جس نئی زندگی کا انتظام ہوا ہے وہ آہستہ آہستہ بدوؤں پر اثر کر رہی ہے۔ بعض لوگ ملازمت کے لیئے آجاتے ہیں پھر واپس چلے جاتے ہیں، لیکن جب ضرورتیں مجبور کرتی ہیں تو دوبارہ آجاتے ہیں۔ جن لوگوں کی شادیاں نہیں ہوئیں وہ پختہ بارکوں میں رہتے ہیں، جہاں بجلی کا انتظام ہے۔ پانی کے پائپ لگے ہوئے ہیں۔ کھانا پکانے کی سہولتیں ہیں۔ جو لوگ شادی شدہ ہیں اور پاس کے کسی گاؤں میں رہتے ہیں وہ وقتاً فوقتاً کمپنی کے ہسپتال میں آتے ہیں۔ ان کے بچے کمپنی کے جاری کردہ سکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ بیٹا انگریزی بولتا ہے اور باپ امید ہے کہ محنت کر کے ایک روز کمپنی کے دفتر میں محاسب بن جائے گا۔

وہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں ریت کے سوا کچھ نہ تھا، وہاں سبزہ زار اور پھول مہیا ہو گئے ہیں۔ عمدہ عمارتیں بن گئی ہیں۔ ہسپتال اتنا بڑا ہے کہ اس کی تعمیر پہ دس لاکھ ریال خرچ ہوئے۔ جو سڑک ہوائی اڈے کو جاتی ہے وہاں سے آگے ایک سڑک جبل ظہران کی طرف بھی جاتی ہے جو خلیج فارس کی ایک راس ہے۔ لیکن آس پاس کے دوسرے خطوں میں غذائی اجناس کم ہیں۔ باقاعدہ تنخواہوں کا کوئی نظام نہیں۔ طبی امداد کا بھی کوئی بندوبست نہیں۔ درسگاہیں بھی نہیں اور ضرورت کی چیزیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ اس مقابلے سے بدوؤں اور بچوں میں یقیناً یہ احساس پیدا ہو رہا ہے۔ کہ وہ ایک نئے دور کے دروازے پر پہنچ گئے ہیں۔

نواں باب :

ساحل نفط کا عام نقشہ

دولتِ سعودیہ کا مشرقی ساحل سبزے سے قریباً محروم ہے۔ البتہ ہفوف میں ایک بہت بڑا نخلستان ہے اور قطیف کے اردگرد کھجوروں کے جھنڈ ہیں۔ یہاں رہنے والے لوگ خانہ بدوش تھے یا ماہی گیر۔ کھجوروں کی کاشت کرتے یا چھوٹے دوکاندار صدیوں سے بہت ہی معمولی حیثیت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں لا یگ رواں آہستہ آہستہ قابل کاشت زمینوں کو اپنی آغوش میں لیتی چلی آ رہی تھی۔ اِس تباہی خیز ریگ کو ختم کرنے کے لیے گزشتہ بیس سال میں بہت کچھ ہو چکا ہے۔ پہلے پریشان حالی دیہات اور آس پاس کی بندرگاہوں کے درمیان وقتاً فوقتاً معمولی تجارت کا سلسلہ جاری تھا اور ان دیہات کی تعداد بھی زیادہ نہ تھی۔ اب کاروبار کا سلسلہ پوری خلیج فارس میں پھیل گیا ہے اور یہ سلسلہ روز افزوں ہے۔ ایک طرف امریکی گاہک ہیں، دوسری طرف اچھی

تنخواہیں پانے والے عربوں اور متوسط درجے کے تاجروں کا روز افزوں گروہ ہے۔ ساحل پر جو قصبے کسی زمانے میں بالکل خاموش اور ساکن نظر آتے تھے، اب ان میں رونق اور چہل پہل ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ریت کے ٹیلوں اور باریک کنکر والے میدانوں سے ذرا آگے چند سال پیشتر یا تو کبھی کبھار جانے آنے والے قافلوں کے نقش پا ملتے تھے یا بدوؤں کی خیمہ گاہوں کے نشان نظر آتے تھے۔ اب وہاں موٹریں پھرتی ہیں۔ ریل کی سڑک بنی ہوئی ہے۔ ٹیلی فون کے تار لگے ہوئے ہیں۔ پائپ لائنیں بچھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ راستوں کے دونوں کناروں پر تیل کے کنستر رکھ دیئے گئے ہیں اور میلوں کے نشان لگ گئے ہیں، جن پر انگریزی اور عربی حروف اور ہندسے کندہ ہیں۔ ان چیزوں نے پورے منظر میں نئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ رات کے وقت گیس کی بڑی بڑی روشنیوں سے زمین دور دور تک بقعۂ نور بن جاتی ہے۔ ظہران، راس تنورہ عبقائق کے شہروں میں نئی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ یہی کیفیت سرحدی بستیوں کی ہے، مثلاً علیق دار عثمانیہ۔

سویز سے راس تنورہ کا فاصلہ تین ہزار میل سے زائد ہے، لہٰذا جو مسافر دولت سعودیہ سے مشرقی حصے میں آنا چاہتے ہیں، ان میں سے زیادہ تر لوگ ہوائی جہاز کے ذریعے سے آتے ہیں۔ ظہران، قاہرہ اور کراچی کے تقریباً وسط میں ہے۔

دونوں طرف کا فاصلہ تیرہ تیرہ سو میل کا ہوگا۔ اس لحاظ سے ظہران ایک طبعی ہوائی مرکز ہے، جہاں مہینے میں ایک ایک ہزار تک ہوائی جہاز اترتے ہیں

ان میں سعودی عربی ہوائی جہاز بھی شامل ہیں، جن کے لیئے ظہران مشرقی سمت کا آخری ہوائی اڈا ہے۔ دوسری کمپنیوں کے جہاز بھی یہاں آتے ہیں خود ارامکو کے ہوائی جہاز بھی اسی مرکز کو استعمال کرتے ہیں۔ ارامکو کے ہوائی بیڑے میں دو ایسے ہوائی جہاز بھی شامل ہیں، جن میں راحت و آسائش کے اعلیٰ سامان موجود ہیں۔ ان میں کمپنی کے ملازمین نیویارک آتے جاتے رہتے ہیں۔

ظہران کے ہوائی اڈے کی تعمیر دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں شروع ہوئی تھی تاکہ جو امریکی جہاز ہندوستان اور جنوبی و مشرقی ایشیا کی فوجوں کو رسد اور دوسرا سامان بہم پہنچاتے تھے، وہ راستے میں ٹھہر سکیں۔ جنگ اڈے کے مکمل ہونے سے پہلے ختم ہوگئی، لیکن امریکہ نے اڈا مکمل کر دیا اس میں دو پرواز گاہیں ہیں، جو سات سات ہزار فٹ لمبی ہیں۔ اڈے کے علاوہ ہوائی جہازوں کی مرمت کا انتظام بھی موجود ہے۔ خلیج فارس کے حلقے میں یہ بہترین ہوائی اڈا ہے۔

اس کے متعلق مرحوم شاہ ابن سعود کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا تو ایک شرط یہ رکھی گئی تھی کہ دولت سعودیہ کے عربوں کو ہوائی اڈے کے انتظامات کی تربیت دی جائے گی چنانچہ امریکہ سے افسروں کا ایک گروہ بھیج دیا گیا، جو منتخب عربوں کو مختلف کام سکھاتا ہے۔ مثلاً اڈے کا انتظام کیوں کر کرنا چاہیئے؟ موسمی حالات جانچنے کا طریقہ کیا ہے؟ کنٹرول کے برج سے کیوں کر کام لیا جاتا ہے؟ جو لوگ یہاں تعلیم و تربیت مکمل کر لیتے ہیں، ان میں سے بہترین آدمیوں کو مزید تربیت کے لیئے امریکہ بھیج دیا جاتا ہے۔

ظہران کے ہوائی اڈے ہی سے ۱۹۴۷ء میں امیر سعود ولی عہد دولت سعودیہ (موجودہ شاہ) امریکہ روانہ ہوا تھا۔ اور دولت سعودیہ کے بہت سے اکابر اسے خدا حافظ کہنے کے لیئے ظہران پہنچے تھے۔ مارچ ۱۹۵۹ء میں کہیں ٹھہرے بغیر ہوائی جہاز میں دنیا بھر کا چکر لگانے کے لیئے پہلی مرتبہ پرواز عمل میں آئی تھی۔ اس ہوائی جہاز میں پٹرول ظہران ہی کے ہوائی اڈے سے لیا گیا تھا۔ پرواز کو اس درجہ مخفی رکھا گیا تھا کہ شاہ ابن سعود کے سوا کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ اگرچہ یہاں آندھیاں آتی رہتی ہیں اور اکثر بار ریک کنکروں والی پرواز گاہوں پر اترنا پڑتا ہے۔ یا ایں ہمہ امریکی ہوا بازوں نے اس اڈے پر حفاظت کا بڑا ہی حیرت انگیز ریکارڈ پیش کیا ہے۔ مسافروں کی تعداد میں اضافے کے پیش نظر ۱۹۵۲ء کے موسم گرما میں سعودی عربی لائن نے چار چار انجن والے پانچ نئے جہاز خریدے۔ حج کے موسم میں سعودی عربی جہازوں کی سرگرمی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس زمانے میں قاہرہ، بیروت، دمشق اور بغداد تک بار بار خاص پروازیں کی جاتی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں دولت سعودیہ نے وہ ٹیکس اڑا دیا جو حاجیوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اور عازمین حج کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ کئی ہزار افراد بیروت کے ہوائی اڈے پر رہ گئے۔ یہ عام حالات میں حج کے موقع پر مکہ معظمہ نہیں پہنچ سکے تھے۔ ممتاز مسلمانوں کا ایک وفد لبنان کے ایک امریکی سفیر سے ملا۔ اس نے اپنی حکومت کو اطلاع دی تو وہاں سے طرابلس (لیبیا) کے امریکی ہوائی مرکز کو ہدایت کر دی گئی کہ عازمین حج کو بیروت سے جدہ پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ان امریکی جہازوں نے بیروت و جدہ کے

درمیان چوہتر پروازیں کیں اور تین ہزار سات سو سے زیادہ عازمین حج کو بروقت جدہ پہنچا دیا۔

۱۹۴۹ء تک عرب کے مشرقی حصے میں اتنے فاصلے طے کرنے پڑتے تھے، جن کے لیئے ہوائی جہاز ضروری ہوتے اور صحرائی ریت بڑی پریشانی پیدا کرتی تھی۔ اب راس تنورہ میں ایسا مسالہ تیار ہونے لگا ہے جو سڑکیں پختہ بنا دینے کے کام آتا ہے۔ چنانچہ ساحل نقطہ کے بڑے بڑے مرکزوں کے درمیان پختہ سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے۔ ایک سڑک ہوائی اڈے سے چلتی ہے، جو امریکی قونصل جنرل اور اس کے عملے کے وسیع احاطے سے گزر کر ظہران جاتی ہے۔ وہاں سے جنوبی و مغربی سمت میں عبقائق چلی جاتی ہے، جہاں تیل کے ایسے چشمے ہیں۔ جو دنیا کے سب سے بڑے چشموں میں شمار ہوتے ہیں۔ ساحل کے ساتھ ساتھ بنگلوں کی قطاریں ہیں۔ جن کی سڑکیں نہایت پختہ ہیں اور ان پر تارکول بچھا ہوا ہے۔ بنگلوں کے اردگرد جنگلے لگے ہوئے ہیں۔ یا چھوٹی چھوٹی دیواریں بنی ہوئی ہیں۔ ساتھ ساتھ سبزہ زار ہیں جو سیراب رہتے ہیں۔ عبقائق میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے یقیناً موجود ہیں، لیکن وہاں روشنی کے سب سے بڑے مینار بھی ہیں۔ یہاں سے روزانہ بارہ ہزار بیرل تیل نکلتا ہے، اس کے مقابلے میں امریکی تیل کی مقدار ایک ملین بیرل سے بھی کم ہے۔ ارامکو کے تیل کی مقدار ۱۹۵۱ء میں تین کروڑ ساڑھے لاکھ ٹن اور ۱۹۵۳ء میں چار کروڑ ٹن سے بھی زیادہ تھی۔ ابھی ظہران کے جنوب میں تفتیش و دریافت کا سلسلہ جاری ہے۔ عین دار اور ابو حدریہ میں اٹھارہ چشمے ۱۹۵۱ء میں مکمل ہو چکے تھے۔ تیل کا ایک اور مرکز الحرض میں دریافت ہوا ہے۔ جو عین دار کے

جنوب میں واقع ہے۔ اور فاصلہ ایک سو میل سے بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح شمول
کا سلسلہ ربع الخالی کی طرف چلا گیا ہے۔

دولت سعودیہ کا کچھ تیل پائپ لائن کے ذریعے سے بحرین پہنچایا جاتا ہے۔
سمندر میں سے جانے والی یہ پائپ لائن سب سے زیادہ لمبی ہے۔ بحرین میں یہ تیل
صاف ہو کر جہازوں میں لادا جاتا ہے۔ راس تنورہ میں پچاس ہزار بیرل روزانہ
صاف کرنے والی مشین جلدی میں لگائی گئی تھی، اب وہ دگنا تیل صاف کر رہی
ہے۔ باقی تیل راس تنورہ کے ٹینکوں میں جمع رہتا ہے۔ اور بعض اوقات یہاں
سے تیل ٹینکروں میں بھر کر بھیج دیا جاتا ہے۔ راس تنورہ کی گودی میں اگرچہ ایک
ایک وقت چار چار ٹینکر تیل لیتے ہیں، لیکن چونکہ ہر ٹینکر کو بھرنے میں آٹھ گھنٹے
لگتے ہیں، اس لیے بعض اوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بارہ بارہ ٹینکر کنارے
سے ہٹ کر ٹھہرے ہوئے اپنی باری کے منتظر ہیں۔ راس تنورہ کی ہیئت بھی بہت
بدل گئی ہے اور بدل رہی ہے۔ وہاں تیل صاف کرنے کی مشین کے علاوہ مشینوں کی
ایک نہایت عمدہ دوکان ہے۔ اور نہایت اچھے بنگلوں کی قطاریں بھی موجود ہیں۔ پہلے
ٹینکروں کے ملاح کنارے پر اترنے کے لیئے تیار نہ ہوتے تھے۔ اب کمپنی نے گودی
سے قریب ایک کلب کھول دیا ہے۔ جو اتنا بڑا ہے۔ کہ ایک سو ملاح اس میں ٹھہر
کر آرام و راحت حاصل کر سکتے ہیں۔ راس تنورہ، ظہران کے مقابلے میں قدرے
مرطوب ہے، لیکن وہاں آندھیاں بہت کم آتی ہیں، صبح سے خوشگوار ہوائیں
برابر چلتی رہتی ہیں۔ اور سمندر میں نہانے کی جگہ بھی اچھی ہے۔ امریکی اسے
کمپنی کے تمام شہروں پر ترجیح دیتے ہیں۔

راس تنورہ میں آج کل ٹینکروں کی قطاریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ پانچ سال پیشتر وہاں صرف معمولی کشتیاں ٹھہر سکتی تھیں۔ دولت سعودیہ کے اس حصے میں سامان لانے جانے والے جہازوں کے لیے بھی ایک عمدہ گودی کی ضرورت تھی۔ اس کا انتظام دمام میں کیا گیا، جو ماہی گیروں کا معمولی سا گاؤں تھا۔ اب اس کے مینار اور عمارتیں راس تنورہ سے نظر آتی ہیں۔ یہ گودی خاصی لمبی ہے۔

۱۹۴۸ء میں یہاں کام شروع ہوا تھا۔ سمندر کے کنارے کنارے ملبہ ڈالا گیا کہ پانچ میل لمبا ایک سنگ بست راستہ تیار کیا گیا، جو سمندر کے اندر چلا جاتا ہے اس کے آگے کوئی پونے میل تک قینچی دار پایوں کا پل ہے۔ پھر ساڑھے سات سو فٹ لمبی آہنی گودی آتی ہے۔ گویا گودی خاصے گہرے پانی میں بنائی گئی ہے۔ جہاں سمندر حالت جزر میں بھی ہو تو جہاز ٹھہر سکتے ہیں۔ اس گودی کی وجہ سے دمام میں بھی خوب چہل پہل شروع ہو گئی۔ دولت مند سعودی عرب یہاں اپنے مکان دفتر اور کارخانے بنا رہے ہیں۔ بجلی پیدا کرنے کی ایک مشین لگا دی گئی ہے، جس میں جون ۱۹۵۱ء سے بجلی پیدا ہونے لگی تھی۔ اندازہ ہے کہ دس سال میں دمام کی آبادی پچیس ہزار تک پہنچ جائے گی۔

دمام کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ مقام دولت سعودیہ کی ریل کا آخری مشرقی سٹیشن ہے۔ ترکوں نے دمشق سے مدینہ منورہ تک حجاز ریلوے بنائی تھی۔ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ حاجیوں کو آمد و رفت میں سہولت ہو۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ عرب میں اپنا اقتدار زیادہ سے مستحکم رکھیں۔ یہ ریلوے پہلی جنگ عظیم میں لارنس اور شریفیوں نے برباد

کر دی۔ فروری ۱۹۴۵ء میں مرحوم شاہ ابن سعود نے امریکہ کے پریزیڈنٹ روزویلٹ
سے کوئنسی[1] نام کروزر پر ملاقات کی تھی۔ تو پریزیڈنٹ نے یہ بھی پوچھا کہ دولت
سعودیہ میں ریل کی کتنی لمبی لائن ہے۔ شاہ ابن سعود نے جواب دیا کہ لائن تو
کئی سو میل تک چلی جا رہی ہے لیکن فی الحال اس سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اسی
وقت سے بادشاہ کی توجہ ریل کی طرف منعطف ہو گئی۔ ۱۹۴۶ء میں شاہ ابن
سعود مصر گیا اور وہاں ریل میں سفر کیا تو فیصلہ کر لیا کہ اپنے ہاں بھی ریل ضرور
بنوائے گا۔

۱۹۴۷ء میں شاہ ابن سعود نے اپنے امریکی سفیر کو ہدایت فرمائی کہ دمام سے
ریاض تک ریل بنانے کے لیے جمہوریہ امریکہ سے قرضے کے امکانات دریافت
کیئے جائیں۔ دمام سے ظہران اور عبقائق تک اور وہاں سے ہفوف تک ریل
کی ضرورت بھی واضح تھی اور اس سے نفع کی بھی امید تھی البتہ ہفوف سے
ریاض تک ریل کارآمد ضرور معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ اس سے نفع کی کوئی امید
نہ تھی۔ اس حصے میں ریل بنانا سیاسی لحاظ سے کتنا ہی مفید ہوتا، مگر اقتصادی
لحاظ سے اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

جمہوریہ امریکہ کی حکومت نے شاہ ابن سعود کو مطلع کیا کہ بندرگاہوں،
سڑکوں، رفاہ عامہ کے کاموں، ہسپتالوں وغیرہ کے لیئے تو قرضے دیئے جا
سکتے ہیں۔ مگر ریل کی پٹڑی بچھانے کے لیئے نجی طور پر قرضے کا انتظام مناسب

---

[1] Quincy یہ ملاقات نہر سویز کی بڑی جھیل میں اس وقت ہوئی تھی جب
مسٹر روزویلٹ یالٹا کانفرنس سے واپس ہو رہے تھے۔

ہوگا۔ بہرحال تعمیر شروع ہوگئی۔ اور دمام سے ریاض تک تین سو ستاون میل پٹڑی بچھ گئی۔ اب واضح ہو رہا ہے کہ بادشاہ کا یہ نظریہ بڑی دانشمندی پر مبنی تھا۔ یعنی اس ریلوے پر توقع سے بہت زیادہ مسافر اور بہت زیادہ سامان آتا جاتا ہے۔ ایک مسافر گاڑی اور دو مال گاڑیاں روزانہ آتی جاتی ہیں۔ تیسرے درجے کے مسافر کھلی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں اور ان کے لیے لکڑی کی نشستیں بنی ہوئی ہیں۔ گاڑی صحرائی علاقے میں سے گزرتی ہے۔ تو عربوں کی ڈھیلی ڈھالی عبائیں ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی عجیب منظر پیش کرتی ہیں۔ ابتدا میں دوسرے مسافروں کے لیے کھلی گاڑیوں پر سائبان سے لگا دیئے جاتے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں امریکہ سے مسافر گاڑیاں آگئیں تو ریل کا سفر بدرجہا زیادہ آرام دہ ہوگیا۔

ابتدا میں ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ عرب اپنی عادت کے مطابق کرایے کے بارے میں بھاؤ تاؤ شروع کر دیتے تھے لیکن اب یہ مصیبت ختم ہو چکی ہے۔ البتہ ریت کا مسئلہ بدستور باقی ہے۔ کہیں ریت کو روکنے کے لیے پٹڑی کے دونوں طرف لکڑی کے تختے لگا دیئے گئے ہیں۔ جیسے کہ برف کو روکنے کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ عبقائق کے علاقے میں پٹڑی بچھانے کا وقت آیا تو بڑی مشکلات پیش آئیں۔ وہاں ریت کے ٹیلے پچاس فٹ سے بھی زیادہ بلند تھے۔ اور وہ ہر وقت جنوبی سمت میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ سوچ بچار کے بعد ریل کی پٹڑی بلند تو وہ باسے رنگ پر بچھائی گئی۔ خالی جگہیں خوب بھر دی گئیں اور ریت کی سطح پر تیل

چھڑک دیا گیا۔ اس تدبیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریت اڑتی ہے تو پٹڑی کے اوپر سے گزر جاتی ہے اور پٹڑی پر نہیں ٹھہرتی۔ پٹڑی کے بیشتر حصے میں ریت کو ہٹانا پڑتا ہے۔ اس غرض سے ہر انجن کے ساتھ بڑے بڑے پنکھے لگا دیئے گئے جو ریت اڑاتے جاتے ہیں۔ ایک اور غیر معمولی مسئلہ یہ تھا کہ آمدورفت آندھیوں میں بھی ملتوی نہ ہونے پائے۔ ریلوے کے سلسلے میں ایک وسیع پروگرام پیش نظر ہے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ دولت سعودیہ کے عرب جلد سے جلد مختلف کاموں میں مہارت پیدا کر لیں تاکہ ریلوے کے زیادہ سے زیادہ عہدے امریکیوں کے بجائے ان کے حوالے ہو جائیں۔ مغربی سمت میں اس لائن کو بحیرہ قلزم تک پہنچا دینے کا مسئلہ بھی زیر غور ہے۔

اس ریلوے کو دیکھ کر امریکیوں کے دل میں اپنے ہاں کے دو نسل پیشتر کے حالات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جب مغربی امریکہ کے بنجر علاقوں کی آبادی شروع ہوئی تھی اور ریل مشرقی سمت سے مغربی سمت جانے لگی تھی۔ تیل کے کارخانے میں کام کرنے والے ایک امریکی نے کہا: "میں نے وہ زمانہ نہیں دیکھا جب ریل پہلے پہل امریکہ کے بحرالکاہل والے ساحل کی طرف جانے لگی تھی، لیکن دولت سعودیہ کی ریل دیکھ کر میرے ذہن میں اپنے ہاں کی ریل کے ابتدائی دور کا تصور پیدا ہو گیا۔"

دولت سعودیہ میں تیل مل جانے کے ساتھ ہی ایک مسئلہ یہ سامنے آ گیا کہ اسے ارزاں نرخ پر یورپ اور دوم میں پہنچانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

اگر سمندر کے راستے پر اکتفا کرتے تو صرف عرب کے اردگرد تین ہزار میل کا چکر

لگانا پڑتا[۱] - نہر سویز میں سے گزرنے کے لئے بائیس سنٹ[۲] فی بیرل محصول ادا کرنا لازم تھا - یہ مصارف برداشت کر چکنے کے بعد تیل کو دوسری کمپنیوں کی جنسوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مناسب قیمت پر فروخت کرنا مشکل تھا۔ اس مشکل کا حل یہ نکالا گیا کہ خلیج فارس سے بحیرہ روم تک پائپ لائن بچھا دی جائے۔ بیچ کے علاقے بڑی حد تک غیر آباد بھی تھے اور ہموار بھی، اس لیے پائپ لائن بچھانے میں کوئی خاص دقت نہ تھی۔ اس لائن کی خاطر ایک نئی کمپنی ۱۹۴۵ء میں قائم ہوئی، جس کا نام ٹرانس اریبین پائپ لائن کمپنی تھا[۳] - اس وقت دنیا کے کسی حصے میں لوہے کا کوئی ایسا کارخانہ نہیں تھا، جو ضرورت کے مطابق تیس انچ کی پائپ لائن تیار کر سکتا اور ارامکو کے لئے لازم ہو گیا کہ کنسالی ڈیٹڈ سٹیل کارپوریشن[۴] کو اس کام کے سلسلے میں سرمایہ کے لئے امداد دے۔ واضح رہے کہ اس سے پیشتر بڑی سے بڑی پائپ لائن تیار ہوئی تھی، وہ چھبیس انچ تھی۔ گیارہ سو میل لمبی پائپ لائن تیار ہو گئی تو اسے بارہ ہزار میل کا بحری سفر طے کر کے خلیج فارس میں پہنچانے کا خرچ

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ راس تنورہ سے مسقط و راس الحد ہوتے ہوئے عرب کے جنوبی و مغربی گوشے یعنی پیرم کے پاس سے بحیرۂ قلزم میں داخل ہو کر سویز پہنچتا تین ہزار میل سے کم نہ ہوگا [۲] سنٹ ایک امریکی سکہ ہے۔ ایک ڈالر میں ایک سو سنٹ ہوتے ہیں۔ ڈالر کی قیمت آج کل پانچ روپے کے قریب ہے [۳] Trans - Arabian Pipe Line Company اس کا نام اختصاراً Tapline مشہور ہوا [۴] Consolidated Steel Corporation

اتنا زیادہ تھا کہ کفایت او ربچت کی مختلف تدبیریں سوچنی پڑیں۔ ایک من چلی کمپنی نے اعلان کیا کہ ہم پائپ کے دو دو سو فٹ لمبے ٹکڑے ڈال کر باہم باندھ کر سمندر میں ڈال دیں گے انھیں کھینچتے ہوئے کمپنی اسے خلیج فارس لے جائے گی۔ ایک تجویز یہ پیش ہوئی کہ فولادی چادریں مشرق قریب پہنچا دی جائیں اور وہیں انھیں موڑ کر پائپ بنا لیے جائیں۔ ارزاں ترین طریقہ یہ ہوگا کہ جمہوریۂ امریکہ نے جو بحری جہاز محفوظ رکھ چھوڑے ہیں، ان میں سے ایک طیارہ بردار جہاز خرید کر اس پر پائپ لائن بنانے کی مشین لگا لی جائے اور جہاز کی زبردست قوت سے کام لے کر مشینوں کو استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک فائدہ یہ بتایا جاتا تھا کہ نصف پائپ بحیرہ روم میں تیار کیا جائے گا اور باقی خلیج فارس میں۔[1]

انجام کار یہی فیصلہ ہوا کہ پائپ بنا کر باربردار جہازوں کے ذریعے سے خلیج فارس پہنچایا جائے۔ نصف پائپ اکتیس انچ قطر کا ہو اور نصف تیس انچ قطر کا۔ تیس انچ والے کو اکتیس انچ والے کے اندر رکھ دیا جائے با ایں ہمہ جہاز والوں کے ساتھ پائپ خلیج فارس میں پہنچانے کا جو معاہدہ ہوا، اتنا بڑا معاہدہ حالت امن میں کہیں نہیں ہوا۔ ہر ہفتے ایک جہاز پائپوں سے بھرا ہوا بھیجا جاتا تھا۔ اور یہ سلسلہ دو سال برابر جاری رہا۔ موقع

[1] مطلب یہ ہے کہ نصف پائپ بحیرۂ روم کے کنارے سے ملک کے اندر بچھنا شروع ہوگا۔ اسے بحیرۂ روم میں بنا کر کنارے پہنچا دینا مناسب ہوگا اور حمل و نقل کا خرچ بہت کم رہ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ خلیج فارس سے بحیرۂ روم تک خشکی میں پائپ پہنچانا سخت مشکل تھا۔ باقی نصف خلیج فارس میں بنا کر کنارے پہ اتار دیا جائے گا۔ تاکہ مشرقی جانب سے کام شروع ہو جائے۔

کی پوری دیکھ بھال کے بعد ماہرین نے بتایا کہ صیدا پہ پائپ لائن کا مغربی منتہا رکھا جائے۔ چنانچہ کچھ دور تک پائپ لائن مغربی سمت سے بھی بچھائی گئی۔ لیکن زیادہ کام مشرقی جانب ہی سے ہوا۔

ایک وقت یہ پیش آئی کہ جس گودی سے ایسا بھاری سامان اتارا جا سکتا تھا، وہ صرف راس تنورہ میں تھی اور وہ گودی ٹینکروں کی وجہ سے رات دن رکی رہتی تھی۔ چنانچہ دولت سعودیہ کے ساحل پہ کوئی اور موزوں مقام تلاش کرنا پڑا۔ شمال میں ایک راس ملی، جسے راس المشعب کہتے ہیں۔ یہ کویت کے غیر جانبدار حلقے کے عین جنوب میں واقع ہے۔ یہاں جہاز ساحل سے دو میل کے فاصلے تک آ سکتے تھے۔ انجنیئروں نے یہاں ایک چھوٹا سا جزیرہ بنا لیا اور وہاں سے پائپ ساحل پہ پہنچانے کے لیئے وہ سلسلہ قائم کیا گیا جسے اصطلاح میں "فضائی کانٹا"[1] کہتے ہیں، یعنی اسی اسی فٹ لمبے فولادی ستون انگریزی کے حرف "A" کی شکل میں کھڑے کر دیئے گئے۔ ان پر موٹے اور بھاری تاروں کا ایک جوڑا لگا دیا گیا۔ ان میں کانٹے لگے ہوئے تھے جو پائپ کے خاصے وزنی ٹکڑوں کو اٹھا کر دو منٹ میں جہاز سے ساحل پہ پہنچا دیتے تھے۔ وہاں سے پائپ چھکڑے پر ڈال کر جوڑنے والی مشین[2] پہ پہنچا دیئے جاتے تھے۔ دو آدمی ایک منٹ میں دو پائپ جوڑ لیتے تھے۔ تین تین ٹکڑے جوڑ کر اور بڑے بڑے ٹرکوں میں لاد کر اس مقام پر بھیجے جاتے تھے، جہاں ان کی ضرورت تھی۔ ایک ٹرک پہ نوے نوے فٹ کے پانچ پائپ لادے جا سکتے

(i) Sky Hook (ii) Welding Machine

تھے۔ جو ٹرک اس غرض سے استعمال کئے گئے، وہ بہت بڑے تھے اور خاص
اسی لیے بنوائے گئے تھے۔ ایک ایک پر پینتیس پینتیس ہزار ڈالر خرچ ہوتے۔ ان
کی بڑائی کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ آدمی کا سر ان کے ریڈیئیٹر کے وسط تک
پہنچتا تھا۔ ان ٹرکوں کے لیئے ٹائر بھی بہت چوڑے اور موٹے بنوائے گئے تھے
اور وہ ریت کے ان خطوں میں سے بے تکلف گزر جاتے تھے جن میں عام موٹر
چلتی تو اس کے پہیئے دھری تک ریت میں دھنس جاتے۔ راس المشعب میں
ایک ریڈیو سٹیشن بھی بنایا گیا جس کے ذریعے سے صحرا کے ان دولیکیروں کے
ساتھ سلسلۂ مخابرت قائم رکھا جاتا تھا۔

جو لوگ راس المشعب جا چکے ہیں، انہوں نے لاحظہ فرما لیا ہوگا۔ کہ پائپ لائن کا جو
کارخانہ بنا ہوا ہے۔ اس میں زیادہ تر کام دولت سعودیہ کے عرب ہی انجام دیتے
ہیں۔ مثلاً فضائی کانٹے سے سامان اتارنا، اسے لاد کر جوڑنے کے لیئے بھیجنا، پھر
از سر نو اسے بڑے ٹرکوں میں سوار کر کے موقع پر پہنچانا۔ راس المشعب کی کایا پلٹنے
میں عربوں کا حصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جولائی ۱۹۴۷ء تک وہاں کیا تھا؟
یا تو وہ پرندے تھے جو مرطوب ریت میں رہتے ہیں[1]، یا اس بنجر ریگ زار میں کہیں کہیں عرب
ماہی گیر یا گلہ بان نظر آ جاتے تھے۔ ایک سال گزر جانے کے بعد راس المشعب میں
ایک خاصی بڑی آبادی مستقل طور پر مقیم تھی۔ ایک ہسپتال بھی بن گیا۔ جس میں
دور حاضر کے تمام سامان موجود تھے اور ایک تفریحی مرکز بھی قائم ہو گیا۔

پائپ لائن بچھانے کے سلسلے میں بھی بہت سے غیر معمولی مسائل سے سابقہ پڑا۔

---

[1] ان پرندوں کو انگریزی میں Sandpipers کہتے ہیں۔

ایک چھوٹی سی نہر کے سوا راستے میں میلوں تک پانی کا کوئی مستقل ذخیرہ موجود نہ تھا۔ نہ اس حصے کا کوئی نقشہ تھا جس میں لائن بچھائی جا رہی تھی اور نہ وہاں مقامات متعین کرنے کے لیئے کوئی نشانات موجود تھے۔ جو پارٹیاں جابجا کام کر رہی تھیں، ان کے مقامات متعین کرنے کے لیئے اکثر زاویہ پیما آلے استعمال کرنے پڑتے تھے۔

پائپ لائن بچھانے کے سلسلے میں تعمیر کا بہت سا سامان مہیا کرنا پڑا۔ مثلاً خندقیں کھودنے والی مشینیں، پچاس ڈیڑھ ڈیڑھ سو ٹن کے ٹرک ٹریکٹر، پانسو ٹریلر، چار بسیں، جن میں سے ہر ایک میں ساٹھ سواریاں بیٹھ سکتی تھیں، دس ٹریلر، جن میں سے ہر ایک میں ساٹھ آدمی سوار ہو سکتے تھے، اسّی ریفریجریٹر ٹرک، پانسو سے اوپر دوسری سواریاں۔ یہ تمام چیزیں صحرا میں سفر کے سامان سے آراستہ تھیں۔

زمانہ حال تک[1] ارامکو تیل کی تفتیش کے سلسلے میں مغرب کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی، یعنی اندرون ملک میں بڑھتی جا رہی تھی، لیکن جب دولت سعودیہ کی حکومت خلیج فارس کے تمام عربی علاقوں کو اجارے میں شامل کر لینے پر راضی ہو گئی تو پھر مغربی جانب قدم بڑھانے کے بجائے، ساحل کے ساتھ ساتھ کاروباری حلقے کی توسیع شروع ہو گئی۔ مدت سے ماہرین ارضیات کی رائے تھی کہ سواحل خلیج فارس کے ساتھ ساتھ تیل کے وسیع ذخیرے موجود ہیں جو سمندر کے اندر تک چلے گئے ہیں۔ کچھ مدت سے پانی کے نیچے برمانے کا فن خاصی ترقی کر گیا تھا۔ مثلاً خلیج میکسیکو میں زمین کے اندر ایک سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ

---

[1] واضح رہے کہ یہ کتاب ۱۹۵۲ء کے اواخر میں مرتب ہوئی تھی۔ لہذا "زمانہ حال" سے ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء سمجھنا چاہیئے۔

سو فٹ کی گہرائی سے تیل نکالا جا رہا ہے اور خیال ہے کہ یہ گہرائی انجام کار دگنی ہو جائے گی۔ خلیج فارس کو دیکھیں تو مشرقی ساحل کے قریب گہرائی کی ایک پٹی چلی جا رہی ہے، باقی خلیج فارس کے بڑے حصے کی گہرائی تین سو فٹ سے بھی کم ہے، بلکہ اکثر مقامات پر ڈیڑھ سو فٹ سے زیادہ تر ہو گی۔ مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جا بجا جزیرے اور چٹانیں ہیں۔ بعض حصے اتھلے اور پایاب بھی ہیں، لہٰذا اس حصے میں فوراً برمانے کا کام شروع کیا جا سکتا تھا۔

۱۹۴۵ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے اعلان کیا تھا۔ کہ ہمارے برّاعظم کا جو حصہ آگے بڑھا ہوا ہے، اس میں چھ سو فٹ تک سمندر کی سطح کے نیچے جتنے طبعی ذخیرے موجود ہیں، ان سب پر ہمیں مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔ خلیج فارس خاصی اتھلی ہے۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے کنارے کی ریاستوں کی زمین کے کچھ حصے آگے بڑھے ہوئے ہیں یا نہیں، پوری خلیج فارس کے متعلق یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک نشیب ہے، جو برّاعظم کی سطح میں پیدا ہو گیا۔ لہٰذا یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ سمندر کے اندر تیل کے جو ذخیرے ہیں، اُن پر اگر کسی کو مالکانہ حقوق حاصل ہیں تو وہ کون ہے؟ ۱۹۴۸ء میں دولت سعودیہ نے اس بارے میں حکومت امریکہ سے رائے لی۔ جواب میں پریزیڈنٹ ٹرومین کے اعلان (۱۹۴۵ء) کا حوالہ دے دیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ اس دستاویز میں جو اصول بیان ہوئے ہیں، ان کا اطلاق خلیج فارس پر کرنے کی صورت کیا ہے۔ چنانچہ ۳۱۔ مئی ۱۹۴۹ء کو دولت سعودیہ کی حکومت نے عربی اور انگریزی میں ایک اعلان شائع کر دیا، جس کا مفاد یہ تھا کہ خلیج فارس والے ساحل کے ساتھ ساتھ سمندر کی تہ میں جتنے طبعی ذخیرے

ہیں، ان کی مالک دولت سعودیہ ہے۔ آئندہ ہفتے شیخ کویت اور شیخ قطر نے شیخ بحرین سے ملاقات کی اور برطانیہ کے پولیٹیکل ریزیڈنٹ کی رہنمائی میں ان تینوں نے ویسے ہی اعلان کر دیئے، جیسا دولت سعودیہ نے کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ان ریاستوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کر لیا۔ جن کے ساتھ برطانیہ کے خاص معاہدے ہیں[1]۔

ان اعلانات میں اصول تو واضح کر دیئے گئے۔ لیکن ان سے زیر آب حدود کا مستقل تعین نہ ہوا۔ اس معاملہ کو شاید دانستہ نظر انداز کر دیا گیا۔ تاکہ آئندہ کسی مناسب موقع پر تمام متعلقہ حکومتیں مل کر مشورے کے بعد حدیں متعین کر لیں۔ تاہم اعلانات کے ساتھ ہی مختلف اقتلے اور پایاب حصوں میں مختلف حکومتوں نے اپنے نشانات نصب کر دیئے۔ ساحل سے ہٹ کر خلیج فارس میں سب سے پہلا تیل کا چشمہ ارامکو نے ۱۹۵۱ء کے اوائل میں نکالا۔ اس سے عرب ملاحوں، ماہی گیروں اور موتیوں کی غواصی کرنے والوں کے لیئے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ وہ پہلے لامتناہی مدت سے خلیج کے ساکن پانیوں کی سطح پر جہاں چاہتے تھے، پھرتے تھے اور جہاں چاہتے تھے مچھلیاں پکڑتے یا غوطے مارتے تھے۔ اغلب ہے بہت جلد عربوں کی دیسی کشتیوں کے تکونے بادبانوں کی جگہ تیل نکالنے والی بھاری مشینوں کے مستقل کھمبے لے لیں۔

تیل کے سلسلے میں حد بندی کے مسائل صرف سمندر کی تہ تک ہی محدود نہیں۔ گزشتہ

---

[1] چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ایک حلقہ ہے جو تعداد میں آٹھ ہیں اور القطیف کے جنوب سے مسقط و عمان کے شمال تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے قطر اور ابوظبی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اصطلاح میں اس پورے علاقہ کو ٹروشیل عمان Trucial Oman کہتے ہیں۔ یعنی وہ شمالی ریاستیں جن کے ساتھ برطانیہ کے معاہدے ہیں۔

چند سال سے دولت سعودیہ اور خلیج فارس کے بعض دوسرے شیوخ کے درمیان بھی جھگڑے پیدا ہو چکے ہیں۔ ابوظبی اور بریمی کی چھوٹی ریاستوں کے باشندوں کا مسئلہ پیش نظر لائیے۔ انھیں کچھ مدت پیشتر تک حدود کا تعین قطعاً معقول معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر اس قسم کی باتیں کہنے کے عادی تھے۔ کہ جب بارش ہو جاتی ہے تو ہم "وادی الف" سے آگے نہیں بڑھتے اور جب خشک سالی سے سابقہ پڑتا ہے تو ہم "وادی ب" تک چلے جاتے ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی قیاسی حد بندیوں کی بنا پر تیل کے چشموں کی ملکیت کا مسئلہ طے نہیں کیا جا سکتا۔ ضروری ہے کہ دولت سعودیہ کے تمام اطراف میں حدیں باقاعدہ نقشے پر متعین کر لی جائیں محض اس پر قناعت نہ کی جائے کہ خانہ بدوش قبائل پھرتے پھرتے ریوڑ چرانے کے لیے آ جاتے ہیں۔ تو وہ ٹیکس شاہ ابن سعود کی حکومت کو دیتے ہیں[2]۔ اگر حدیں متعین نہ کر لی جائیں گی، تو اندیشہ ہے کہ جھگڑے اٹھتے رہیں گے اور جو علاقے گلہ بانی کے دور میں زندگی بسر کر رہے تھے، ان کے یکایک تیل کے دور میں داخل ہو جانے کی تکالیف بڑھتی جائیں گی۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ کوئی حد معین نہیں۔ ایک ریاست کے گلہ بان موسم کی خشکی کے پیش نظر دور دور چل جاتے تھے اور جہاں ان سے ٹیکس مانگا جاتا تھا۔ دے دیئے جاتے ہیں۔

[2] یہ درست ہے کہ اس طرح حدود کا فیصلہ مشکل ہے لیکن جہاں پہلے حدود متعین نہ تھے۔ وہاں اب ان کی تعین کے لیے مختلف اصول پیش نظر رکھے جائیں گے۔ ان میں ایک اصول یہ بھی ہو گی کہ گلہ بان ٹیکس کسے دیتے رہے۔ اصل میں یہ جھگڑا برطانیہ نے کھڑا کیا جو اپنے زیر اثر علاقوں کی حدیں بڑھا کر تیل کے زیادہ وسیع ذخیروں پر قبضہ جمانے کے خیال میں تھا جیسا کہ بریمی کے سلسلے میں واضح ہو گیا۔

اگر تیل نہ نکلتا تو بدوؤں کے سوا کون جزیرہ نمائے قطر میں رہنے پر آمادہ ہوتا؟ اس جزیرہ نما کی تقریباً چار ہزار مربع میل زمین خود عرب کے معیار کے مطابق بھی حد درجہ بنجر ہے۔ بارش چار انچ سالانہ سے کسی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ گرمی کے موسم میں ایک طرف خلیج فارس کی مرطوبیت اور حبس، دوسری طرف صحرا کی ہمہ پرور دھوپ جمع ہو کر زندگی ناقابل برداشت بنا دیتے ہیں۔ مٹھی بھر قطریوں کی زندگی یوں بسر ہوتی ہے کہ کچھ لوگ پایاب اور زیر آب چٹانوں والے پانیوں میں موتیوں کی خاطر غوطے لگاتے رہتے ہیں یا مچھلیاں پکڑتے ہیں، کچھ لوگ جانوروں کے ریوڑ لے کر ان چٹیل اور ناخوشگوار خطوں میں چلے جاتے ہیں، جہاں کچھ چارہ مل سکتا ہے۔ آج کل اس ریاست کی آبادی بیس ہزار سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن جا بجا اجڑی ہوئی بستیوں کے آثار موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ایک زمانے میں یہاں زیادہ آبادی ہوگی۔ قطر کے مشرقی ساحل پر اس کا دارالحکومت واقع ہے جس کا نام دوحہ ہے۔ یہ ایک معمولی اور سادہ سا عرب قصبہ ہے۔ اس کی فصیل جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی ہے اور یہاں متعدد پرانے قلعے ہیں آندھیوں اور بدوؤں کے چھاپوں سے بچاؤ کے یہی دو ذریعے سمجھے جاتے ہیں۔ اس جگہ شیخ قطر رہتا ہے۔ اس کے آباؤ اجداد نے صلح نامے پر دستخط کر کے خلیج فارس میں بحری قزاقی ختم کی تھی۔ اپنے ہمسایوں یعنی معاہد عمانی ریاستوں اور شیخ بحرین کی طرح قطر نے بھی اپنے خارجہ معاملات انگریزوں کے حوالے کر رکھے ہیں۔ شکار اس کا خاص مشغلہ ہے اور وہ اس انتظار میں بیٹھا ہے کہ تیل سے اس کی رائلٹی بڑھ جائے۔ دولت سعودیہ یا بحرین کے ساتھ حدود کے جھگڑوں سے اسے گہری دلچسپی ہے۔ اور اس کا سبب

بالکل ظاہر ہے۔

قطر کے مغربی ساحل پر، دوحہ کے بالکل مقابل دخان واقع ہے۔ جہاں تیل کا چشمہ نکلا ہے۔ وہاں پٹرولیم ڈیویلپمنٹ قطر لمیٹڈ کا کیمپ ہے۔ یہ کمپنی عراق پٹرولیم کارپوریشن کی ایک ماتحت شاخ ہے جس میں نیرایسٹ ڈیویلپمنٹ کمپنی کے ۲۳،۷۵ حصے ہیں۔ نیوجرسی کی سٹینڈرڈ آئل کمپنی اینڈ سکونی۔ ویکیوم آئل کمپنی نیرایسٹ ڈیویلپمنٹ کی مشترکہ مالک ہیں، شیخ قطر نے بحرین میں تیل دریافت ہونے کے بعد ۱۷ مئی ۱۹۳۵ء کو اجارہ منظور کیا تھا۔ چار سال بعد دخان میں تیل کا پہلا چشمہ نکلا، لیکن جنگ عظیم کی وجہ سے اسے بند کر دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں پھر کام شروع ہوا۔ اب اندازہ یہ ہے کہ اس حصے میں دس کھرب بیرل تیل موجود ہے۔ برطانیہ اور امریکہ مل کر اہل قطر اور بدوؤں کی امداد سے تیل نکال رہے ہیں۔ پاس ہی تیل ذخیرہ کرنے کے لیئے بڑے ٹینک نصب کر دیئے گئے ہیں اور تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ بھی قائم ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۱ء سے تیل جہازوں میں لاکھ باہر جانا شروع ہوا۔

تیل کی دریافت نے قطر کے امن میں خلل پیدا کر دیا ہے۔ جولائی ۱۹۴۹ء میں شیخ عبداللہ ابن قاسم کو رائلٹی کی رقم ملی جو ۱۹۱۳ء میں اپنے والد کا جانشین ہوا تھا جس نے ایک سو چار سال کی عمر میں انتقال کیا۔ شیخ عبداللہ نے اس رقم میں اپنے رشتہ داروں کو شریک نہ کیا اور حکمران خاندان میں اختلافات کی آگ بھڑک اٹھی۔ اگست ۱۹۴۹ء میں پہلے شیخ اور اس کے حامیوں کے خلاف ایک

Petroleum Development Qatar (ii) Near East Development Company (iii) Soconv Vacuum Oil Company

مظاہرہ ہوا۔ بعد میں زد و خورد کی بھی نوبت آئی۔ برطانیہ کے پولیٹیکل ایجنٹ نے، جو قطر کے معاملات کا مختار تھا، مداخلت کی۔ شیخ عبداللہ ۲۰۔ اگست ۱۹۴۹ء کو اپنے بیٹے علی کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب میں تیل کی وجہ سے جو پہلا انقلاب رونما ہوا تھا، وہ فرو ہوا۔

ضمیمہ باب

دولت سعودیہ کے متعلق مصنف کا بیان ختم ہو گیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اس سلسلے میں مزید معلومات درج کر دی جائیں، جن کی طرف یا تو مصنف کی توجہ منعطف نہیں ہوئی یا وہ ۱۹۵۳ء کے بعد کی ہیں۔

بڑے شہر

اس وقت جدہ دولت سعودیہ کا سب سے بڑا شہر ہے، حالانکہ پہلے اس کی آبادی بہت کم تھی۔ دولت سعودیہ کے بڑے شہروں کی آبادی کا نقشہ ذیل میں درج ہے:-

جدہ	اڑھائی لاکھ
مکہ مکرمہ	دو لاکھ
ریاض	ایک لاکھ بیس ہزار
مدینہ منورہ	پچاس ہزار

۱۹۵۷ء کے اعداد ہیں۔ بعد کے اعداد ابھی تک مل نہیں سکے۔ یقین ہے کہ

اب تک اس آبادی میں مزید اضافہ ہو گیا ہوگا ۔ ریاض اگرچہ مرکز حکومت ہے
اور اب مشرقی ساحل کی بندرگاہ دمام سے ریاض تک ریل بھی بن گئی ہے جس
کی وجہ سے آمد و رفت میں بہت سہولت پیدا ہو گئی ہے ، تاہم بہ ظاہر اس
کی آبادی میں زیادہ اضافے کا امکان کم ہے ، اس لیے کہ وہ اندرون ملک
میں واقع ہے ۔ تجارت یا کاروبار کا خاص مرکز نہیں ۔ اس کی دو ہی خصوصیتیں
ہیں ، اول یہ مرکز سلطنت ہے ، دوم سوا سو سال سے وہابیت کا مرکز چلا
آتا ہے ۔

مکہ مکرمہ کی آبادی مدت سے دو لاکھ کے لگ بھگ چلی آتی ہے ۔ یہ حرم پاک
کی وجہ سے عظیم ترین اور مقدس ترین اسلامی مرکز ہے ، اسی عظمت و تقدس کے
باعث اس مقام کی آبادی اتنی ہو گئی اور حجاج و زائرین کی متواتر آمد کے
باعث کاروبار کے مواقع بھی خاصے مہیا ہیں ۔ ہزاروں آدمی صرف حجاج و زائرین
کی خدمت و رہنمائی کے سلسلے میں وہاں مقیم ہیں ۔ تاہم آب و ہوا یا موقع اور
محل کے لحاظ سے اس مقام میں کوئی جاذبیت نہیں ۔ مدینہ منورہ آب و ہوا
کے لحاظ سے حد درجہ خوشگوار ہے ۔ خصوصاً وہاں کے عین زرقا کا پانی مختلف
اعتبارات سے ایک نادر شے ہے ۔ تاہم وہ بھی اندرون ملک میں واقع ہے اور
کاروبار کے مواقع وہاں بھی زیادہ نہیں ۔ اس لیے وہاں کی آبادی بھی غالباً زیادہ
نہ بڑھے ۔ ترکوں کے عہد میں ایک مرتبہ آبادی اسّی ہزار تک پہنچ گئی تھی ۔ پہلی
جنگ عظیم کے اواخر میں بہت گھٹ گئی ۔ اب پھر آہستہ آہستہ پچاس ہزار
تک پہنچی ہے ۔

جدہ بندرگاہ ہے۔ وہاں اکثر حکومتوں کے قونصل خانے اور سفارت خانے ہیں۔ مصنف کے قول کے مطابق وہ باب الحج اور سفارتی مرکز ہے۔ غیر مسلم تاجر یا فن کار یا معتقش یا اجارہ دار یا نشو و ارتقا میں امداد دینے والے لوگ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ جا نہیں سکتے۔ جدہ ہی میں ٹھہر سکتے ہیں۔ اس عمومیت کے لحاظ سے جدہ کی اہمیت بڑھ گئی اور اس کی آبادی غیر معمولی ترقی کر گئی۔ اغلب یہی ہے کہ آئندہ یہ آبادی اور بڑھ جائے۔ جس طرح ساحل خلیج فارس کی نئی بندرگاہوں کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ مثلاً راس تنورہ، عقیر، دمام، راس المشعب وغیرہ۔

زراعت

عربی ممالک میں سے دولت سعودیہ اس لحاظ سے سب پر مقدم ہے کہ وہاں زراعت کی ترقی پر ابتدا ہی سے توجہ مبذول رہی تاکہ اہل ملک کی ضرورت کے مطابق مطلوب جنسیں پیدا ہونے لگیں۔ مرحوم شاہ ابن سعود کو ابتدا ہی سے اس کا خاص خیال تھا اور انھوں نے اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی مملکت کے آبی وسائل کا اندازہ کرایا تھا۔ دریا اور ندیاں تو بہت کم ہیں۔ زیر زمین آبی وسائل سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ استخراج کے زراعتی فارموں کا ذکر مصنف نے پوری تفصیل سے خود کر دیا ہے۔

۱۹۵۷ء میں زرعی ترقی کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا تھا جس کے لیئے دس لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم خود وزارت نے منظور کی تھی۔ یہ بھی طے کر لیا گیا تھا کہ مملکت کے چھ حلقوں میں زراعتی مرکز قائم کر دیئے جائیں۔ ان مرکزوں کا وظیفہ

یہ ہو کہ اول دور حاضر کے آلات و وسائل زراعت مہیا رکھے جائیں۔ اچھے بیج جمع رہیں تاکہ حلقے کا ہر ضرورتمند آدمی جب چاہے اور جو چیز چاہے خرید سکے۔ دوسرے جس شخص کو اس کاروبار کے سلسلے میں عملی امداد کی ضرورت ہو اسے پوری امداد دی جائے۔ اس منصوبے کے مطابق کس حد تک کام انجام ہوا ہے اس بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہوئیں حالانکہ ترقیات کے متعلق آخری رپورٹیں بھی دیکھی جا چکی ہیں۔

درآمد و برآمد

دولت سعودیہ میں درآمد و برآمد کے وسیع سلسلے جن ملکوں کے ساتھ قائم ہیں، وہ دو ہیں، اول امریکہ، دوم برطانیہ۔ ۱۹۵۷ء میں جو سامان دولت سعودیہ سے امریکہ گیا، اس کی قیمت سات کروڑ چالیس لاکھ ڈالر سے کسی قدر زیادہ تھی اور جو سامان امریکہ سے دولت سعودیہ میں آیا، اس کی قیمت سات کروڑ انتالیس لاکھ پچاس ہزار ڈالر کے لگ بھگ تھی۔ برآمد میں پیٹرول، قہوہ، چمڑے، کھالیں وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور درآمد میں موٹریں، لوہا یا لوہے کی مصنوعات، لکڑی، کپڑا، مشینوں کا تیل، دوائیں وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ برطانیہ سے جو مال آیا، وہ ستاون لاکھ نوے ہزار پونڈ کا تھا اور اس میں زیادہ تر کپڑا، لوہا، مشینری، دوائیں یا ایسی ہی دوسری چیزیں تھیں۔ جو مال برطانیہ بھیجا گیا، وہ تقریباً پچاس لاکھ پونڈ کا تھا اور بیشتر زیادہ تر پیٹرول تھا۔

انتظامی حلقے

انتظامی لحاظ سے نجد پانچ حلقوں یا صوبوں میں منقسم ہے اور ہر صوبے کے ماتحت متعدد حلقے ہیں۔ جن کی کیفیت ذیل میں درج ہے:-

۱۔ نجد۔ جس کا مرکز حکومت ریاض ہے۔ اس میں مختلف حلقے یا ضلعے شامل ہیں۔ مثلاً :-

ا۔ ریاض کا حلقہ جس میں وادی الدواسر، الافلاج، الحارق، الخرج العارض، الوشم، السدیر شامل ہیں۔

ب:۔ قصیم کا حلقہ جس میں عنیزہ، بریدہ۔ الرس، المذنب وغیرہ شامل ہیں۔

ج:۔ شمالی حلقہ یعنی الحائل جس میں شمر۔ غزہ، مسیطر، تیماً وغیرہ شامل ہیں

۲۔ حجاز:۔ اس کے مختلف حلقے یا ضلعے ہیں مثلاً تبوک، دجہ، ینبوع، مدینہ منورہ، جدہ، لیث، قنفذہ، طائف وغیرہ۔ اس کا مرکز حکومت مکہ مکرمہ ہے۔

۳۔ عسیر: اس کے بھی متعدد ضلعے ہیں دارالحکومت ابہا ہے۔

۴۔ نجران: جس میں اس کے متعلقات شامل ہیں۔

۵۔ الحسا: دولت سعودیہ کا مشرقی صوبہ ہے جو خلیج فارس کے ساحل پر واقع ہے۔ اس میں ہفوف، قطیف، ظہران، قریہ، الجبیل شامل ہیں۔ مرکز حکومت ہفوف ہے۔

نظام حکومت

تمام اختیارات کا مرکز و مرجع بادشاہ ہے یعنی جلالت الملک سعود بن عبدالعزیز

بن عبدالرحمٰن جو ۹۔نومبر ۱۹۵۳ء کو تخت نشین ہؤا۔ اس کا بھائی امیر فیصل بن عبدالعزیز ولی عہد ہے۔ اگرچہ بادشاہ ہی مختار کل ہے۔ تاہم اس نے وزیروں کی ایک مجلس بنا رکھی ہے جن میں سے ہر ایک مختلف محکموں کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہے۔ ۱۹۵۹ء میں وزارت کی کیفیت یہ تھی۔

امیر فیصل بن عبدالعزیز (ولی عہد)	وزیر اعظم و وزیر خارجہ
امیر سلطان بن عبدالعزیز	وزیر مواصلات
امیر فہد بن عبدالعزیز	وزیر تعلیمات
امیر فہد بن سعود	وزیر دفاع
امیر عبداللہ بن فیصل	وزیر داخلہ
شیخ خالد السدیری	وزیر زراعت
شیخ محمد بن عبداللہ علی رضا	وزیر زراعت
شیخ محمد سرور الصبان	وزیر مالیات و اقتصاد
ڈاکٹر ارشاد فاران	وزیر صحت

ان کے علاوہ چھ یا سات وزیر ایسے ہیں۔ جن کے سپرد کوئی محکمہ نہیں مگر ان کا منصب وزیروں کا سا ہے۔

عدالتی نظام

دولت سعودیہ میں تین درجوں کی عدالتیں ہیں:۔

۱۔ محکمات امور مستعجلہ، جن میں معمولی مقدمات پیش ہوتے ہیں۔

۲۔ محکمات الشرعیۃ الکبریٰ:۔ ان میں عام مقدمات پیش ہوتے ہیں۔

۳- عدالت ہائے مرافعہ :- ان میں مقدمات کی اپیلیں پیش ہوتی ہیں۔
ان کے علاوہ ایک مجلس عدالتی امور کی نگرانی کے لیے مقرر ہے، جس کے تین ارکان ہیں۔ انھیں بادشاہ مقرر کرتا ہے۔ یہ مختلف عدالتوں کے کاروبار کی نگرانی کا فرض انجام دیتی ہے۔ حجاز میں دو قاضی القضاۃ ہیں، ایک مکہ مکرمہ کے لیے اور دوسرا مدینہ منورہ کے لیے۔

اخبار، بنک اور بیمہ کمپنیاں

دولت سعودیہ میں کم و بیش نو اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔ ان میں ایک اخبار "قافلۃ الزیت" ظہران سے تیل کی امریکی کمپنی نکال رہی ہے۔ "ام القریٰ" مشہور روزانہ اخبار ہے، جو مکہ معظمہ سے نکلتا ہے۔ ایک ماہوار رسالہ الحج عربی میں نکلتا ہے جس میں حاجیوں کے لیے مفید مضامین و معلومات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ معلومات اردو، فارسی وغیرہ میں بھی شائع کی جاتی ہیں۔
دولت سعودیہ میں کم و بیش نو بنک اور تین بیمہ (انشورنس) کمپنیاں قائم ہیں۔

ریلوے اور بندرگاہیں

ترکوں نے سلطان عبدالحمید کے عہد میں حجاز ریلوے بنائی تھی، جو مدینہ منورہ تک پہنچ سکی۔ آگے اس لیے نہ بڑھائی جا سکی کہ وقت کے شریف نے بدوؤں کو ابھار دیا اور کہا کہ تمھارے اونٹ بیکار ہو جائیں گے اور تم لوگ کھانے پینے کے وسائل سے محروم ہو جاؤ گے، ورنہ اسی زمانے میں ریل مکہ مکرمہ اور جدہ پہنچ جاتی جس سے حج و زیارت میں بہت سہولت پیدا ہو جاتی۔ پہلی جنگ عظیم میں

شریف حسین نے بغاوت کی تو حجاز ریلوے پر سب سے بڑھ کر تباہی آئی ۔ اس لیے کہ کرنیل لارنس کی رائے تھی جب تک یہ ریلوے تباہ نہ ہو گی۔ ترکی فوجوں کی آمد کا سلسلہ ترک نہ ہو سکے گا۔

چند سال ہوتے اس ریلوے کو از سر نو جاری کرنے کے لیئے دولت سعودیہ حکومت اردن اور حکومت شام کے درمیان گفتگو ہوئی تھی اور بعض اصول طے بھی ہو گئے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ اب تک کس قدر اصلاحی کام ہو سکا۔

اس اثنا میں شاہ ابن سعود مرحوم نے اپنی سلطنت کے مشرقی حصے میں دمام سے ریاض تک ریلوے لائن بنوائی جس کا ذکر مصنف خود کر چکا ہے۔ یہ ریلوے لائن تین سو باون میل ہے۔ تجویز یہ تھی کہ اس ریلوے کو بحیرۂ قلزم تک پہنچا دیا جائے چنانچہ راستے کا معائنہ ہو چکا ہے۔ کل نو سو اٹھہتر میل لائن مزید بنانی پڑے گی۔ بحیرۂ قلزم پر علاقہ حجاز میں جدہ کے علاوہ ینبوع ، مُوَیلح ، وجہ اور رابغ مشہور بندرگاہیں ہیں۔ عسیر میں لیت اور قنفذہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ یہ تمام بندرگاہیں مغربی ساحل پر بحیرۂ قلزم میں ہیں۔ مشرق خلیج فارس کی جانب کے ساحل پر عقیر اور قطیف پہلے سے مشہور بندرگاہ تھیں تیل کی کمپنی نے راس تنورہ ، دمام اور راس المشعب کے مقامات پر خاصی عمدہ بندرگاہیں بنا دی ہیں ۔

میزانیہ اور سکہ

۱۹۵۵ء کے بجٹ میں خرچ ایک ارب ، بتیس کروڑ ، پچاس لاکھ سعودی ریال تھا اور اتنی ہی آمدنی تھی جس کا نوے فی صد حصہ تیل کی رائلٹی پر مشتمل

تھا۔ اس میں خاص مدات کی کیفیت مصارف یہ تھی۔

دفاع و پرواز	سینتالیس کروڑ بیس لاکھ ریال
امور عامہ	سولہ کروڑ ریال
مواصلات	نو کروڑ ستر لاکھ ریال
تعلیمات	چار کروڑ چھپن لاکھ ریال
حفظان صحت	تین کروڑ نوے لاکھ ریال

۱۹۵۷ء میں دولت سعودیہ نے بین الاقوامی مالی سرمایہ[1] اور نشوو ارتقا کے بین الاقوامی بنک[2] کی رکنیت قبول کر لی اور اس میں ایک کروڑ ڈالر کے حصے خرید لیے۔

واضح رہے کہ سعودی ریال کے بائیس قرش ہوتے ہیں۔ تین ریال اور سترہ قرش ایک ڈالر کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ سعودی اشرفی چالیس ریال یا چار پونڈ کے برابر ہوتی ہے۔

تعلیمات

۵۷-۱۹۵۶ء میں ملک کے اندر پانسو پرائمری مدارس تھے، جن میں باسٹھ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں مدارس اور تعداد طلبہ میں خاصے اضافے کی امید تھی، مگر صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں ثانوی مدارس قائم ہیں۔ جا بجا فنی مدارس کا افتتاح بھی ہو گیا ہے۔ مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ

---

[1] International Monetary Fund

[2] International Bank for Development and Reconstruction

اور ریاض میں معلمین کی تعلیم کا انتظام بھی کر دیا گیا ہے۔ طلبہ کو بیرونی ممالک میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

علاوہ بریں ریاض میں عربی کا کالج ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں حدیث اور دینیات کی درسگاہیں ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک سعودی کالج بھی ہے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، ریاض اور جدہ میں کتب خانے بھی اعلیٰ درجے کے ہیں۔ مختلف امرا کے ذاتی کتب خانے ان کے علاوہ ہیں۔ تیل کی کمپنی نے بھی اپنے دائرۂ کار میں ملازمین کے بچوں کے لیے بڑے اچھے سکول قائم کر رکھے ہیں۔

مہد ذہب

آخر میں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ "مہد ذہب" میں کان کنی کا کام ۱۹۵۴ء سے روک دیا گیا۔ یہ کام صرف سترہ سال جاری رہا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جو مٹی نکالی جا رہی تھی، اس میں سے سونے کا تناسب روز بروز کم ہو رہا تھا اور آس پاس کوئی نیا ذخیرہ ملا نہیں تھا، جس کے سلسلے میں کام جاری رکھا جا سکتا۔ ایک اور کان بھی دریافت ہوئی تھی، لیکن اس میں سے امید کے مطابق سونا نہ نکلا اور جس کان کنی میں خرچ آمدنی سے بڑھ جائے، اسے کون جاری رکھ سکتا ہے؟

تیل کی کیفیت

یہاں دولت سعودیہ اور دوسرے عرب ممالک کے تیل کے باب میں چند اعداد و شمار پیش کر دینے ضروری ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے، سرزمین عرب کی قدر و قیمت اس اعتبار سے کتنی بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں مختلف ملکوں کے چشموں

سے جو تیل نکلا اس کی کیفیت یہ ہے:۔

کویت	پانچ کروڑ چالیس لاکھ ٹن۔
دولت سعودیہ	چار کروڑ اناسی لاکھ ٹن
عراق	تین کروڑ دس لاکھ ٹن
بحرین	بیس لاکھ ٹن
قطر	اٹھاون لاکھ ٹن

جو ذخیرے دریافت ہو چکے ہیں، ان کی کیفیت بھی ملاحظہ فرمالیجئے:۔

کویت	پانچ ارب چالیس کروڑ ٹن
دولت سعودیہ	چار ارب ستاسی کروڑ ٹن
عراق	دو ارب پینسٹھ کروڑ ٹن

اگر ان میں ایران کے تیل کے تین ارب ساٹھ کروڑ ٹن جمع کر لیے جائیں تو پوری مقدار ساڑھے سولہ ارب ٹن سے کسی قدر زیادہ ہو جاتی ہے عرب کے دوسرے حصول مثلاً قطر عمان وغیرہ کے ذخائر اس میں شامل نہیں۔ خلیج فارس کے پانیوں میں جو ذخیرے اب دستیاب ہو رہے ہیں، وہ بھی مستثنیٰ ہیں۔ اس کے مقابلے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ وینزویلا (جنوبی امریکہ) روس اور مشرقی یورپ کے تمام ذخیرے صرف سات ارب چھتر کروڑ ٹن کے قریب ہیں، یعنی تنہا دولت سعودیہ، کویت، عراق اور دوسرے عربی خطوں کے ذخیرے ہی ریاستہائے متحدہ، وینزویلا روس وغیرہ سے دگنے ہیں۔ دولت سعودیہ کی رائلٹی پچپن سنٹ فی بیرل ہے۔

دسواں باب :

ربع الخالی میں اکتشافی مہمیں

جزیرۃ العرب کی کوئی داستان اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جا سکتی جب تک تین برطانوی مکتشفوں کے شاندار مگر مدورجہ خطرناک سفروں کا ذکر اس میں شامل نہ کر دیا جائے۔ ۱۹۳۱ء میں برٹرام ٹامس[۱] نے ربع الخالی کو عبور کیا۔ اس سے دوسرے سال فلبی نے اس وسیع ریگ زار کے شمالی و مغربی حصوں میں چکر لگائے۔ ۱۹۴۶-۴۸ء میں تھیسی گر[۲] کے سفروں نے عرب میں تفتیش و اکتشاف کے عظیم الشان کارناموں کو آخری منزل پہ پہنچا دیا۔ ٹی۔ ای۔ لارنس نے ٹامس کی نہایت عمدہ کتاب "عرب آبادانی[۳]" کے پیش لفظ میں لکھا تھا۔

(i) Bertram thomas (ii) Thesiger (iii) Arabia Felix

کتاب کا انگریزی نام۔ زمانہ قدیم کے مصری جغرافیہ دان نے عرب کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ عرب آبادان یا العرب السعیدہ، عرب ریگستان یا عرب الرمال (Arabia Deserta) عرب سنگستان یا عرب الحجر (Arabia Petra)

بہت تھوڑے آدمی اس قابل ہوتے ہیں کہ کسی بڑے تاریخی دور کو اختتام پر پہنچا دیں۔ ہم نہیں جان سکتے کہ پہلا شخص کون تھا، جو نئے حالات اور نئی معلومات کی خاطر زمین کے ان حصوں میں چلا پھرا جہاں پیشتر کسی کا قدم نہیں پہنچا تھا، لیکن یہ جانتے ہیں کہ ٹامس اس قافلے کا آخری فرد ہے اور اس نے سفر بھی پرانے طریق پر کیا۔ اپنے اونٹ کی ٹانگوں کو زحمت دی، اپنے بل پر، اپنا وقت اور روپیہ خرچ کر کے کیا وہ ہوائی جہاز میں پرواز کر سکتا تھا۔ موٹر کار میں بیٹھ سکتا تھا۔ ٹرک میں سوار ہو کر پھر سکتا تھا، لیکن اس نے آخری وقت پہ گامزنی کی آخری فتح حاصل کی اور ہمارے ذمے جو فرض عائد تھا۔ اس سے ہمیں سبکدوش کر دیا ....

زندہ باد ٹامس[1]۔

برٹرام ٹامس خلیج فارس کے علاقے کا ایک برطانوی افسر تھا، جو مسقط کی ریاستی مجلس میں وزیر کی خدمات بھی انجام دے چکا تھا۔ وہیں موجودہ صدی کے تیسرے عشرے کے اواخر میں ٹامس پر اس غیر معلوم ریگ زار کا جادو چل گیا، جو عرب کے جنوبی حصے میں شمالاً جنوباً چار سو میل اور شرقاً غرباً آٹھ سو میل کی وسعت میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ موسم گرما میں رخصت لے کر ہندوستان کے خنک پہاڑی علاقوں میں راحت کی زندگی بسر کر سکتا تھا، مگر اس نے گرمیاں مسقط ہی میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور سردیوں کے موسم میں رخصت لے کر وہ جنوبی عرب میں سفر کرتا، اسی موسم میں صحرائی علاقے کا چکر لگایا جا سکتا تھا۔

---

[1] کتاب مذکورہ ص ۱۱

ورنہ وہاں کی بے پناہ حدت میں نقل و حرکت کا کون سا امکان تھا ؟ ۲۸-۱۹۲۷ء
کے سرما میں اس نے اونٹ کی سواری پر عمان اور ظفار کے جنوبی ساحل کا چکر
لگایا - دو سردیاں گزر گئیں تو ظفار کے شمال میں ربع الخالی کے بیرونی کنارے
تک کا علاقہ دیکھا - اس سے پیشتر وہاں کسی فرنگی کا قدم نہ پہنچا تھا -

اکتوبر ۱۹۳۰ء میں وہ آخری عزم لے کر ظفار پہنچا تو تجربات کی دولت
سے حصۂ وافر اس کے پاس فراہم ہو چکا تھا - وہاں پہنچ کر اپنے شناسا
بدوؤں کو تیز رفتار اونٹوں کے قافلے کی تیاری پر خفیہ خفیہ آمادہ کر لینے
میں ہفتے گزار دیئے - خاصے انتظار کے بعد حیب یہ نظر آنے لگا کہ شاید ٹامس
کو کشتی میں سوار ہو کر مسقط واپس جانا پڑے گا - تو اچانک بدوؤں کا ایک
گروہ شمالی جانب سے سواری کے اونٹ لے کر پہنچ گیا - وہ لوگ ٹامس کو صحرا
میں سے لے جانے کے لیئے بالکل آمادہ تھے - کھانے کے لیئے صرف آٹا، کھجوریں
چاول، مکھن یا بہت تھوڑی دوسری چیزیں لے لی تھیں - کوئی خیمہ بھی ساتھ
نہ لیا - تاکہ بوجھ زیادہ نہ ہو جائے -

ظفار سے شمالی جانب روانہ ہوئے - پہلے ساحلی میدان میں سے گزرے
پھر پہاڑ کا دامن آ گیا جہاں گھاس اُگی ہوئی تھی - راستے میں عجیب و غریب
غار اور پانی کے جوہڑ ملتے تھے - وادیوں میں آدمی لوبان جمع کر رہے تھے تا
تاکہ مشرق کے بندروں کے لیئے باہر بھیجا جا سکے - یہ کام وہ تین ہزار سال
سے انجام دے رہے تھے - یہاں جگہ جگہ زمانہ قدیم کی تحریرات مقبروں کی تختیوں
پر کندہ دیکھیں - ٹامس کا خیال ہے کہ وہ قبروں کی لوحیں تھیں - یا ممکن ہے

یہ تحریریں قدیم سبائیوں کی ہوں۔ جو ستاروں کی پوجا کرتے تھے۔
قافلے کی رفتار سست تھی۔ جہاں اچھی چراگاہ نظر آتی، پڑاؤ نہ پڑتے تاکہ جانوروں کو خوب چارہ کھلالیں۔ آگے آنے والے خطے سراسر خشک اور بے آب تھے۔ رفتہ رفتہ خشک وادیاں آنے لگیں، پہاڑیاں ختم ہو گئیں اور سامنے دور دور تک میدان ہی میدان نظر آتا تھا۔ بدو کھانے کی چیزیں تو مل جل کر اور بانٹ کر کھا لیتے تھے۔ مگر اونٹوں کو ہر شخص بہتر سے بہتر جگہ چرانے کی کوشش کرتا تھا۔ اب ایک سو میل تک ایسے علاقے میں سے گزرنا پڑا جو کسی حکومت کے زیر اثر نہ تھا۔ چونکہ یہاں ہر وقت چھاپے کا خطرہ تھا۔ اس لیئے بدوؤں نے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھنی شروع کیں۔ وادی عمان سے آگے بڑھے تو بدوؤں نے ایک جگہ اونٹوں کے پاؤں کے نشان بتائے، ساتھ ہی کہا کہ یہ بہت پرانے زمانے سے چلے آتے ہیں۔ اور مقام کی خشکی و بے آبی کے باعث محفوظ رہے ہیں۔ رہبروں نے بتایا کہ یہ اوبار کا راستہ تھا، جو ایک زمانے میں مشرقی عرب کا بڑا شہر تھا۔ اور شمال سے جنوب کی طرف آنے والے قافلوں کے راستے میں پڑتا تھا۔ اب وہ ریت کے ٹیلوں میں دب گیا ہے۔ ایک نے ذکر کیا کہ میں لڑکپن میں عرب کا یہ حصہ خوب دیکھ چکا ہوں۔ عجیب و غریب پتھر دیکھے، جن کے کنارے دندانے دار تھے۔ نیز جگہ جگہ ظروف گلی کے لال اور پیلے ٹکڑے اور دوسری کئی چیزیں ملیں، جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ایک زمانے میں یہ حصہ خوب آباد تھا۔
ٹامس کے لیئے چھان بین اور تحقیقات کا کوئی موقع نہ تھا۔ البتہ اس کے

دل میں یہ خیال ضرور پیدا ہوا کہ ممکن ہے پاؤں کے نشان کسی ایسے قافلے کے ہوں جو لوبان لے کر خلیج فارس کی جانب نکل گیا ہو۔ یمن کے شہر مارب کو عرب کے آثار قدیمہ کا سب سے بڑا تحفہ سمجھا جاتا ہے گم شدہ آبادکے معمے کا حل ایک بہت بڑے راز کا انکشاف ہوگا۔

آگے علاقہ خشک سے خشک تر ہوتا گیا۔ پہلے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کے ہموار میدان ہیں۔ پھر کنکر والی زمین آگئی۔ بعد ازاں کوہ نما تودہ ہائے ریگ شروع ہو گئے۔ وہاں ٹامس نے پہلی مرتبہ ایک آواز سنی جو موسیقی کے بھاری سُر کی سی تھی، جیسے درمیانے درجے کے دخانی جہاز کی سیٹی ہوتی ہے۔ یہ ریت کے سنسنانے کی آواز تھی جسے عموماً "گانے" یا "گنگنانے" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بہت سے سیاح اس کا ذکر کر چکے ہیں۔

بڑا دن آیا تو ٹامس نے تیل سوپ کے ساتھ اُبلے ہوئے لوبیا کا ایک ڈبہ کھولا جو خاص تقریبات کے لیئے ساتھ لے لیا تھا۔ اب وہ اونٹ بالکل تھک چکے تھے جو ظفار سے ٹامس کرائے کر چلے تھے۔ لہٰذا انہیں کرایہ دے کر واپس کر دیا گیا اور مرہ قبیلے کے سردار شیخ محمد ابن ہادی کے ذریعے سے نئی سواریوں کا انتظام کر لیا گیا۔ چنانچہ ٹامس بیس آدمیوں کی ایک جماعت کے ساتھ ریگستان دکا کا کی جانب روانہ ہو گیا۔ ایک ہفتہ سفر کر چکنے کے بعد وہ شنا نام کنوئیں پر پہنچ گیا جو اندازہ کے مطابق منزل مقصود یعنی دوحہ (دارالحکومت قطر) سے تین سو تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ شنا پہنچ کر جماعت میں تیرہ آدمی چُن لئے گئے۔ تیرہ اچھے اونٹ لے لیئے گئے، پانچ اونٹ باربرداری کے لیئے

رکھے جن پر تیس دن کے کھانے پینے کا سامان لادا گیا۔ پورے قافلے میں قطر کے مرہ قبیلے کا صرف ایک آدمی تھا جو اس سال اس ریگ زار میں سے گزرا تھا۔
تیسرے روز وہ آخری آبادی سے گزر گئے۔ یہ آبادی کیا تھی؟ مرہ قبیلے کے ایک آدمی نے دو چھوٹے چھوٹے خیمے لگا رکھے تھے۔ اس قبیلے کا گزارا صرف کھجوروں اور شیر شتر پہ ہے۔ ان کے نزدیک بہترین غذا یہ ہے کہ اونٹ کی کلیجی نمک لگا کر تازہ تازہ کھا جائیں۔ صحرا میں ہرن بھی مل جاتے ہیں۔ کوئی مل جائے تو اس کے کباب کھاتے ہیں۔ ان کی عورتیں لق ودق صحرا میں بھی برقع پہنتی ہیں۔ وہ مسلسل گشت کرتے رہتے ہیں۔ جہاں چارہ پاتے ہیں، چند روز کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ کبھی کبھی صحرا کی سنسان خلوت سے اچانک باہر نکل کر قافلوں پر چھاپے مارتے ہیں۔ جب لوٹ کا مال مل جاتا ہے تو پھر ریگ زار میں اتنی دور نکل جاتے ہیں، جہاں کوئی ان کا تعاقب نہیں کر سکتا۔
انھیں کھوج اور رہبری میں کمال حاصل ہے۔ پاؤں کا نشان دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ اونٹ کالے رنگ کا ہے یا سفید رنگ کا، عورت دوشیزہ ہے یا منکوحہ، آدمی بوڑھا، تجربہ کار اور جنگجو ہے یا ناتجربہ کار نوجوان۔ عربوں میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ مرہ قبیلے کے کسی آدمی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ... تین روز صحرا میں لیے پھرو۔ رات کی تاریکی میں اسے حکم دو کسی جگہ ریت میں روپیہ دبا دے۔ پھر اسی حالت میں اسے لے کر کسی دوسری طرف نکل جاؤ وہ دس برس کے بعد بھی لوٹے گا، تو جگہ تلاش کر کے دبایا ہوا روپیہ نکال لے گا۔

اس مقام سے آگے پانی خراب ملنے لگا۔ ٹامس نے پانی کے بجائے اونٹ کا دودھ پینا شروع کر دیا۔ چھاپوں کا خطرہ کم ہو گیا تھا۔ مگر موسم کی حدت بڑھ رہی تھی۔ جس سے ٹامس کی جسمانی قوت پر خاصا اثر پڑا۔ وہ شام کے وقت بدوؤں کے حلقے میں بیٹھ جاتا اور ان کی باتیں سنتا۔ ایک بدو نے بتایا کہ چار سال پیشتر میں اس حصے میں رہ چکا ہوں۔ راستے میں جو ہے جنگلی بلّے اور چیتے بھیڑیے بھی نظر آئے۔ ایک جگہ لومڑی بھی دیکھی۔ عقاب کا ایک بہت بڑا گھونسلا ملا جس میں انڈے بھی تھے۔ مگر بدو عقاب کے انڈوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔

مزید نو روز کے سفر کے بعد قافلہ سفید ریت کے خطے میں پہنچ گیا۔ جسے سنام[1] کہتے ہیں۔ یہاں میٹھا پانی ملا، مگر بعض کنوئیں نوّے نوّے فٹ گہرے تھے۔ دوسرے دن رمضان شروع ہو رہا تھا[2]۔ اگرچہ عربوں کو سفر میں روزہ قضا کر لینے کی اجازت تھی مگر کوئی بھی اس کے لئے تیار نہ ہوا۔ سفر کی مشکلات سے بالکل بے پروا ہو کر سب نے روزے رکھے۔ اس سے ان کے مذہبی عقائد کی پختگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

آگے سردی بہت بڑھ گئی۔ پھر آندھی آ گئی۔ جس سے درجہ حرارت چالیس سے گر کر تیس پر آ گیا۔ ٹامس کے متحرک کیمرے میں ریت گھس گئی۔ سردی کی شدت کے باعث ہاتھوں میں لکھنے کی سکت نہ رہی۔ غرض اٹھارہ روز مسلسل تیز سفر کرتے

---

[1] یہ نام سنام نہیں سنام ہے (سین پر زبر) جس کے معنی کوہان کے ہیں۔ ٹامس نے اپنی کتاب میں سنام ہی لکھا ہے۔ معلوم نہیں موجودہ کتاب کے مصنف سے یہ غلطی کس وجہ سے سرزد ہوئی (ملاحظہ ہو Arabia Felix "عرب آباد" از ٹامس صفحہ ۲۴۰ سطر ۲۱)۔

[2] رمضان تھا۔ جو ۲۰ جنوری ۱۹۳۱ء سے شروع ہوا۔

کرتے اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں ریت ختم ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر آرام کیا۔

رہبر نے ٹامس کو بتایا کہ اونٹوں کی سب سے بڑی تعداد مرہ، مناصیر اور منشل قبیلوں کے پاس ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء تک ان لوگوں میں بہت لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ پھر ابن سعود کی ہیبت اور ہفوف کے گورنر عبداللہ ابن جلوی کے کے خوف سے لڑائیوں کا سلسلہ بہت محدود ہو گیا۔ آگے بڑھے تو برطانی سلطنت کی حد شروع ہو گئی۔ اس حصے میں جو رہبر ملا، وہ عموماً پانی ملنے کی جگہوں کو چھپاتا ہوا چلا گیا۔ خیال غالباً یہ تھا کہ جو مقامات اس کے قبیلے کے لئے ضروری ہیں ان کا راز کسی پر افشا نہ ہونے پائے۔

غرض اسی طرح چلتے چلتے ایک جھیل[1] پر پہنچ گئے، جو کم و بیش سات میل لمبی تھی۔ یہاں سے قطر کا علاقہ ..... شروع ہو گیا۔ قطر ایک زمانے میں جزیرہ نما نہیں بلکہ جزیرہ تھا پھر آہستہ آہستہ سمندر خشک ہو گیا۔ جھیل اس کے باقیات میں سے ہے۔ اس کے کنارے نمک کی پٹی بنی ہوئی تھی۔ اب اونٹ اور ریوڑ نظر آنے لگے۔ حوصلے بلند ہو گئے۔ دوحہ کے قلعے کی بدہیئت دیواریں نمودار ہوئیں ٹامس اپنی مہم میں کامیاب ہو گیا۔ ایک فرنگی نے پہلی مرتبہ ریت کے اس بے پناہ سمندر کو عبور کر لیا، جسے ربع الخالی کہتے ہیں۔

---

[1] اس جھیل کو "سبخۃ العمرا" کہتے ہیں۔ قطر کے جنوب مشرق میں یہ خلیج سلویٰ سے ملتے قریب ہی یہ جھیل واقع ہے۔ اس کے پاس سے راستہ سیدھا قطر کے دارالحکومت دوحہ کو جاتا ہے جو ربع الخالی کے سفر کے بعد ٹامس کی منزل مقصود تھا۔

یہ امر تعجب انگیز ہے کہ اکثر بڑے کارنامے متوازی انداز میں انجام پاتے ہیں - ایک سائنس دان زندگی کا نصف حصہ ایک منصوبے کی تکمیل میں بسر کر دیتا ہے - اچانک دوسرا آدمی اُٹھ کر چند مہینے پہلے اسے دریافت کر لیتا ہے۔ کپتان سکاٹ[1] قطب جنوبی پر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ شیکلٹن[2] اس سے چند مہینے پہلے پہنچ چکا تھا۔ برٹرام ٹامس نے ربع الخالی کو عبور کر کے وہ مہم پوری کر دی جس کے لیئے اس کا ہم وطن سینٹ جان فلبی سالہا سال سے جدوجہد کر رہا تھا۔ فلبی اپنی کتاب "ربع الخالی" میں لکھتا ہے کہ میرے پندرہ سال اسی تمنا میں گزر گئے اور میں دبے پاؤں اس شکار کے تعاقب میں لگا رہا، جس کا جوڑ جوڑ الگ کر کے اب میں نے خوانندہ کتاب کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ میں اپنے منصوبے کے تمام حصے پورے نہ کر سکا - لیکن اتنا کہہ چکا ہوں کہ دل مطمئن ہے۔ یہ بھی نہیں کہ میں اس میدان میں سب سے پہلے اترا - تقدم و سبقت کا اعزاز میرے ایک دوسرے ہم وطن کو حاصل ہے - یہ سہرا برٹرام ٹامس کے سر بندھا -

برٹرام ٹامس نے ربع الخالی کو جنوباً شمالاً عبور کیا تھا - اس سے قریباً گیارہ مہینے

---

[1] Robert Scot ۱۸ جنوری سنہ ۱۹۱۲ء کو ایک پارٹی کے ہمراہ قطب جنوبی پر پہنچا - واپسی کے سفر میں ۱۷ - مارچ کو وہ اور اس کے ساتھی سردی کی شدت اور ہوا کی تیزی کے باعث مر گئے -

[2] Ernest Shakleton سکاٹ سے کچھ دن پہلے قطب جنوبی پہنچا تھا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں تحقیقات کے لیئے قطب جنوبی گیا ہوا تھا - وہیں وفات پائی۔

[3] Empty Quarter جو ربع الخالی کا لفظی ترجمہ ہے۔ یعنی عرب کا وہ چوتھائی حصہ جو آبادی سے بالکل خالی ہے -

بعد فلبی ۱۱ جنوری ۱۹۳۲ء کو اس عزم کے ساتھ روانہ ہوا کہ اسے شمالاً جنوباً عبور کرنے
اس کی جماعت قطر سے چلی۔ اور نخلستان یبرین میں پہنچ گئی، جو قطر سے جنوب مغرب
میں واقع ہے۔ جماعت میں کل انیس آدمی تھے۔ بنو مرہ، مناصیر اور عجمان میں سے
تھے۔ فلبی نے اپنے لیے تین خاص خادم بھی لے لیے تھے۔ ایک کے ذمے اونٹوں کا
انتظام تھا، ایک قہوچی تھا اور ایک باورچی تھا۔ ساتھ بتیس سانڈنیاں تھیں جن
میں سے ایک کے سوا تمام کی تمام عمانی نسل سے تھیں۔ تین مہینے کا راتب ساتھ رکھا
تھا، زیادہ تر کھجوریں اور چاول۔ قطر اور یبرین کے وسط میں یہ قافلہ وادی سہبا
میں سے گزرا جو زمانہ قدیم میں عرب کا بہت بڑا دریا تھا، اب مدت سے بالکل خشک
ہے۔ یہ دریا نجد کی سطح مرتفع میں سے نکل قطر کے قریب خلیج فارس میں گرتا تھا۔
پانسو میل تک اس کے بہاؤ کا پتا لگایا جا چکا ہے۔

یبرین میں قافلے نے تین روز قیام کیا۔ ربع الخالی کی شمالی سمت میں یہ تہذیب
کی آخری چوکی تھی۔ عربوں کے گیتوں اور داستانوں سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ
یبرین ایک زمانے میں بڑا بارونق شہر تھا۔ یہ یقین کرنے کے وجوہ موجود ہیں
کہ ایک ہزار سال پیشتر خلیج فارس کی ایک کھاڑی اس کے قریب تک پہنچی ہوئی
ہوگی، اس لیے کہ یبرین میں تاڑ کے درخت اب تک موجود ہیں۔ یہاں بہت سے مکانوں، چھوٹے چھوٹے
قلعوں اور قناتوں یعنی زمین دوز آبی نالیوں کے باقیات اب تک موجود ہیں۔ مرحوم شاہ ابن سعود
نے وہاں اخوان کو آباد کرنے کی کوشش کی تھی، مگر ان میں سے اکثر بخار میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے
۱۹۴۱ء میں آرامکو نے وہاں ڈی۔ ڈی۔ ٹی چھڑکنے کا انتظام کیا تھا تاکہ نخلستان سکونت کے قابل ہو جائے۔
فلبی کی پہلی منزل مقصود یقیناً تھی، جس کے متعلق افواہ تھی کہ وہاں ایک

خاصی بڑی آبادی کے کھنڈر رہیں۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ محض ایک کنواں ہے جو ایک سو ستر فٹ گہرا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کنواں عام بدوؤں سے بہتر انجنیروں نے تیار کیا ہوگا۔ عام دستور یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق پانی لے چکنے کے بعد صحرائی لوگ کنوئیں پہ لکڑیاں رکھ کر کھالوں سے ڈھانپ دیتے ہیں تاکہ متحرک ریت کے تودے اسے تباہ نہ کر دیں۔ یہاں نلبی کو متحرک پتھر دکھائے گئے اور بتایا گیا کہ یہ اپنے اندر کی خاص قوت کے بل پہ چلتے ہیں۔ مگر اغلب ہے وہ اس لئے حرکت میں آتے ہوں کہ ان کے نیچے کی ریت اڑنے لگتی تھی۔

بدوؤں کے نزدیک وسیع صحرا کی حیثیت گھر کے آنگن سے زیادہ نہیں۔ مرہ قبیلے کا ایک بدو نمیلا نامی کنوئیں پہ پہنچا تو بولا کہ میں بچپن میں یہاں آیا تھا اور اپنے کھلونے ریت میں چھپا دیئے تھے۔ چنانچہ اس نے ایک جگہ جاکر کھودی اور وہیں کے قریب مٹی کے گول اور صاف کھلونے نکال لایا۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک سوراخ تھا۔ عرب بچے ان سے ایک کھیل کھیلتے ہیں، جس کا نام "دُرّاج" (پہیے) ہے۔

برٹرام تامس کی طرح نلبی نے بھی گم شدہ شہروں کے بہت سے افسانے سن رکھے تھے۔ اس کا سب سے بڑا رہبر علی بن جعبن تھا جس کا تعلق مرہ قبیلے سے تھا۔ نلبی نے اس سے یہ ذکر کیا تو اس نے ایک گیت سنا دیا جس کے ایک حصے کا مفہوم یوں پیش کیا جا سکتا ہے:-

قریہ سے سورج کی شعاعیں شہر پہ پڑ رہی ہیں
اگر تیرا رہبر اب اسے (شہر کو) بے سود تلاش کر رہا ہے تو اسے الزام نہ دے
اس لئے کہ ہلاک کرنے والی قوت نے شہر کو زمین بوس کر دیا۔

نہ سوتی عبا و قبا پہننے والے باقی رہے اور نہ ریشمی پیراہنوں والے۔

فلبی کو ہر حال میں ادبار یا دبار نام کے پُراسرار شہر کی تلاش تھی۔ حبیب علی سے معلوم ہُوا کہ وہ شہر کے کھنڈروں سے آگاہ ہے، تو فلبی کو بہت خوشی ہوئی۔ چلتے چلتے وہ ایک چڑھائی پر پہنچے، جہاں سے کھنڈر قریب تھے۔ فلبی لکھتا ہے:۔

جب میں اس اونچے مقام کے بلند ترین حصے پر پہنچا تو ایک لمحے میں دبار کے افسانے کی حقیقت منکشف ہو گئی۔ جس مقام پر قدیم شہر کے کھنڈر بتائے جاتے تھے، میں نے اس پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ آتش فشاں پہاڑ کے دو دہانے پہلو بہ پہلو کھڑے ہیں۔ ایک زمانے میں زمین کے جوف سے لاوے اور کھنگروں کا جو طوفان ابل کر ان دہانوں کے راستے باہر نکلتا تھا، وہ آس پاس پھیلا ہوا تھا اور دہانے نصف حصے تک ریت سے اٹے پڑے تھے۔ بہ ہر حال اس وقت میرے دل کا تاثر یہی تھا..... میں نے سوچا "یہ تھا وبار، ریگ زار میں ایک آتش فشاں....... عظیم الشان ریگ زار کے معمے کا اس درجہ سنسنی پیدا کرنے والا حل کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے ریت سے اٹے ہوئے ان دہانوں کو دیکھ کر جن کے ارد گرد کھنگروں کی بلند دیواریں کھڑی تھیں، بدوؤں نے ربع الخالی میں گم شدہ شہر کا افسانہ تیار کر لیا اور اسے دیکھا جائے۔ تو جس مقام کو وبار کہا جاتا ہے، وہ واقعی انسان کے بنائے ہوئے قلعے معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم ادبیات عرب میں گم شدہ شہروں کی جو داستانیں مشہور ہو گئیں، وہ محض آتش فشاں دہانوں پر مبنی ہوں گی، بلکہ ان کی کچھ حقیقت بھی ہونی چاہیئے۔ اور برٹرام ٹامس نے ادبار جانے والے جس راستے کا ذکر کیا ہے، وہ ان

دہانوں کے جنوب مشرق میں کم و بیش دو سو میل پر ہوگا۔[1] ۱۹۳۲ء میں ارامکو کی ایک جماعت تفتیش کے لیئے نکلی تھی۔ اس نے بھی ایک تباہ شدہ شہر کے کھنڈر دیکھے تھے۔ گویا ایک نئے دبار وں کا ذکر آچکا ہے۔ اور ربع الخالی کا یہ معما بھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا۔

دبار سے فلبی تھوڑی دور ایک طرف کو نکل گیا اور اس راستے کو بھی قطع کیا جس سے برٹرام ٹامس شیشر جہ کے جنوب میں سے گزر چکا تھا۔ مرہ قبیلے کے رہبروں نے گزر کے نشان بتائے۔ اگرچہ اس سفر پہ ایک برس گزر چکا تھا، مگر رہبروں نے بتایا کہ یہ نشان ہر شبہ سے بالا ہیں۔ جنوبی سمت میں مزید چند منزلیں طے کر چکنے کے بعد فلبی کا قافلہ نعیر نعیفا پہ پہنچا جس کے ارد گرد ریت کے بڑے بڑے ٹیلے کھڑے تھے اور اس مقام کی حیثیت ایک "امفی تھیئٹر" کی سی ہو گئی تھی۔[2] یکایک اس میں سے بھاری آواز آنے لگی، جو جہاز کی سیٹی یا ہوائی جہاز کے انجن سے چنداں مختلف نہ تھی، لیکن اس آواز میں موسیقی تھی۔ وہ مسرت انگیز تھی اور اس میں حیرت انگیز انداز کا ترنم تھا۔ یہ ریت کے گنگنانے کی صدا تھی، جو ایک سال پیشتر ٹامس بھی سن چکا تھا۔ فلبی نے اس کے متعلق مختلف تجربے کیئے۔ وہ ٹیلوں پہ چڑھ گیا۔ اور نرم و ملائم ریت

---

[1] برٹرام ٹامس اور سینٹ جان فلبی دونوں نے اپنی کتابوں کے آخر میں طریق و مقامات سفر کے مفصل نقشے دیئے ہیں۔ انھیں دیکھنے سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ٹامس کو جہاں دبار یا وبار کا نشان بتایا گیا تھا، وہ فلبی کے دریافت کردہ وبار سے خاصا دور ہے۔

[2] Amphitheater یعنی رومۃ الکبریٰ کا وہ مدور یا بیضوی اکھاڑا جس میں اردگرد درجہ بدرجہ نشستیں بنی ہوتی تھیں اور تماشائی بیٹھا کرتے تھے۔ بیچ کے میدان میں کھیل یا خونخوار جانوروں سے لڑائیاں یا کشتیاں وغیرہ ہوتی تھیں۔

کو نیچے کی طرف دھکیلتا تو آواز دو تین منٹ تک آتی رہتی، لیکن دوسرے روز صبح کے وقت یہ تجربہ دہرایا تو قطعاً کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ اس طرح واضح ہو گیا کہ اس عجیب و غریب آواز کو درجہ حرارت، ریت کی نمی اور ہوا کے رخ سے خاص تعلق ہے۔ ممکن ہے ٹیلوں کی وضع قطع بھی اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کرتی ہو بہر حال یہ امر مزید تحقیق کا محتاج ہے۔

جنوبی سمت میں فلبی کی آخری منزل ظفر شنا تھی۔ یہ کنواں اس کے رہبر علی بن جہان نے ۱۹۳۰-۳۱ء میں کھدوایا تھا جب اس کے بہت سے ساتھی خیمے اور اونٹ لے کر جمع ہو گئے تھے۔ مرہ قبیلے کے لوگ سرمائیں عموماً شمال کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اس زمانے میں ابن سعود اور اخوان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی۔ اور مرہ قبیلے کے ایک حصے نے اس سے الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شیخ علی نے پانی کے لیے ایک نشیب تجویز کیا پچپن فٹ زمین کھودی تو پانی نکل آیا۔ اس حصے میں بدوؤں کے تعلقات سخت بگڑے ہوئے ہیں۔ اور ایسے کنوئیں پر کسی کا چوبیس گھنٹے سے زیادہ ٹھہرنا بد تہذیبی سمجھا جاتا ہے۔ فلبی نے وہاں دو روز آرام کیا۔ اس لیے کہ وہاں سے وہ مغربی جانب روانہ ہونا چاہتا تھا۔ تاکہ ربع الخالی کے وسطی حصے کو قطع کرتا ہوا ریاض کے جنوب میں جبل طویق پہ پہنچ جائے۔ ٹامس بھی ظفر شنا پر ٹھہرا تھا۔ اور وہاں اس نے اپنے ساتھیوں کے لیے ایک اونٹ ذبح کرایا تھا۔ یہیں سے اس نے قطر تک تین سو تینتیس میل کا سفر شروع کیا تھا۔ گویا ظفر شنا دونوں سیاحوں کے لیے بے آب و گیاہ ربع الخالی کے جنوبی مغربی گوشے میں آخری خیمہ گاہ تھا۔ وہیں سے وہ اس سرزمین میں داخل ہوئے جس کی چھان بین اور

تفتیش پہلے کسی نے نہ کی تھی۔ فلبی مزید جنوبی سمت میں اس مقام کی طرف جانا
چاہتا تھا، جہاں برٹرام ٹامس کو گم شدہ وبار کا پتہ بتایا گیا تھا۔ لیکن اس کے
ساتھی راضی نہ ہوئے۔ اور انھوں نے کہا کہ ایک گروہ کو دیکھا گیا ہے۔ یہ ممکن ہے
حملہ آوروں کا گروہ ہو اور اس مقام پہ جانا یقیناً خطرناک ہوگا۔ بدوؤں کی رضامندی
حاصل نہ ہو سکی۔ تو اسے جنوب کی طرف مزید سفر کا خیال ترک کرنا پڑا۔
فلبی کا آخری نصب العین یہ تھا۔ کہ ربع الخالی کے جنوبی ومغربی حصے کی
چھان بین کرے، جہاں نہ پانی کا کسی کو پتا ہے اور نہ چراگاہوں کا۔ بدو وہاں شاذ
ہی جاتے ہیں۔ البتہ شکاری لوگ بیرشتا سے بھی تھوڑی دور اندر کی طرف
چلے جاتے ہیں۔ اور وادی دواسر کی طرف سے بھی آجاتے ہیں، جو جبل طویق
کا جنوبی سرا ہے۔ اس سفر کے لیئے تینتیس مشکیزے پانی سے بھر لیئے گئے۔ اور
غذائی جنسیں ایسی رکھیں جنھیں پکانے کے لیئے پانی کی ضرورت نہ پڑے۔ پھر
اونٹوں کو آخری مرتبہ پانی پلا لیا گیا۔ مغربی جانب راستہ متوازی ٹیلوں میں
سے گزرتا تھا۔ ایک خشک دریا کا بہاؤ بھی ملا جس میں میٹھے پانی کے گھونگے تھے
یہ دریا عسیر و یمن کی پہاڑیوں سے نکلا ہوگا۔ پھر وہ لوگ اس علاقے میں
داخل ہو گئے، جہاں سرخ ریت کے بڑے بڑے ٹیلے تھے۔ ان میں سے بعض پانسو
فٹ بلند ہوں گے۔ پھر ہوا بند ہو گئی اور گرمی اتنی بڑھ گئی کہ معلوم ہوتا تھا، بھٹی
میں سے گزر رہے ہیں۔ قدم قدم پر سراب نظر آنے لگے۔ بارش خوب ہو جائے
تو جفاکش بدو شکار کی تلاش میں یہاں پہنچ جاتے ہیں، لیکن سات آٹھ سال
سے بارش بالکل نہیں ہوئی تھی اور پورا خطہ سبزی سے سراسر خالی تھا۔

ایک سو چالیس میل کا سفر طے کر چکنے کے بعد بدوؤں نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ اس لیئے کہ آبار سلیل تک دو تہائی سفر ابھی باقی تھا اور اونٹ پیاس سے مرے جا رہے تھے۔ بعض بے دم ہو کر زمین پر لیٹ گئے تھے۔ ان میں زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کے لیئے پانی کی ضرورت تھی اور جو پانی ساتھ تھا، وہ آدمیوں کو منزل مقصود پر پہنچانے ہی کے لیئے کافی تھا۔ لہذا پھر تمبر نیقا کا رخ کر لیا گیا۔ واپسی کے سفر میں بڑی زحمت اٹھانی پڑی۔ رفتار بھی سست تھی۔ آخری پنتالیس میل بھاگ دوڑ کر طے کیئے اور تمبر نیقا پر پہنچ کر خود فلبی نے تین پیالے پانی پیا۔ وہ کہتا ہے۔ زندگی میں ایسا خوشگوار مشروب کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ پی چکنے کے بعد اسے یاد آیا کہ تمبر نیقا کا پانی خراب تھا۔ وہ سفر میں زیادہ تر چائے اور اونٹ کے دودھ ہی پر گزارا کرتا رہا۔

چند روز آرام کر کے سب تازہ دم ہو گئے تو جماعت کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ سامان کے اونٹ اس راستے سے ریاض بھیج دیئے گئے جس میں کنوئیں ملتے تھے۔ فلبی نے آٹھ جوان ہمت عرب تیار کر لیئے کہ پھر ایک مرتبہ ربع الخالی کو عبور کرتے ہوئے آبار سلیل پہنچیں۔ روانگی سے پیشتر خوب مینہ برس گیا جس کا سلسلہ کئی گھنٹے جاری رہا۔ فلبی لکھتا ہے:-

ہمارے اردگرد ریت کے چوٹیلے تھے، ان پر ہوا کے جھکڑ پہنچتے تھے تو ریت کے سیاہ بادل ان کے آگے اس طرح دوڑتے تھے جس طرح والکیرزلہ کے حبش

لہ Valkyzies والکیرناروے کے دیومالا میں تعمیر شہدا کی دیویاں ہیں، جو صبا رفتار گھوڑوں پر تلواریں سوتے ہوئے میدان جنگ کی طرف جاتی ہیں تاکہ جن جن کو جنگ میں قتل ہونا ہے، انھیں منتخب کرلیں۔ مقصود یہ ہے کہ ریت کی تیز رفتاری کا نقشہ سامنے آجائے۔

اڑے چلے جا رہے ہوں جن ٹیلوں کی چوٹیاں بہت بلند تھیں وہ ایسے نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہوا میں سیاہ پرچم کھڑے ہوں اور صحرا کے فرش پر برف اڑی جا رہی ہو۔ سفید ریت کی چادریں یکے بعد دیگرے چلتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا سواروں کے پرے پے در پے حملے کر رہے ہیں۔ طوفان کی حالت میں صحرا کا یہ نظارہ کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ دور سے گرج کی صدا گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ اس پر بجلی کی خیرہ کن چمک مستزاد تھی خیال ہوتا تھا۔ بجلی چمکتے ہوئے بادلوں کے سینے چیر ڈالنے پر تلی کھڑی ہے۔
پانی پھر مشکیزوں میں بھر لیا گیا اور از سر نو سفر شروع ہوا۔ اب کے رفتار تیز رکھی گئی اور پہلے پانچ دنوں میں ایک سو ستر میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ خیمہ ساتھ نہ تھا، فلبی اور بہت سے ساتھیوں نے حلف اٹھا لیا تھا کہ اس سفر میں وہ نہ پئیں گے تاہم ابھی دو سو میل طے کرنا باقی تھے۔ فلبی لکھتا ہے کہ رات کے وقت سفر کرنے میں روشنی کا ایک نہایت عجیب تجربہ ہوا۔ اونٹوں کے سیاہ سائے ریت پر پڑتے تھے تو ان کے اردگرد مدھم روشنی کے ہالے بن جاتے تھے، جن میں ٹیلوں کے حاشیے کی جھاڑیاں صاف نظر آتی تھیں۔ اس روشنی کا ذکر عرب کے دوسرے سیاحوں نے بھی کیا ہے۔ ممکن ہے یہ ہوا کی غیر معمولی صفائی کا نتیجہ ہو جب ریت سے یہ بالکل پاک ہوتی ہے۔ رات کے وقت جس علاقے سے گزرے وہ بالکل ہموار تھا۔

سفر کا جو حصہ اب شروع ہوا، وہ سب سے زیادہ خطرناک تھا اس لیے کہ ایک سو نوے میل تک کسی طرف بھی پانی کا نشان نہ تھا۔ اگر کسی کی ٹانگ ٹوٹ جاتی

یا کوئی بیمار ہو جاتا تو یقیناً ایسا ہر حادثہ مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس جگہ ایک اونٹنی اور اس کے بچے کے پاؤں کے نشان ملے۔ بدوؤں کا قیاس یہ تھا کہ کسی گروہ نے چھاپا مارا، اونٹ پکڑ لیئے اور اونٹنی بچ کر نکل آئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ قیاس درست تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ ایک گائے اور اس کا بچھڑا پورے صحرا کو عبور کر کے اصل مالک کے گھر پہنچ گئے تھے۔

گرمی روز بروز بڑھ رہی تھی اور مرو قبیلے کے آدمی کہتے تھے کہ یہاں غالباً بیس برس سے بارش نہیں ہوئی۔ ایک جگہ شتر مرغ کے انڈے کے ٹکڑے نظر آئے۔ گویا اس میں سے بچہ نکل چکا تھا۔ ساتھیوں نے بتایا کہ یہ انڈا پچاس سال پیشتر کا ہوگا۔ اس لیئے کہ ہمارے بڑوں نے پچاس سال پیشتر یہاں زندہ شتر مرغ دیکھے تھے۔ سفر کی بدترین منزل وہ سنگریزوں کا میدان تھا، جسے ابوبحر کہتے تھے۔ دھوپ بہت تیز ہو گئی تھی۔ اکیس گھنٹے میں بیس میل کی مسافت طے کی۔ میدان ختم ہوتا نظر نہ آیا تو ٹھہر گئے۔ فلبی نے کھجوریں کھائیں۔ ناشپاتیوں کا ڈبا کھول کر نوش کیا، پانی پیا اور سوار ہو گیا۔

ابوبحر سے گذر کر یہ جوان ہمت لوگ دہنا کی جنوبی پٹی کے آخری سرے پہ پہنچ گئے۔ وہاں سے وادی دوامر کے خشک پہاڑ میں داخل ہوئے۔ افق پر سیل طویق کا سیاہ خطہ نمودار ہوا اور بدوؤں نے خوش ہو کر کہا کہ انشاءاللہ کل ہمیں پھر آدمیوں کے چہرے نظر آنے لگیں گے۔ دوسرے سوز ایک گول برج ملا۔ یہ برق سے روانگی کے بعد یہ پہلی عمارت تھی جو انھوں نے دیکھی۔ اگلے روز مویشیوں کی عورتیں ریوڑ چراتی ہوئی ملیں۔ اس طرح فلبی نے پونے چھ سو میل کا سفر ربع الخالی میں سے کیا

لیکن کسی کو یقین نہ آتا تھا۔

دورِ حاضر کے مکتشفوں اور سیاحوں میں سے آخری شخص ولفرڈ تھیسیگر[1] ہے جس نے ربع الخالی کی چھان بین اور تحقیق و اکتشافات میں حصہ لیا۔ اس اکتشاف و سیاحی کا آغاز افریقہ کے صحرائے دنافل[2] اور جبال تبستی[3] میں کیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں ابی سینیا (حبشہ) کے اندر اور آس پاس خاص کارنامے انجام دے کر نام پیدا کر لیا۔ جنگ ختم ہوئی تو عرب میں ٹڈیوں کو ختم کرنے کے لیے ایک جماعت بھیجی گئی تھی۔ تھیسیگر اس میں ملازم ہو گیا۔ اس زمانے میں اس نے بہت سے دور افتادہ علاقوں کے چکر لگائے۔ یہی زمانہ ہے جب عرب کے بڑے جنوبی صحرا (ربع الخالی) نے اسے مسحور کر لیا۔ چنانچہ اس نے ملازمت ترک کر دی۔ اور ۱۹۴۶ء-۱۹۴۷ء کے موسم سرما میں اس علاقے کی جنوبی حد کے ساتھ ساتھ سفر کیا، جہاں کے حالات معلوم نہ تھے۔ اگلے سال موسم سرما میں اس کا قافلہ ظفار سے شمالی جانب لوا کی طرف روانہ ہوا۔ لوا، ابوظبی کے جنوب مغرب میں باران ستیوں کا ایک مجموعہ ہے جو عمان کی ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نزدیک واقع ہے جنھوں نے انگریزوں سے خاص عہد و پیمان کر رکھے ہیں۔ وہاں سے وہ عمان کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف گیا، پھر جنوب کا رخ کر کے بحیرۂ عرب کے کنارے پہنچ گیا۔ اس کے وسیع سفر کا پورا درمیانی حصہ اس صحرائی علاقے میں سے

---

[1] Wilfred Thesiger [2] یہ صحرا ابی سینیا (حبشہ) اور بحیرۂ قلزم کے درمیان ہے [3] یہ پہاڑ لیبیا کے جنوب میں صحرائے اعظم کے اندر واقع ہے کہ بحالت سفر بہت کی جنوبی شاہراہ ہے۔ اور اورحضرموت کی قعیطی ریاست کا صدر مقام بھی یہی ہے۔

ہؤا۔ جسے پہلے کسی نے نہ دیکھا تھا اور نہ اس کے حالات معلوم تھے۔ غالباً اس کی یاترا ئیں
مہموں میں سب سے بڑی اور اہم مہم نہ تھی، جو اس نے ۱۹۴۷ء کے موسم سرما میں
حضرِ موت سے نخلستان سُلیل تک کی طویل طویل[illegible] کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔ اس
میں ربع الخالی کا مغربی حصہ عبور کیا۔

بلاشبہ برٹرام تامس اور سینٹ جان فلبی بھی بھاری ساز و سامان لے کر چلے
تھے، تاہم تھیسی گر کے پاس سب سے کم سامان تھا۔ وہ ۶ جنوری ۱۹۴۸ء
کو منوخ سے شمال کی طرف روانہ ہؤا، جو اس کے راستے کا آخری کنواں تھا۔ پہلے
کنکریلا میدان آیا، پھر ریت کے ٹیلے شروع ہو گئے۔ ہوا بڑی تیز اور سرد تھی، لیکن
تھیسی گر کی جماعت نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا اس لئے کہ وہ جہاں سے گزرتے
تھے، ہوا گزر کے نشان مٹا دیتی تھی۔ اس طرح یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ کوئی مخالف
گروہ ان کا تعاقب کرتا ہؤا جا پکڑے گا۔ اس حصے میں چھاپے پڑتے ہی رہتے
تھے اور تھیسی گر کے رہبروں نے چھاپوں کی لمبی لمبی کہانیاں سنائی تھیں۔

صبح اٹھتے ہی وہ مٹھی مٹھی بھر کھجوریں کھا کر ایک ایک پیالی سیاہ قہوے
کی پی لیتے جس میں الائچی ڈال کر خوشبو پیدا کر لی جاتی۔ اونٹوں کی دو قطاریں
بنا لیتے۔ ایک قطار میں تین اور دوسری میں چار۔ ہر پچھلے اونٹ کی نکیل اگلے اونٹ
کی دُم سے باندھ دیتے۔ آدمی تھوڑی دیر تک پیدل چلتے تاکہ ذرا گرما جائیں۔
جب سورج خاصا اوپر چڑھ آتا تو ساتوں کے ساتوں سوار ہو جاتے۔ نکیلیں کھول
لی جاتیں اور شام تک برابر سفر جاری رہتا۔ جب گرمی بڑھ جاتی تو عرب گیت
گا کر دل خوش کرتے یا کبھی کبھار آپس میں باتیں شروع کر دیتے۔ پانی کے لیے

جو مشکیزے مکلا[1] سے خریدے گئے تھے، ان میں سے پانی ٹپکتا تھا۔ اس لئے روزانہ
ایک پائنٹ پانی ہر آدمی کے لئے مقرر کر لیا گیا تھا۔ اندھیرا ہو جانے تک سفر جاری
رہتا۔ پھر اُتر کر لکڑی فراہم کی جاتی اور ایک ایک انچ موٹی روٹیاں پکالی جاتیں۔
جنھیں کھانے سے پہلے گھی سے چپڑ لیا جاتا۔ شاید ہی کسی فرنگی نے اتنی لمبی مدت
تک ایسی غذا پر زندگی بسر کی ہو، جس پر تھیسی گر نے بسر کی۔

جب سُنیل دو تہائی فاصلے پر رہ گیا تو یہ جماعت رملات بنجارعض میں پہنچی۔ وہاں
انھیں چار چار سو فٹ اونچے ریت کے ٹیلے نظر آئے۔ نیز انھوں نے بھیڑیئے کے
پاؤں کے نشان دیکھے، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اونٹوں کے گزرنے کے تازہ نشان
نظر آئے۔ اس سے بڑی تشویش پھیلی چنانچہ دو ساتھیوں نے ادھر اُدھر پھر کر خوب
دیکھ بھال کی۔ رات کو دو آدمی پہرے پر رہتے، جو لوگ سوتے ان کی بندوقیں
بھی بھری ہوئی پاس رہتیں اور گہری نیند کا موقع کسی کو نہ ملتا۔ ۱۸ جنوری کو تھیسی گر
نے ایک خشک پہاڑ میں پڑاؤ کیا، جہاں سے تیس میل پر ایک شہر کے کھنڈر تھے۔
اسی مقام پر بحر الصافی تھا، جس کے متعلق عجیب افسانے بدوؤں میں مشہور تھے۔
مگر تھیسی گر کے ساتھیوں کو وہ مقام معلوم نہ تھا۔ اگلے دو روز ان کا سفر عارض میں
رہا۔ جو سُنیل کے جنوب میں جبل طویق ہی کا ایک بڑھا ہوا حصہ ہے۔ مشرقی جانب پہاڑیاں
ریت سے اوپر اٹھتی چلی آ رہی تھیں۔ مغربی جانب کوئی دو سو فٹ اونچی ایک چٹان
کھڑی تھی۔ یہ چٹان سُنیل کے مغرب میں واقع ہے۔ جہاں وادی دواسر پہاڑ کا سلسلہ

---

[1] مکلا حضر موت کی مشہور بندرگاہ ہے۔ اور حضر موت کی قعیطی ریاست کا صدر مقام
بھی یہی ہے۔

تو ذکر باہر نکلی ہے۔ آخر ۱۲ جنوری کو تھیسی گر اور اس کے ساتھی آٹھ مسافروں کے ایک گروہ سے دوچار ہوئے جو شلیل سے نجران کے جنوبی و مغربی شہر کی طرف جارہے تھے۔ ملاقات خوشگوار نہ تھی۔ تاہم کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ یہ اونٹ پاس کے اچھلے کنوئیں پر بیٹھ گئے۔ وہاں ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا۔ جو وسط عرب کی تہذیب کا آخری نشان سمجھنا چاہیئے۔ مغربی ربع الخالی سر ہوچکا۔ عرب کے نقشے میں جو آخری بڑا خلا باقی رہ گیا تھا، وہ بھر گیا۔

تھیسی گر کے شلیل پہنچنے کی خبر سن کر فلبی ریاض سے موٹر میں روانہ ہوا اور اس کنوئیں پر پہنچ گیا جہاں تھیسی گر پہنچا تھا۔ وہاں سے وہ اس شہر کے کھنڈر دیکھنے گیا۔ جنہیں تھیسی گر نے نہیں دیکھا تھا، البتہ ان کا ذکر سنا تھا۔ اس مقام کی دریافت کا سہرا دراصل ارامکو کی اس پارٹی کے سر ہے، جو تیل کے سلسلے میں چھان بین کے لیے نکلی تھی۔ اس پارٹی نے کچھ وقت اس حصے میں گزارا تھا۔ اسے سبائی رسم الخط کے نہایت خوبصورت کتبے ملے۔ اس نے ملبے کے بکھرے ہوئے انبار بھی دیکھے، جو بظاہر مٹی کے تلوں کے کھنڈر تھے۔ ظروف گلی کے کچھ ٹکڑے بھی پائے۔ اس کا اندازہ یہ تھا کہ یہ آبادی دوسری صدی قبل مسیح کی ہوگی۔ کھنڈروں کا رقبہ خاصا وسیع تھا۔ بعض عمارتیں قلعہ نما اور مستحکم تھیں اور بعض مقبرے معلوم ہوتے تھے۔ اب ریاض سے نجران جانے کا جو کچا مگر قابل گزر راستہ ہے، وہ ان کھنڈروں کے پاس سے گزرتا ہے۔ امید ہے اس مقام کی چھان بین میں تاخیر نہ ہوگی۔

۱۹۴۸ء۔۱۹۴۷ء کے موسم سرما میں تھیسی گر نے جنوبی عرب میں ایک اور سفر کیا، تاہم اونٹوں کے ذریعے سے ربع الخالی کو عبور کرنے کا زمانہ گزر چکا تھا۔ ارامکو کے ہوائی جہاز

عدن آتے جاتے کئی مرتبہ اس عظیم الشان صحرا کے بیچ میں سے پرواز کر چکے ہیں۔ اب ربع الخالی میں ماہرین ارضیات کی پارٹیاں چھان بین کر رہی ہیں۔ وہ موٹروں میں سفر کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ صحرا میں جانے آنے والے ٹرک ہوتے ہیں اور وہ ایک ایک دن میں ایک ایک سو میل کا فاصلہ طے کر جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ایسے ٹریلر ہوتے ہیں جن کی فضا ضرورت کے مطابق خنک ہوتی ہے۔ انھیں میں سوتے ہیں۔ انھوں نے جہاں جہاں مرکز بنا رکھے ہیں وہاں سے ہوائی جہازوں کے ذریعے تازہ پانی اور تازہ خوراک آجاتی ہے خاص ضرورتوں کے لیئے صحرا میں ہوائی جہازوں کے اترنے اور چڑھنے کے لیئے جگہیں بنانے کی تجویز زیر غور ہے۔ غرض ربع الخالی بھی جو جزیرۃ العرب کا سب سے کم معروف اور ناقابل عبور حصہ تھا، اب منظر عام پر آرہا ہے۔ اس کے متحرک پتھر، اس کی گنگناتی ریت، اس کے ویران نخلستان اور اس کے گم شدہ شہر زیادہ دیر تک پُراسرار نہیں رہ سکتے۔
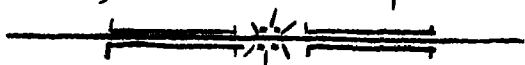
گیارھواں باب:

بحرین

تیل اور موتیوں کے جزیرے

جب بادِ شمال چلتی ہے تو اڑتی ہوئی ریت کے باعث فضا کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ ظہران میں جو لوگ تیل کی کمپنی کے ملازم ہیں۔ انھیں بازار اور گلیوں کے دوسری جانب کے مکان بھی نظر نہیں آتے، لیکن مطلع صاف ہو اور پاس کی پہاڑی پر چڑھ کر مشرق کی جانب دیکھیں تو الخوبر کی سفید بندرگاہ صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس کے آگے خلیج فارس کا پانی پھیلا ہوا ہے جس میں قدم قدم پر ذیرہ آب چٹانیں ہیں، اور کوئی بیس میل دور افق پر دھندلی دھندلی سی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہی جزیرہ بحرین اور اس کے متعلقات مثلاً محرق، سترہ اور دوسرے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں، جو زیادہ آباد نہیں[1]۔ یہ سب ریاست

[1] بحرین کے علاوہ خاص طور پر قابل ذکر جزیرے یہ ہیں: محرق، البتاہر جو محرق کے جنوب میں ہے سمندر میں جذر ہو تو محرق سے اتصال ہو جاتا ہے، سترہ بحرین کے مشرق میں، الجزیرہ یا النبی آلصالح ام نعسان قریب میں ہے۔

بحرین میں شامل ہیں۔ سب سے بڑا جزیرہ بحرین، تیس میل لمبا اور دس میل چوڑا ہے، اس کا سب سے بلند حصہ سمندر سے صرف چند سو فٹ اونچا ہے۔ منامہ اس کا سب سے بڑا شہر، مرکز حکومت، بندرگاہ اور سب سے بڑا تجارتی شہر ہے۔ بحرین سے ایک پل المحرق تک جاتا ہے جو ہلالی جزیرہ ہے۔ یہی موتیوں کی روایتی بندرگاہ ہے یہیں رائل ایر فورس کا اڈا ہے۔ جسے برطانیہ اور امریکہ دوران جنگ میں استعمال کرتے رہے۔

آب و ہوا قدرے مرطوب ہے۔ بڑے جزیرے کے شمالی حصے کے سوا آب رواں بہت کم ہے۔ شمالی حصے میں چشمے ہیں۔ ان کا مرکز بھی وہی ہے، جس سے الحسا کے چشموں کو پانی ملتا ہے اور جو وسیع باغات کو سیراب رکھتے ہیں۔ جزیروں کے شمال میں سمندر کے نیچے میٹھے پانی کے چشمے ہیں۔ ان سے گزرتی ہوئی دیسی کشتیاں ہمیشہ پانی لیتی رہیں۔ خود بحرین کے باشندے چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر ان چشموں پر پہنچ جاتے ہیں اور سمندر میں غوطہ لگا کر مشکیزے بھر لاتے ہیں۔

عرب آبادی ستر ہزار ہوگی۔ نصف سے زیادہ سنی ہیں جو منامہ اور محرق میں رہتے ہیں، ایک چوتھائی شیعہ ہیں جو مختلف دیہات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے لوگ ہیں، وہ پاکستان، ہندوستان، ایران اور مشرقی افریقہ کے ہیں۔ کچھ یہودی بھی ہیں۔ روایات قدیمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی باشندے یمن سے آئے تھے۔

بہرحال یہ یقینی ہے کہ جزائر بحرین کو خلیج فارس کی سیاست و تجارت میں

ابتدا ہی سے اہمیت حاصل رہی۔ ایک اشوری کتبے میں جو ۲۵۸۷ء ق م کا ہے ایک جزیرے کا ذکر ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بحرین ہی ہوگا۔ رومی مورخ سٹرابو[1] اور رومی جغرافیہ دان پلینی[2] نے بھی بحرین کا ذکر کیا ہے۔ حال در بعد دلچسپ تاریخی آثار میں سے کوئی پچاس ہزار کے قریب قبروں کے انبار ہیں جن میں سب سے بڑے انبار کے متعلق پی بی کارن وال[3] نے بتایا ہے کہ وہ پچاس گز لمبا اور کوئی اسی فٹ اونچا ہے۔ چند قبریں کھولی گئیں۔ وہ سب ایک وضع کی نکلیں ان کے دروازے مغرب کے رخ تھے۔ ہر ایک میں ایک دوسرے کے اوپر دو کمرے تھے، جو بڑے بڑے گھڑے ہوئے پتھروں سے بنائے گئے تھے اور اندر بھدا سا پلستر پھیر دیا گیا تھا۔ ان کی تعمیر میں لکڑیاں بھی استعمال کی گئی تھیں۔ حالانکہ لکڑی بحرین میں ناپید ہے۔ ان میں آدمیوں اور جانوروں کے پنجر پڑے تھے، ساتھ ہی دستکاری کی کچھ چیزیں تھیں۔ مثلاً سنہری تعویذ، بالوں کے لیے برنجی زیور، ہاتھی دانت کے صندوقچے، شتر مرغ کے منقش انڈے اور ٹوٹے ہوئے گلی ظروف۔ یہ ظروف سرخ مٹی سے بنائے گئے تھے، حالانکہ اس قسم کی مٹی بحرین میں ناپید ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے یہاں کسی زمانے میں فونیقیوں کی آبادی تھی اور یہ قبریں ان کے لیڈروں کی تھیں۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ فونیقیوں کا اصل وطن بحرین ہی تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ دوسرے حصوں میں گئے۔ بہر حال یہ قبریں یا مقبرے ۱۵۰۰ء ق م تا ۲۰۰۰ء ق م کے ہیں۔ گویا

---

[1] Strabo مشہور مورخ اور جغرافیہ دان ۶۳ ق م میں پیدا ہوا، ۲۰ء میں وفات پائی

[2] Pliny پیدائش ۲۳ء وفات ۷۹ء

[3] P. B. Cornwall

ان کا تعلق آخری برنجی عہد سے ہے اور اسی قسم کی قبریں یا مقبرے دولت سعودیہ میں بھی ملتے ہیں۔ مشرقِ قریب کے ماہرین آثارِ قدیمہ کے لیے اسی بارے میں مزید چھان بین اہم اور ضروری ہے جس سے تاریخ کے غیر معروف گوشے پر روشنی پڑے گی۔

ساسانیوں کے عہد سے سولھویں صدی تک بحرین عربوں اور ایرانیوں کے درمیان میدانِ جنگ بنا رہا۔ ۱۵۰۷ء میں پرتگیزوں کا ایک بیڑا یہاں پہنچ گیا اس وقت سے قریباً ایک صدی تک یہ جزیرہ پرتگیزی سلطنت کی ایک بیرونی چوکی رہا۔ پرتگیزوں نے ترکی اور ہندوستان کے درمیان تجارت کے دروازے بند کرنے کے لیے خلیج فارس میں جو چوکیاں بنائی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی لیکن پرتگیز ایرانیوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور ۱۶۲۲ء میں بحرین کو ایرانی سپہ سالار کے حوالے کر دیا۔ اس وقت سے ڈیڑھ سو سال تک بحرین پر ایرانی پرچم لہراتا رہا۔ ایرانی اس جزیرے پر جو دعوے کر رہے ہیں اس کی بنیاد یہی تصرف ہے ۱۷۸۳ء میں جزیرہ نمائے قطر کی مغربی سمت کے ایک شہر زبارہ کے عرب اٹھے اور انھوں نے بحرین کے ایرانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ زبارہ اب سمندر کے پیچھے ہٹ جانے کی وجہ سے دلدل بن گیا ہے، لیکن قطر کے عرب اس وقت سے بحرین کے حکمران چلے آتے ہیں۔

بحرین میں آمدنی کا کوئی قابلِ اعتماد ذریعہ موجود نہ تھا، لہذا یہاں کے حکمران بھی اپنے دوسرے ہمسروں کی طرح بحری قزاقی، ناجائز اسلحہ فروشی اور غلاموں کی تجارت میں سرگرم ہو گئے۔ ۸ جنوری سنہ ۱۸۲۰ء کو برطانوی

بڑے نے بحرین کا سب سے بڑا جنگی جہاز ڈبو دیا۔ اور جزیرے کے مشترک حکمرانوں شیخ سلیمان اور عبداللہ بنی احمد نے برطانیہ سے ایک عام معاہدہ کر لیا۔ جس کے مطابق غارت گری اور بحری و بری قزاقی بند کر دی۔ اس طرح خلیج فارس میں قزاقی کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن عرب رئیسوں کی باہمی رقابتوں کا خاتمہ نہ ہوا اور برطانیہ برابر بحرین کی حفاظت کرتا رہا۔ جزیرے کی موجودہ حیثیت کے متعلق برطانیہ کے دارالعوام میں ۱۸۔ اپریل ۱۹۳۴ء کو ایک بیان دیا گیا تھا، جس میں بتایا گیا کہ بحرین برطانوی علاقہ نہیں۔ شیخ بحرین آزاد حکمران ہے، البتہ ملک معظم کی حکومت کے ساتھ اس نے خاص معاہدہ کر رکھا ہے۔

گزشتہ ایک صدی سے برطانیہ اپنے پولیٹیکل ریزیڈنٹ کے ذریعے سے خلیج فارس کے معاملات سنبھالتا چلا آیا ہے۔ خلیج کی مختلف ریاستوں کے لیئے برطانیہ کی حمایت پر نکتہ چینی بھی بہت کی گئی ہے۔ اور اس کی تعریف میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ یہ علاقے بہت پس ماندہ ہیں اور زیادہ تر حکمرانوں کی پالیسی کوتاہ اندیشی پر مبنی رہی ہے، اس لیئے ان کے درمیان جھگڑے پیدا ہوتے رہے۔ برطانوی ریزیڈنٹ جھگڑے بھی چکاتا رہا اور خلیج فارس کی تجارت کو بھی اس نے محفوظ رکھا۔ مقامی زراعت اور حفظان صحت میں بہت اصلاح ہو گئی ہے۔ عوام کی خاصی بڑی تعداد مغربی تعلیم پا چکی ہے، جس سے بحرین کے مستقبل کے متعلق خوشگوار امید قائم کی جاتی ہے۔

۱۹۴۶ء کے موسم بہار تک پولیٹیکل ریزیڈنٹ بوشہر (ایران) میں رہتا

تھا۔ آج کل وہ بحرین ہی میں مقیم ہے، جہاں گیارہ سال پیشتر برطانوی بحریہ نے اپنا مرکز بنا لیا تھا۔ پولٹیکل ریزیڈنٹ کے ماتحت مختلف ریاستوں میں پولٹیکل ایجنٹ موجود ہیں۔ ان میں سے بعض افراد بڑے قابل تھے۔ وہ عربی زبان اور عربی ثقافت سے خوب واقف تھے۔ اور انھوں نے تمام ریاستوں کا انتظام ایسے انداز میں کیا۔ جو سلطنت برطانیہ اور مقامی باشندوں دونوں کے مفاد کے مطابق تھا۔ جن برطانوی افسروں کے ذریعے سے بحرین کے نشو و ارتقا اور بہبود کو خاص تقویت پہنچی ان میں سے ممتاز ترین سر چارلس بیگریو[1] ہے، جو پچیس سال سے بھی زیادہ عرصے تک حکومت کا مشیر رہا اور یہی شخص سب سے پہلے بحرین میں مغربی انداز کی اصلاحات لانے کا ذریعہ بنا۔

بحرین قدیم ترین زمانے سے مشرق قریب میں موتیوں کی تجارت کا مرکز رہا ہے، جس کی وجہ سے ایک زمانے میں باشندگان بحرین کی فی کس آمدنی دنیا بھر میں سب سے زیادہ تھی۔ موتی سمندر سے نکالنے کا انتظام ناخدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کی زندگی کا آغاز غوطہ خوری سے ہوتا ہے۔ اس طرح وہ موتیوں کے خطوں سے وسیع واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ خواہ خود جہاز پر موجود ہو یا نہ ہو، لیکن جتنے موتی نکلتے ہیں وہ سب اسی کے پاس جمع ہوتے ہیں۔ اگر جہاز اسی کا ہے تو موسم کے ذخیرے میں سے تمام خرچ نکال کر ½ حصہ اسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جہاز موتی نکالنے میں مصروف ہوتا ہے۔ تو وہ ایک چارپائی پر کمبل اوڑھ کر رات کو سو جاتا ہے اور دن کو آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا، غوطہ خوروں پر نگاہ رکھتا ہے۔ تمام موتی اسی کی پیٹی

[1] Sir Charles D. Belgrave

میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔

موتی نکالنے والی زیادہ تر کشتیاں ساٹھ سے ایک سو فٹ تک لمبی ہوتی ہیں۔ اور ان میں صرف ایک بادبان لگاتے ہیں۔ کشتی کے دونوں جانب چھ چھ چپو لگے رہتے ہیں، تاکہ سمندر بالکل سکون میں ہو تو چپوؤں سے کشتی کو آگے پیچھے کر سکیں چار پانچ آدمی ایک ایک چپو پر متعین ہوتے ہیں۔

آج سے بائیس چوبیس سال پیشتر بحرین میں موتی نکالنے والی کوئی تین سو کشتیاں تھیں۔ ان کے علاوہ دو سو کشتیاں قطر اور آس پاس کی معاہد ریاستوں کی تھیں۔ ایک سو کویت کی اور پچاس دولت سعودیہ کی۔ ایک کشتی پر کوئی پینسٹھ[65] آدمی موجود رہتے ہیں، پچیس غوطہ خور، پچیس چپو چلانے والے جو غوطہ خوروں کو نیچے اتارنے اور اوپر لانے میں مدد دیتے ہیں، کچھ ملاح اور کچھ کھانے پکانے کے لیے ایک خود ناخدا ہوتا ہے۔ دن کے وقت سب آدمی کام میں لگے رہتے ہیں رات کے وقت کشتی کے مختلف حصوں میں پہلو بہ پہلو سو جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ اہم طبقہ غوطہ خوروں کا ہے جو جہاز کا پورا خرچ اور ناخدا کا حصہ نکال دینے کے بعد بچے مال آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ ہر غوطہ خور دن میں کم و بیش اسی مرتبہ غوطہ لگاتا ہے اور دو منٹ سے زیادہ پانی میں رہتا ہے۔ موتیوں والے صدف پچاس فٹ سے نوے فٹ کی گہرائی میں ملتے ہیں۔ اگرچہ سمندر میں شارک اور دوسری خطرناک مچھلیاں بھی ہوتی ہیں اور پانی کا دباؤ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے، تاہم غوطہ خور بڑی اچھی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بعض خاصی لمبی عمر پاتے ہیں۔ جس زمانے میں غوطہ خوری شروع ہو جاتی ہے، وہ کھانا کم کھاتے ہیں۔ اس لیے کہ پیٹ بھر جائے تو غوطہ نہیں لگایا جا

سکتا۔ ناشتا صرف چند کھجوریں اور قہوے کی ایک پیالی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ دوپہر کے کھانے میں آبی کدو استعمال کرتے ہیں۔ رات کا کھانا تازہ مچھلی چاول اور چائے پر مشتمل ہوتا ہے۔

سورج نکل آنے سے دو گھنٹے بعد بارہ غوطہ خوروں کی پہلی پارٹی کام شروع کرتی ہے۔ جن رسوں کے ذریعے غوطہ خور سمندر میں اترتے ہیں، وہ بڑے مضبوط اور موٹے ہوتے ہیں۔ ان کے ایک طرف تیس پاؤنڈ کا ایک پتھر بندھا ہوتا ہے ساتھ ہی غوطہ خور کے پاؤں رکھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ ایک مضبوط رسی میں ٹوکری بندھی رہتی ہے جس میں سیپیاں رکھی جاتی ہیں۔ اسے غوطہ خور اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیتا ہے۔ بس وہ رسے میں پاؤں رکھتا ہے۔ لمبا سانس کھینچتا ہے۔ ناک پر غلاف چڑھا لیتا ہے اور آناً فاناً پانی میں اتر جاتا ہے۔ اگر سطح پچاس فٹ سے زیادہ گہری نہ ہو، تو غوطہ خور جہازیوں سے اوجھل نہیں ہوتا، لیکن ان لوگوں کی نظریں خاص طور پر عادی ہو جاتی ہیں اور وہ اسی اسی فٹ کی گہرائی تک سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ پانی میں اتر کر غوطہ خور ڈیڑھ منٹ تک ادھر ادھر تیرتا ہوا سیپیاں اٹھا اٹھا کر ٹوکری میں رکھتا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں پر انگشتانے چڑھے ہوتے ہیں تاکہ تیز گھونگوں کی کاٹ سے محفوظ رہیں۔ جب سانس پھول جاتا ہے۔ فوراً اشارہ کرتا ہے۔ رسے والے ٹوکری اوپر کھینچ لیتے ہیں۔ اور غوطہ خور ابھر کر پانی کی سطح پر آ جاتا ہے۔ جہاز سے تھوڑی سی دور بھی ہو تو تیرتا ہوا رسا پکڑ کر دم لیتا ہے۔ اسی اثنا میں ٹوکری کی تمام سیپیاں ایک بوری میں الٹا دی جاتی ہیں۔ تین چار منٹ کے لیے دم لے کر پھر غوطہ لگاتا ہے۔ اسی طرح بارہ آدمی

دس دس مرتبہ غوطے لگاکر چالیس منٹ کے لیئے فارغ کر دیئے جاتے ہیں اور غوطہ خوروں کی دوسری پارٹی کام شروع کر دیتی ہے۔ دن بھر میں جتنی سیپیاں جمع کی جاتی ہیں۔ انھیں اگلی صبح کو طلوع آفتاب کے بعد کھولا جاتا ہے۔ عموماً گیارہ سیپیوں میں سے ایک میں موتی نکلتا ہے، جو عموماً چھوٹا اور بد وضع ہوتا ہے۔ اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ تمام موتی اچھے ہوں یا بُرے ناخدا کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں جو انھیں صاف کر کے سرخ رنگ کے کپڑے میں باندھ لیتا ہے۔ اور پوٹلی ایک صندوق میں ڈال دیتا ہے جسے صرف اس کی کنجی کھول سکتی ہے۔ ایک کشتی دن بھر میں عموماً ایک یا دو اچھے موتی پاتی ہے۔

سیپیاں جمع کرنے کا موسم چار مہینے اور دس دن رہتا ہے لیکن کشتیاں بڑی ہوں یا چھوٹی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ سمندر میں رہتی ہیں پھر واپس آجاتی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ایک کشتی نے بیس ہزار کے موتی برآمد کیئے تھے۔ ان میں سے چار ہزار روپیے ناخدا کو ملے۔ اڑھائی سو روپے ایک ایک غوطہ خور کو۔ اور ایک سو اسّی روپے فی کس دوسرے آدمیوں کو۔ حکومت بحرین موتیوں کی درآمد و برآمد پر ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اور جزیرے میں مصنوعی موتیوں کی درآمد بالکل منع کر دی گئی ہے۔ علاوہ بریں موتی نکالنے والے بھی باہر سے نہیں آسکتے اور نہ ہی غوطہ خوری کے لیے مشینری وغیرہ لا سکتے ہیں موسم کے ختم ہوتے ہی ناخدا کسی تاجر کے ہاتھ موتی فروخت کر دیتا ہے۔ ایک وضع کے بڑے موتی عموماً بحرین ہی میں چلے جاتے ہیں، لیکن ان میں سوراخ کرنے اور دھاگا ڈالنے کا بہترین کام ہندوستان یا فرانس میں ہوتا ہے

پہلے موتی تیز رفتار کشتیوں یا دخانی جہازوں کے ذریعے سے بھیجے جاتے تھے، آج کل رجسٹر کرا کے ہوائی جہاز میں بھیجے جاتے ہیں۔

موتیوں کے تاجروں کو بحرین میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آپ کسی کی فرم میں چلے جائیں اوپر کی منزل میں لے جاتے ہیں، جہاں ایک اندھیرے کمرے میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ پہلے چائے پیش کی جاتی ہے۔ پھر تاجر کے اشارے پر اس کا مددگار ایک فولادی صندوق کھولتا ہے اور اس میں سے ایک دستی کانٹا اور دھات کی چھلنی نکال لیتا ہے۔ پہلے وہ موتی لیے جاتے ہیں، جن کی وضع قطع اور رنگ اچھا نہ ہو اوسط درجے کے موتی بھی ان کے مقابلے میں اچھے معلوم ہوں گے۔ ناتجربہ کار دکاندار انھیں کو خریدنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی اثنا میں تاجر ایک خفیہ خانہ کھلواتا ہے اور اس میں سے عمدہ موتیوں کی لڑیاں نکال کر پیش کر دیتا ہے۔

گزشتہ بیس سال میں موتیوں کی صنعت خاصی گر گئی تھی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں جتنے موتی فراہم ہوئے تھے ان کی قیمت سوا اکیس لاکھ روپے تھی۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں یہ قیمت گر کر بارہ لاکھ تک پہنچ گئی اور سنہ ۱۹۴۰ء میں صرف پانچ لاکھ رہ گئی۔ اگرچہ قیمت گھٹتی بڑھتی رہی لیکن سنہ ۱۹۳۰ء کا درجہ پھر حاصل نہ ہوا اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء کے ابتدائی دور میں دنیا بھر کے اندر کساد بازاری شروع ہو گئی تھی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگوں کی توجہ ہیرے جواہرات کی طرف سے ہٹ گئی اور موٹروں یا سموروغیرہ کی طرف منعطف ہو گئی ہے۔ نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ جاپانیوں نے موتیوں کی پرورش کا فن

سیکھ لیا ہے ۔ یہ موتی طبعی موتیوں کے مقابلے میں زیادہ اچھے، بڑے اور ایک وضع کے ہوتے ہیں، مگر ان کی قیمت طبعی موتیوں کے مقابلے میں صرف ایک تہائی ہوتی ہے ۔ بحرین کے ایک تاجر کا اندازہ ہے کہ جاپانی موتیوں کی وجہ سے طبعی موتیوں کی پیداوار میں پچاسی فی صد سے نوے فی صد تک کمی واقع ہو گئی ۔

حکومت نے غوطہ خوروں کی حالت بہتر بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اب ان کا مستقبل یقیناً خطرے میں ہے ۔ کوئی شخص قدرتی موتیوں کی ایک لڑی کے لیے دو ہزار ڈالر دینے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جب کہ ان کے مقابلے میں پروردہ موتیوں کی لڑی سات سو ڈالر میں مل سکتی ہے ۔ نیز یہ موتی دیکھنے میں زیادہ اچھے ہوتے ہیں ۔ قدرتی اور پروردہ موتیوں میں تمیز صرف ماہر فن ہی کر سکتا ہے ۔ جعلی موتیوں کی ایک لڑی صرف بیس ڈالر میں مل جاتی ہے ۔ بلا شبہ بحرین کے بہترین موتی ضرور فروخت ہوتے رہیں گے لیکن وہ زمانہ گزر گیا جب جزیرے کی آمدنی کا چوتھائی دولت صرف موتیوں سے حاصل ہوتی تھی ۔

موتیوں کی تجارت کم ہوئی تو لوگوں نے آمدنی کے دوسرے ذریعوں پر توجہ کو دی ۔ ان میں سے ایک ذریعہ یہ ہے کہ مختلف لوگوں نے سفید رنگ کے عمدہ گدھوں کی پرورش شروع کر دی جنھیں مقامی عرب بہت پسند کرتے ہیں، لیکن اس قسم کے گدھوں کی پرورش الحساء کے نخلستانوں میں بھی شروع ہو گئی ۔ لہٰذا نفع پھر محدود رہ گیا ۔ بعض لوگوں نے چمڑے، دھاتوں اور لکڑی کا کام شروع کیا، لیکن کاریگروں کی کمی کے باعث ان صنعتوں کا دائرہ بھی زیادہ

نہ پھیل سکا۔ اب پانی خاصی مقدار میں فراہم ہو چکا ہے، بینج، سنگترے، لیموں، خربوزے، انجیر، کھجور کے علاوہ بعض سبزیوں کی کاشت ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ اہل بحرین نے کشتیاں بنانے، مرمت کرنے اور بادبان بنانے کی صنعت بھی جاری کر دی ہے، اگرچہ اس سلسلے میں کویت کے ماہرین فن سے بڑا سخت مقابلہ درپیش ہے۔

بحرین کے لوگ تجارت میں خاصے کامیاب ہیں۔ چمڑے کے جوتے، سٹرایٹ رنالی کی ہلکی ٹوپیاں، اور صندوق ہر جگہ ملتے ہیں۔ خلیج فارس کے مختلف علاقوں اور ایران کے بنے ہوئے قالین، عرب اور ہندوستان کے سوتی کپڑے، مرصع نیاموں والے خنجر، مرصع کار فرنیچر، چاندی کے زیور، خوبصورت پیالیاں، موتی اور سیپی کے زیورات بہ کثرت پائے جاتے ہیں، اگرچہ تجارت میں بھی دولت سعودیہ سے مقابلہ درپیش ہے۔

تیل کی دریافت نے بحرین کی معاشی حالت میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ ۱۹۱۰ء میں ماہرین ارضیات نے تیل دریافت کیا۔ بیس سال بعد کیلی فورنیا کی سٹینڈرڈ آئل کمپنی کو اس اجارے سے دلچسپی پیدا ہوئی، جو ۱۹۲۵ء میں انگریزوں کی ایک جماعت نے حاصل کیا تھا۔ اسی بنا پر بحرین پٹرولیم کمپنی (بیکو) کی بنیاد پڑی، جس نے ۱۹۳۱ء میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا۔ ۳۱۔ مئی ۱۹۳۲ء کو پہلے چشمے سے تجارتی مقدار میں تیل نکلنے لگا۔ پھر مزید چشمے دریافت ہوئے۔ تیل کے ٹینک بنا دیئے گئے۔ سمندر کے نیچے پائپ بچھا دیئے تاکہ ان کے ذریعوں سے جہازوں میں تیل بھرا جا سکے۔ دسمبر ۱۹۳۴ء میں بحرین کا تیل باہر

میں پہنچ گیا۔ اسی مہینے میں شیخ بحرین نے ایک اجارہ منظور کر لیا، جو ۱۹۹۹ء میں ختم ہوگا۔ یہ اجارہ ایک لاکھ ایکڑ زمین پر مشتمل ہے۔ ۱۹۴۰ء میں جزائر بحرین کے پانی بھی اجارہ میں شامل ہو گئے۔

اس وقت بحرین میں ستر چشموں سے تیل نکل رہا ہے۔ یہ چشمے بحرین کے قریباً وسط میں واقع ہیں، یعنی عوالی کے جنوب میں چشموں کی گہرائی دو ہزار آٹھ فٹ سے چار ہزار سات سو فٹ تک ہے۔ دولت سعودیہ میں تیل کی بہم رسانی قریب قریب لامتناہی ہے۔ بحرین سے صرف تیس ہزار بیرل روزانہ نکلتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ لگایا گیا تھا۔ جسے بعد میں وسیع کر دیا گیا۔ آج کل اس میں ایک لاکھ پچپن ہزار بیرل تیل روزانہ صاف ہوتا ہے۔ زیادہ تر تیل دولت سعودیہ سے بحرین لا کر صاف کیا جاتا ہے۔ ہر مہینے قریباً ستر ٹینکر بحرین پہنچتے ہیں۔ "بیپکو" نے بحرین میں کل ساڑھے سات کروڑ ڈالر کا سرمایہ لگایا ہے۔ یہ سرمایہ اصل میں ٹیکساس کمپنی اور سٹینڈرڈ آئل کمپنی کیلی فورنیا کمپنی کا ہے، جن کی وجہ سے "بیپکو" معرض وجود میں آئی۔

کمپنی کی پالیسی یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو مقامی باشندوں کو ملازم رکھے۔ ۱۹۵۱ء کے شروع میں کمپنی کے کل ملازم ساڑھے ہزار سے کسی قدر زیادہ تھے۔ ان کا تناسب یہ تھا۔ اہل بحرین ۶۷ فی صد، ہندوستانی، عراقی وغیرہ بارہ فی صد۔ باقی ساڑھے گیارہ فی صد امریکی، انگریز، اہل کنیڈا و جنوبی افریقہ نیز دوسرے یورپی تھے۔ عربوں کو زیادہ مشاہروں کے عہدوں پر مقرر کرنے

کے لیئے تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کر لیا گیا ہے ۱۹۵۱ء میں بحرینی ملازمین کی تعداد ۸۰ فی صد پر جا پہنچی تھی اور یہ سب لوگ کام خوب سیکھ چکے تھے۔ "بپکو" کے ناظموں نے تعلیمی اور مجلسی منصوبوں کی اہمیت بھی محسوس کر لی ہے۔ چنانچہ شیخ بحرین اور برطانوی مشیروں کے تعاون سے یہ منصوبے جاری کر دیئے گئے ہیں۔ سڑکیں اور پل بن گئے۔ دیہات میں کنوئیں کھود دیئے گئے۔ موسمی بخار کا انسداد کر دیا گیا ہے۔ مقامی کاروباری آدمیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ عرب ٹھیکیداروں نے وسیع تعمیری پروگرام پورے کیے۔ مقامی ملازمین اپنی مرضی کے مطابق مناسب کرائے دے کر کمپنی کے بنائے مکانوں میں رہ سکتے ہیں کنوارے لوگوں کے لیئے الگ مکان بنے ہوئے ہیں، جن میں ہر قسم کی سہولتیں مہیا ہیں۔ جو لوگ آس پاس کے دیہات میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ کمپنی اپنی بسوں میں انھیں پہنچا دیتی ہے۔ اور اپنی بسوں میں کام پر لے آتی ہے۔ اگرچہ مصارف بڑھ گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ "بپکو" کے ملازموں کی تنخواہیں بھی دگنی سے زیادہ ہو گئی ہیں۔ عوالی میں ایک ہسپتال بن گیا ہے جس میں ساٹھ ستر مریضوں کے رہنے کا انتظام ہے۔

شیخ بحرین سر سلمان الخلیفہ اور اس کے برطانوی مشیروں کی دانشمندی کا کرشمہ ہے کہ تیل سے جو رائلٹی ملتی ہے وہ بڑے مناسب طریق پر خرچ کی جاتی ہے۔ اس رقم میں سے تقریباً ایک تہائی شیخ اور اس کے خاندان کی ضروریات نیز زکوٰۃ و خیرات میں خرچ ہوتی ہے۔ ایک تہائی رقم ایسے کاموں میں لگا دی جاتی ہے کہ جب تیل نکلنا بند ہو جائے تو بحرین کے پاس متبادل ذریعہ موجود ہو۔ ایک

تہائی رقم جزیرے میں دورحاضر کی ضروری چیزیں مہیا کرنے کے لیئے صرف کی جاتی ہے۔ گوریوں کی اصلاح ہوگئی ہے۔ سڑکیں پختہ کردی گئی ہیں ۔ بڑے بڑے شہروں کے اکثر بازاروں میں روشنی کا انتظام ہو گیا ہے۔ گندے پانی کے نکاس کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔ پانی کی بہم رسانی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے ہر درجے کے مدارس جا بجا کھل گئے ہیں ۔ بلدیات میں ڈسپنسریاں قائم کر دی گئیں ہیں۔ ایک ہسپتال کا انتظام حکومت نے سنبھال رکھا ہے۔ دماغی بیماریوں کے لیئے بھی ایک ہسپتال قائم ہو گیا ہے۔ جزیرے کے ایک اہم حصے میں " بیکو " کی امداد سے کھیتی باڑی کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے۔ مستعد کسانوں کو موجودہ زمانے کی زراعت کے طریقے سکھائے جا رہے ہیں ۔ کوئی شخص نل کنواں لگوانا چاہے تو اسے مدد دی جاتی ہے ۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ پانی کے مناسب استعمال کی کیا صورت ہے ۔ اور نئے بیج بھی مہیا کیسے جاتے ہیں ۔ اسی طرح بحرین کے باشندوں کو امید پیدا ہو گئی کہ ان کا مستقبل خاص معروفیت کا ہوگا اگرچہ بحرین اتنا وسیع نہیں کہ بہت بڑا کاروباری اور تجارتی مرکز بن جائے تاہم روپے کے دانشمندانہ صرف، تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی کے صحیح استعمال اور تنخواہوں نے معیار معیشت اس پیمانے پر پہنچا دیا ہے جس سے بحرین کی تاریخ نا آشنا تھی اور خلیج فارس کی ریاستوں میں بحرین کو قابل رشک حیثیت حاصل ہو گئی ہے ۔
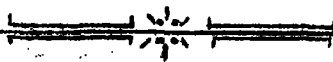
ضمیمہ

یہ بتادینا ضروری ہے کہ ۱۹۵۶ء میں حکومت بحرین کی آمدنی پانچ کروڑ اڑتالیس لاکھ روپے تھی۔ جزیرے میں ہندوستانی سکہ رائج ہے اور اس کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس مقرر ہے اس رقم میں سے ساڑھے تین کروڑ روپے تیل کی رائلٹی میں وصول ہوئے، ایک کروڑ تیس لاکھ کسٹمز میں آئے۔ خرچ کی بڑی مدات یہ تھیں:۔

حفظانِ صحت	پینتالیس لاکھ
تعلیمات	پچپن لاکھ
حفاظت عامہ	پچاس لاکھ
امورِ عامہ	ایک کروڑ تیرہ لاکھ
بحرین کی نئی بندرگاہ	بارہ لاکھ

باہر سے ایک کروڑ ستر لاکھ روپے سے زیادہ کا سامان آیا اور تقریباً پیاسی لاکھ کا سامان باہر بھیجا گیا۔ شیخ کویت نے نظم و نسق کے لیے ایک مجلس بنا رکھی ہے جس کی کیفیت یہ ہے:

صدر	شیخ عبداللہ بن عیسیٰ الخلیفہ، وزیر تعلیم
رکن	شیخ عیسیٰ بن سلمان الخلیفہ
"	شیخ علی بن محمد الخلیفہ
"	شیخ خلیفہ بن محمد الخلیفہ

رکن — شیخ دُعیج بن محمد الخلیفہ

〃 — شیخ خالد بن محمد الخلیفہ

〃 — احمد العمران ناظم تعلیمات

〃 — سالم رجسٹرار عدالت ہائے بحرین

〃 — جے، ڈبلیو۔ آر، سمتھ سکرٹری

〃 — یوسف الشرادی اسسٹنٹ سکرٹری و نائب ناظم تعلیمات

انگریزی اور عربی میں اخبار بھی نکلتے ہیں۔ بنک اور بیمہ کمپنیاں بھی ہیں۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں چودہ ہزار بچے زیر تعلیم تھے اور تعداد بڑھ رہی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بھی ہو گیا ہے۔ لبنان۔ مصر اور برطانیہ میں تعلیم کے لیئے وظیفے دیئے جاتے ہیں ؂

(یہ معلومات آج سے پانچ سال پرانی ہیں)

بارھواں باب:

کویت

خلیج فارس کے شمالی و مغربی گوشے میں ریاست کویت واقع ہے۔ شہر کویت کی آبادی کوئی ایک لاکھ کے قریب ہوگی۔ یہ بصرہ کے جنوب میں اسی میل پر اور شط العرب کے دہانے سے ساٹھ میل پر ہے۔ شہر کے اردگرد مٹی کی ایک فصیل ہے۔ "کویت" غالباً کوٹ کی تصغیر ہے، "کوٹ" بمعنی قلعہ۔ کوٹ اس قلعے کو کہتے تھے جو پرتگیزوں نے سولھویں صدی عیسوی میں بنایا تھا، لیکن موجودہ کویت اٹھارھویں صدی میں آباد ہوا، جب عتبی قبیلے کے لوگوں نے بنجر زمینوں میں پھرتے پھراتے یہ دیکھا کہ اس مقام کو قدرتی بندرگاہ کی حیثیت حاصل ہے اور یہاں بحری تجارتی ترقی کے بڑے امکانات ہیں[1]۔ کویت کی آبادی کا ایک حصہ بہ دستور خانہ بدوش

---

[1] حافظ وہبہ اپنی کتاب "جزیرۃ العرب" میں لکھتے ہیں کہ تین قبیلوں کے رئیسوں نے آپس میں معاہدہ کر لیا تھا اور وہ کویت میں رہنے لگے۔ اول سلیمان بن احمد (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رہا اور اب بھی ایک چوتھائی آبادی خانہ بدوش ہی ہے۔ جرمن سیاح کارسٹن نیبہر نے[۱۸]
۱۷۶۰ء میں لکھا تھا کہ اہل کویت کا خاص ذریعہ معاش موتی نکالنا، مچھلیاں پکڑنا
اور تجارت کرنا ہے اور وہاں آٹھ سو کے قریب جہاز مصروف کار ہیں۔ اٹھارویں
اور انیسویں صدی میں سمندر میں سفر کرنے والے جہاز خلیج فارس سے زیادہ
تر تجارتی سامان ہندوستان لاتے لے جاتے رہے۔ کویت کی بندرگاہ سے
بھیڑیں، اون، چمڑے، کھالیں، کھجوریں اور عربی گھوڑے باہر جاتے تھے۔

(بقیہ ص ۲۳۱) رئیس آل صباح جس کے ذمے حکومت کا کام تھا۔ دوم خلیفہ محمد بن آل
خلیفہ جسے تجارتی کاروبار سونپ دیا گیا تھا۔ سوئم جابر العتبی رئیس الجلاہمہ جس نے
جہاز رانی اور بحری قزاقی سنبھال لی تھی۔ پھر آخری دور رئیس زبارہ چلے آئے جو قطر
میں ہے۔ ابین ریحانی نے لکھا ہے کہ خلیفہ بن محمد کا بیٹا محمد زبارہ آیا تھا۔ جلاہمہ اس کے
رشتہ دار تھے۔ محمد بہت متقی اور پرہیزگار تھا۔ اہل زبارہ اس کا بڑا احترام کرتے
تھے۔ یہ احترام اس کے بیٹے شیخ خلیفہ کو بھی حاصل رہا۔ شیخ خلیفہ کی وفات پر اس
کا بھائی شیخ احمد رئیس قبیلہ بنا۔

یہ لوگ بحرین سے موتی خرید لاتے تھے اور انھیں فروخت کرکے روزی
پیدا کرتے تھے۔ بحرین اس زمانے میں ایران کے زیر تصرف تھا اور وہ لوگ سنیوں
کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر جھگڑا ہوا اور آل خلیفہ کا ایک خادم مارا گیا۔
ساتھیوں نے اس کا انتقام لیا۔ فریاد، وقت کے ایرانی حاکم بحرین کے پاس پہنچی
تو اس نے فوج جہازوں میں سوار کی اور زبارہ پر چڑھائی کر دی مگر شکست کھائی
اور وہ لوگ بحرین میں رہنے کے بجائے ڈر کے مارے بوشہر چلے گئے۔ شیخ احمد آل خلیفہ
بحرین پر قابض ہو گیا۔ اس لیے اسے احمد فاتح کہتے ہیں۔ یہ ۱۷۸۳ء کا واقعہ ہے۔
[۱۸] ...ten Neibuhr

باہر سے کپڑا، شکر، چائے اور چاول آتے تھے۔ مچھلیاں پکڑنے اور موتی نکالنے والے لوگ موسم میں خوب مصروف رہتے تھے۔ جہاز سازی کویت میں ایک خاص صنعت بن گئی تھی۔

۱۷۷۶ء میں ایرانیوں نے بصرہ پر قبضہ کر لیا تو عراق کے لیے کویت تنہا بندرگاہ رہ گئی، جہاں سے آمد و رفت جاری تھی۔ اب بھی کویت میں ایک ہزار کے قریب ایرانی رہتے ہیں، جو اس زمانے کے باقیات میں سے ہیں۔ اس زمانے میں انگریزوں نے خلیج فارس کے بالائی حصے میں تجارت کے لیے کوٹھیوں کا ایک سلسلہ قائم کر لیا تھا، جنھیں اصطلاح میں "کارخانے" کہتے تھے۔ ان میں سے ایک تجارتی مرکز بصرہ میں تھا۔ مگر جن حاکموں کو وہاں اقتدار حاصل تھا، ان کی وجہ سے کاروبار میں مشکلات پیش آئیں تو انگریزوں نے اپنا مرکز ۱۷۹۳ء میں بمقام کویت منتقل کر لیا۔ ۱۸۲۱ء میں جو انگریز پولیٹیکل افسر بصرہ میں رہتا تھا، وہ بھی وہاں سے اٹھ کر جزیرہ فیلکہ[۱] میں آ گیا۔ جو بندرگاہ کویت کے دہانے میں واقع ہے۔ اگرچہ انگریزی اثر خاصا ترقی کر گیا تھا، مگر ۱۸۲۹ء میں کویت نے ترکوں کی سیادت قبول کر لی اور پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست تک یہی صورت قائم رہی۔

۱۸۵۰ء میں ایک برطانوی جو تیل نے تجویز پیش کی کہ وادی فرات میں ریلوے بنائی جائے تو اس کا آخری سٹیشن کویت ہونا چاہئے۔ یہی تجویز بعد میں

(بقیہ صفحہ ۲۳۲) ملوک العرب جلد دوم صفحہ ۲۱۸، صفحہ ۲۱۹ (۱) Failaka

حافظ وہبہ نے لکھا ہے کہ یہ جزیرہ شہر کویت سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر ہو گا۔ (جزیرۃ العرب صفحہ ۱۹۳)

روسیوں نے اپنا لی یا اور اس کے مطابق ۱۹۰۱ء میں جرمنوں نے برلین سے بغداد تک ریلوے لائن بنانی چاہی تھی۔ اس کا بھی آخری سٹیشن کویت ہی تجویز کیا تھا۔ انگریز، ترکوں کے خلاف شیخ کویت کے حامی بن ہی چکے تھے جب خلیج فارس کے بارے میں روس کے عزائم کی شہرت ہوئی تو شیخ مبارک والی کویت نے جنوری ۱۸۹۹ء میں انگریزوں سے نیا معاہدہ کر لیا جس کا مفاد یہ تھا کہ شیخ نہ اپنے ملک کا کوئی حصہ کسی دوسری حکومت کے (انگریزوں کے سوا) حوالے کرے گا اور نہ کسی دوسری حکومت کا نمائندہ اپنے ہاں ٹھہرائے گا جب تک برطانیہ سے اختیار نہ لے لے گا۔ برطانیہ نے کویت کے لیئے ایک رقم بہ طور امداد منظور کی۔ ساتھ ہی اتنا سامان جنگ پہنچا دینے کا اقرار کر لیا، جو والی کویت کو آل رشید کے حملوں کی روک تھام کے قابل بنا سکے۔ ۱۹۰۴ء سے برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کو کویت میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی فوج وہاں جا ٹھہری تھی تاکہ ترکوں کی ناکہ بندی کی جا سکے۔

شیخ مبارک مرحوم شاہ ابن سعود کے والد (امام عبدالرحمٰن) کا عزیز دوست تھا اور جب سعودی ریاض سے نکالے گئے تو شیخ کویت نے انھیں اپنے ہاں پناہ دے دی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں ایک مرتبہ امام عبدالرحمٰن اور شیخ مبارک نے مل کر ریاض پر قابض ہونے کی ناکام کوشش کی تھی۔ ۱۹۰۲ء میں ابن سعود (عبدالعزیز مرحوم) نے کویت ہی سے اٹھ کر ریاض پر کامیاب حملہ کیا اور وہ شہر پر قابض ہو گیا، جہاں سے اس کی ترقی اور عروج کا آغاز ہوا۔ دو گھرانوں میں دوستانہ تعلقات کے باوجود اخوان کی طرف سے کویت پر حملے ہوتے رہے۔ اسی

زمانے میں اہل کویت نے شہر کے گرد بارہ فٹ اونچی فصیل بنائی تھی۔ اس کا گھیر دو میل ہے۔ نیز اس میں پانچ بڑے اور ستاون چھوٹے برج ہیں۔

دسمبر ۱۹۲۲ء میں بر مقام عقیر[1] ایک کانفرنس ہوئی تھی تاکہ نجد، کویت، عراق اور بحرین کی سرحدوں کا فیصلہ ہو جائے۔ سرپرسی کاکس اس زمانے میں عراق کا ہائی کمشنر تھا۔ وہی یہ کانفرنس منعقد کرنے کا ذمہ دار تھا۔ ابن سعود کے علاوہ اس میں عراق کی طرف سے صادق بے، کویت کی طرف سے میجر مور[2] (برطانوی پولیٹکل ایجنٹ) اور بحرین کی طرف سے کرنیل ڈکسن[3] شریک ہوئے تھے۔ کئی روز تک بحثیں جاری رہیں۔ دور حاضر کے اصول کے مطابق ایسی حد بندی اس سرزمین میں بہت مشکل تھی۔ جہاں خانہ بدوش قبیلے دور دور تک آزادانہ پھرتے رہتے تھے۔ باقی حدیں تو طے ہو گئیں۔ البتہ دو حلقوں کا معاملہ باقی رہا۔ سرپرسی کاکس کی تجویز کے مطابق یہ فیصلہ ہو گیا کہ ان حلقوں کو فی الحال غیر جانبدار حلقے قرار دیا جائے۔ نجد، کویت اور عراق کے قبائل ان میں آزادانہ آجا سکیں اور اگر ان میں سے تیل نکل آئے تو نصف علاقے کے تیل کا مالک ابن سعود ہو اور نصف کے مالک عراق و کویت سمجھے جائیں۔

کویت کی بندرگاہ سے بہت سے من چلے مسافر دور دور کی سرزمینوں میں گئے۔ وہاں سمندر میں سفر کرنے والی کم و بیش ایک سو کشتیاں موجود ہیں جو

---

[1] عقیر ایک زمانے میں نجد کا مشہور مقام تھا۔ یہ ظہران کے جنوب میں ہے۔ اب دوسرے مقامات کی ترقی کے باعث اس کی شہرت ماند پڑ گئی۔

[2] Moore

[3] Dickson

پچھتر ٹن سے تین سو ٹن تک وزنی ہوں گی۔ اور بندرگاہ کا کنارا ایک وسیع گودی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مشرقی گوشے میں برطانوی ریزیڈنسی واقع ہے اور مغربی گوشے میں امریکی ہسپتال ہے۔ جہاز کا ناخدا یعنی کپتان ہمیشہ کویت کے کسی ممتاز گھرانے کا فرد ہوتا ہے۔ ناخدا کے بیٹے چھ سال کی عمر سے سمندر کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اور اٹھارہ سال کی عمر تک اپنی کشتی تیار کرا لیتے ہیں۔ یہ لوگ ملاح کی حیثیت میں کام کرنے کو اپنے وقار کے منافی تصور کرتے ہیں۔

کویت میں لکڑی نہیں ہوتی اور کشتی سازی کے لیے پوری لکڑی ہندوستان سے منگوائی جاتی ہے۔ مستول اور عرشے میں ملیبار کا ساگوان استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر کشتی پر مچھلی کا تیل اس طرح مل دیا جاتا ہے کہ پانی اس میں سرایت نہیں کر سکتا۔ بادبان اور دوسرا سامان ملاح خود تیار کرتے ہیں۔

خلیج فارس میں جو کشتیاں ابتدائی زمانے سے استعمال ہوتی رہی ہیں، انھیں "بغلہ" کہتے ہیں۔ ان کے دو مستول ہوتے ہیں۔ سامنے کے حصے میں نہایت خوبصورت خم دے دیا جاتا ہے۔ پچھلے حصے میں پانچ کھڑکیاں رکھتے ہیں۔ یہ پرتگیزوں کی مشہور کشتی "کیرول"[1] کی نقل تھی۔ جو سولھویں صدی عیسوی میں خلیج فارس کے اندر آتی جاتی تھیں۔ چونکہ اس کشتی کی تعمیر پر بہت روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ لہٰذا اس کی جگہ دو مستول والی ایک اور کشتی بننے لگی جو "بوم" کے نام سے مشہور ہوئی۔ موتی نکالنے کے لیے اس سے بھی چھوٹی کشتیاں استعمال ہوتی ہیں جنھیں "جالبوت"

---

[1] Caravel یہ پرتگال یا ہسپانیہ میں ایک قسم کی کشتی یا چھوٹا جہاز تھا جو سترھویں صدی عیسوی تک رائج رہا۔

کہتے ہیں یہ سنبوق، نام کی جو کشتیاں بحیرہ قلزم میں دیکھی جاتی ہیں، وہ شاید کویت میں کبھی نہیں بنیں۔

بڑے سمندروں میں جانے آنے والی کشتیاں نیوانے میں ناخدا عموماً قرضدار ہو جاتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں یہ کشتیاں کنارے پر بندھی رہتی ہیں۔ اور ان کے عرشے کو کھجور کے پتوں سے ڈھانپ دیا جاتا ہے تاکہ سورج کی حدت اثر انداز نہ ہو سکے۔ ملاح اس زمانے میں موتی نکالتے رہتے ہیں۔ ستمبر میں گرمی کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور موتی نکالنے والے ملاح واپس آجاتے ہیں۔ پھر ٹھہرائی ہوئی کشتیوں میں سرگرمی سے کام شروع ہو جاتا ہے چنانچہ انھیں شط العرب لے جاتے ہیں۔ وہاں سے کھجوریں خرید لی جاتی ہیں اور ملاح بھی کچھ سامان لے لیتے ہیں۔ بر طور اوسط ایک کشتی میں دو ہزار بوریاں رکھی جاتی ہیں۔ دخانی جہاز اس لیے ان کشتیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کہ کشتیاں سامان بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں علاوہ بریں دکانوں کا کام بھی دیتی ہیں۔

ہر کشتی پر ایک مؤذن ضرور ہوتا ہے۔ نماز کا وقت آتے ہی اذان کی صدا گونجتی ہے۔ تو تمام عرب وضو کر کے عرشے پر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ کھانا تیار ہوتا ہے تو سب مل کر کھا لیتے ہیں۔ پھر میٹھی چائے کا دور چلتا ہے۔ نوجوان ملاح بڑے ملاحوں کو کھانا کھلاتے ہیں جو پانچ منٹ سے بھی کم میں ختم ہو جاتا ہے۔ پہرے کے لیے باریاں مقرر ہو جاتی ہیں۔ سورج چڑھ آتا ہے تو ابلے ہوئے چاول اور خشک مچھلی کھانے کو ملتی ہے۔ پھر ملاح حقہ پیتے ہیں اور اپنا سفر و سامان درست کرتے رہتے ہیں۔ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں باقاعدہ باجماعت ادا کی جاتی ہیں

مغرب کے بعد چاول، گھی اور کسی قدر مچھلی دی جاتی ہے۔ پھر ہر ملاح شب بخیر کہہ کر سو جاتا ہے۔ البتہ پہرے والے اور کشتی کھینے والے باری باری کام جاری رکھتے ہیں۔

بعض کشتیاں سیدھی عدن یا مشرقی افریقہ کی بندرگاہوں میں پہنچ جاتی ہیں، بعض جنوبی عرب کے دو ایک ساحلی مقامات پر اس غرض سے رُک جاتی ہیں کہ مسافروں کو سوار کرالیں۔ مکلا (حضرموت) سے مشرقی افریقہ تک خوراک کے بغیر کرایہ آٹھ روپے فی کس ہے اور خوراک کے ساتھ نو روپے فی کس، عورت سے بارہ روپے کرایہ لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک ایک کشتی پر ایک سو اسی [۱۸۰] مسافر سوار کر لیئے جاتے ہیں۔ حضرموت سے کشتی عدن جاتی ہے اور وہاں سے چل کر صومالی لینڈ کے اس حصے میں ٹھہرتی ہے، جو پہلے اطالویوں کے قبضے میں تھا۔ مشرقی افریقہ کے ساحل پہ پہنچ کر کشتی کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ جہاں رکتے ہیں، وہاں عراق کی کھجوریں یا ایرانی قالین یا کویت اور عدن سے خریدی ہوئی چیزیں فروخت کرتے جاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ موقع ملتے ہی سامان ناجائز طریق پر بھی بیچا جاتا ہے۔ مثلاً صومالی باشندے چھوٹی سی ناؤ میں بیٹھ کر چپ چاپ کشتی کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور کپڑے کے تھان لے کر ان کے اوپر مچھلیاں بھرتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ناخدا کو زیادہ نفع مل جاتا ہے۔ خود عرب ملاح بھی چھپا کر سامان ساحل پر لے جاتے ہیں اور اس کے بدلے میں مختلف چیزیں خرید لاتے ہیں۔ جب کوئی بڑا جرم سرزد ہوتا ہے، مثلاً کسی اجنبی بندرگاہ سے نمک بھر کر لے آتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں تو جرمانہ ہوتا ہے۔ اور ناخدا پھر پھر کر اپنے ہمسر ناخداؤں سے جرمانہ پورا کرنے کے لیئے رقمیں فراہم کرتا ہے۔ پہلے غلاموں

کی تجارت بھی ہوتی تھی۔ کانگو کے صحت مند جوان یا ارٹیریا سے قہوہ سے ینگ دوشیزائیں خاصی قیمت پاتی تھیں۔ اس طرح ناجائز اسلحہ کا بیوپار بھی خاصا سود مند تھا، مگر اب ان بیوپاریوں کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہی۔

بہر حال صومالی لینڈ سے کشتی لاموپہنچتی ہے، جو ساحل کینیا کے سامنے ایک جزیرہ ہے۔ وہاں سے یہ لوگ ممباسا جاتے ہیں۔ اور ممباسا سے زنجبار جسے ان کی منزل مقصود سمجھنا چاہیئے۔ ممباسا میں بہت سے عرب جا بسے ہیں۔ بندرگاہ کے حصے کی تجارت زیادہ تر انھی کے ہاتھ میں ہے۔ بعض چوکیدار بن گئے۔ بعض نے قہوہ بیچنا شروع کر دیا اور بعض نے دکانیں کھول لیں۔ جب کوئی عرب مستقل دکاندار بن جاتا ہے تو اپنے بھائی یا کسی دوسرے رشتہ دار کو بلا کر دکان سنبھال دیتا ہے اور خود ایک سال کے لیے گھر ہو آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ جس دکان کا سامان بہ مشکل پچیس ڈالر کا ہوگا، وہ خاندان کے تمام مردوں کو باری باری افریقہ تک سفر کا موقع بہم پہنچا دیتی ہے۔

عربوں کے بیان کے مطابق واسکوڈی گاما زنجبار پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا، پھر ایک عرب ماہر بحریات ابن ماجد کی رہبری میں ہندوستان پہنچا تھا۔ ابن ماجد غالباً الحسا کا باشندہ تھا[1]۔ اب عرب گھر سے سمندروں میں جہازرانی کا فن بھول گئے ہیں۔

---

[1] احمد ابن ماجد نجدی جو یقیناً نجد کے صوبہ الحسا کا باشندہ تھا، پندرھویں صدی عیسوی کا بہت بڑا ماہر بحریات تھا خصوصاً بحر ہند کے متعلق اسے جو معلومات حاصل تھیں، وہ اس دور میں یا اس سے پیشتر کسی کو حاصل نہ تھیں۔ اور اسے "اسد البحر" (سمندر کا شیر) کا خطاب دے دیا گیا تھا۔ البتہ یہ یقینی نہیں کہ احمد ابن ماجد نے زنجبار سے (باقی صفحہ ۲۴۱)

اگرچہ صدیوں تک وہ ریاضی اور جہازرانی میں دنیا بھر کے رہنما رہے اور اپنے جہاز
بے تکان سنگاپور، ملایا اور چین تک لے جاتے تھے۔

زنجبار پہنچ کر کشتی کو خوب صاف کیا جاتا ہے نیز اس کی مرمت کر لی جاتی ہے
واپسی میں عموماً لکڑی کی لمبی لمبی بلیاں بھر لی جاتی ہیں جو زنجبار کے اندر جا کر حاصل
کی جاتی ہیں جس دریا کے راستے اندر جاتے ہیں اس میں نگرمچھ بھی بہت ہیں جونکیں
بھی بے اندازہ ہیں۔ آس پاس جنگل میں مچھروں کی بھی کمی نہیں۔ ساحلی مزدور ساتھ
لے لیے جاتے ہیں۔ اور بلیاں کاٹ کاٹ کر چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بھر کر لے

(بقیہ صفحہ ۲۳۹) واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی تھی۔ اغلب خیال یہی ہے کہ احمد ابن ماجد موزمبیق
اور زنجبار کے بیچ میں سے کسی بندرگاہ سے روانہ ہوا تھا۔ خود اس کی رہنمائی کا قصہ بھی عجیب
ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پرتگیزوں نے اسے روپیہ دیا تھا۔ بعض کہتے ہیں شراب پلا کر بے ہوش
کر لیا اور جہاز میں بٹھا کر روانہ ہو گئے۔ جب اسے ہوش آیا تو واپسی کی کوئی صورت نہ تھی
لہذا رہنمائی کی، اور واسکوڈی گاما کو کالی کٹ پہنچا دیا۔ بعض جوشیلے آدمیوں نے اس غریب
پر غداری کا الزام لگا دیا حالانکہ اس کے لیے کوئی بھی گنجائش موجود نہ تھی۔ سوچنے کی بات
ہے۔ کہ جب واسکوڈی گاما راس امید کا چکر کاٹ کر افریقہ کے مشرقی ساحل پر آ پہنچا تھا تو
کیا وہ رہنمائی کے بغیر آگے نہ جا سکتا تھا؟ سیدھا نہ جاتا، تو افریقہ کے ساحل کے ساتھ عرب
کے ساحل پر پہنچ جاتا اور اسی طرح ہندوستان آ جاتا۔ نیز اس کے ساتھ صرف تین چار جہاز تھے۔
کسے خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چھوٹا سا بیڑا آگے چل کر اہل مغرب کے لیے راستے کھول دے گا۔ اور
وہ سمندروں اور اقلیموں کے مالک بن جائیں گے۔ بہرحال احمد ابن ماجد کی رہنمائی مسلم ہے۔
اگر یہ رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو یقیناً پرتگیزوں کو خاصی دیر تک مزید جدوجہد کرنی پڑتی۔ (باقی صفحہ ۲۴۱)

آتے ہیں۔ اس اثنا میں ہوا کا رُخ بدل جاتا ہے اور واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔
سب خوش خوش گھروں کو لوٹتے ہیں۔ بعض کشتیاں واپسی میں بھی عدن یا حضر موت
کی بندرگاہوں میں ٹھہر جاتی ہیں۔ مگر عام طریقہ یہی ہے کہ سب کا کویت کا رُخ کر لیا جاتا
ہے۔ مسقط یا آس پاس کے دیہات والے جو بلیاں خریدتے ہیں وہ مطرح[1] میں فروخت
کی جاتی ہیں، لیکن اس تجارت کے لیے بحرین کی منڈی زیادہ نفع بخش ہے، جہاں
فرمانروائے دولت سعودیہ کے ایجنٹ یا شیخ بلیوں کی اچھی قیمت ادا کرتے ہیں۔ کویت
کے قریب پہنچنے پر کویتی پرچم کشتی پر اڑنے لگتا ہے۔ ڈھول بجاتے اور گاتے ہوئے یہ لوگ
گھر آتے ہیں اور ان کا استقبال بھی بڑی دھوم سے کیا جاتا ہے۔ دس مہینے سفر میں
لگ جاتے ہیں اور اس میں کم و بیش دس ہزار روپے منافع ہوتا ہے۔ اس میں سے
راستے کا خرچ نکال لیا جاتا ہے اور چار ہزار روپے کشتی کا مالک لے جاتا ہے۔ چار ہزار
روپے ناخدا اور ملاحوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک ملاح کا حصہ ڈیڑھ سو روپے
کے قریب آ جاتا ہے۔

اہل کویت کو ابتدا سے سمندر کے ساتھ گہری وابستگی رہی ہے لیکن جب
سے وہاں تیل دریافت ہوا ہے۔ تجارت یا کشتی سازی یا موتیوں کی برآمد پر زوال
آ گیا ہے۔ اور ریاست کے مزدوروں کا بڑا حصہ تیل کی صنعت میں مصروف ہو گیا ہے

(بقیہ صفحہ ۲۴۰) کے بغیر ہندوستان پہنچنا نصیب نہ ہوتا۔ احمد ابن ماجد کی لکھی ہوئی کتابیں اور
رسالے فرانس میں شائع ہو چکے ہیں۔ [1] مطرح مسقط کے شمال میں تھوڑے فاصلے پر ہے
ابن بطوطہ نے اسے اپنے نقشے میں مطرا لکھا ہے۔ میرے نزدیک حافظ وہبہ کا تلفظ یعنی
مطرح صحیح ہے۔

۱۹۲۹ء میں گلف آئل کارپوریشن[۵۱] نے کویت سے تیل کا اجارہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن معلوم ہوا کہ کویت اور برطانیہ کے معاہدے میں جو دفعہ قومیت کے متعلق تھی، شیخ کویت کے برطانوی مشیروں نے اس پر اصرار کے باعث راستہ روک رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ کی کمپنیوں کے سوا کسی کو کویت میں اجارہ مل ہی نہیں سکتا۔ آخر طویل گفت وشنید کے بعد، جس میں امریکی وزارت سے بھی مدد لی گئی، ایک سمجھوتا ہوا اور کویت آئل کمپنی[۵۳] کے نام سے دسمبر ۱۹۳۴ء میں ایک نئی کمپنی بنی۔ اس میں نصف حصے گلف آئل کارپوریشن کے تھے اور نصف اینگلو ایرانی آئل کمپنی کے۔ اس کمپنی نے پچھتر سال کے لیئے کویت میں چھ ہزار مربع میل کا اجارہ لے لیا۔

تیل کی دریافت کے لیے برمانے کا سلسلہ مئی ۱۹۳۶ء میں شروع ہوا اور سات ہزار نو سو پچاس فٹ کی گہرائی پر پہنچ کر اسے اپریل ۱۹۳۷ء میں چھوڑ دیا گیا۔ دوسرے آزمائشی برمانے پر برغان میں تیل کا بہت بڑا ذخیرہ مل گیا اور تیل نکالنے کا انتظام مئی ۱۹۳۸ء میں مکمل کر دیا گیا۔ یہ ذخیرہ تین ہزار چھ سو بانوے فٹ کی گہرائی پر تھا۔ اس کی بڑائی کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تیل کے جو ذخیرے اب تک معلوم کیئے جا چکے ہیں ان

---

۵۱ Gulf Oil Corporation

۵۲ اس واقعہ سے مراد یہ ہے کہ برطانیہ نے معاہدہ کرتے وقت اپنے سوا تمام اجنبیوں کو بلا منظوری اجارہ دینے کی ممانعت کر دی تھی۔ گلف آئل کمپنی امریکی تھی لہذا برطانوی مشیروں نے شیخ پر واضح کر دیا کہ یہ اجارہ اصل معاہدے کے خلاف ہوگا۔

۵۳ Kuwait Oil Company.

سب کی مقدار چوبیس ارب بیرل ہے۔ ادھر تیسری برغان کا ذخیرہ بارہ ارب بیرل سے کم نہ ہوگا۔ کویت کی آبادی اگرچہ بڑھ رہی ہے۔ لیکن ابھی تک دو لاکھ سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس ریاست میں تیل کے ذخیرے نے فی کس اتنی بڑی آمدنی کا بندوبست کردیا ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے ملک کے افراد کو یہ درجہ حاصل نہیں۔

جولائی ۱۹۴۳ء تک تو چشمے بر آئے جا چکے تھے۔ پھر دوسری جنگ عظیم کے حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ کام بند کر دینا پڑا[1]۔ جون ۱۹۴۵ء میں دوبارہ کام شروع ہوا اور ۱۹۴۶ء میں پہلا ٹینکر احمدی کی بندرگاہ سے کویت کا خام تیل لے کر روانہ ہوا۔ گلف آئل کمپنی نے زیادہ ماہرین فن اور ساز و سامان مہیا کیا۔ اس سامان کے لئے کم و بیش آٹھ آٹھ باربردار جہاز خلیج کویت میں یا احمدی کی بندرگاہ میں ٹھہرے رہتے یہ سب لوہے کے نل (پائپ)، تعمیر کا سامان، ٹریکٹر اور دوسری چیزیں پہنچاتے تھے۔

دولت سعودیہ میں ارامکو نے سڑکوں کی تعمیر سب سے آخر میں رکھی تھی۔ لیکن کویت آئل کمپنی نے سڑکیں سب سے پہلے بنائیں۔ چنانچہ کویت سے ہوائی اڈے تک، نیز کویت سے تعمیری مرکز، نیز برغان کے ذخیرۂ نفط تک نہایت عمدہ اور پختہ سڑکیں بن گئی ہیں۔ برغان کے مشرق میں ایک پہاڑی پر تیل جمع

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ہٹلر کی فوجیں ایک طرف روس میں شالین گراڈ تک اور دوسری طرف مصر میں العلمین تک پہنچ گئی تھیں۔ ان کی پیش قدمی نہ رکتی تو اندیشہ تھا کہ وہ ایک طرف سویز کو عبور کرکے شام میں اور دوسری طرف قفقاز کو عبور کرکے ایران میں پہنچ جائیں گی اور انھیں تیل کے ذخیرے مفت مل جائیں گے۔ خود انھیں کچھ محنت نہ کرنی پڑتی۔

رکھنے کے ٹینک بنا دیئے گئے ہیں جن پر ایلومینیم کا پینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ صحرا کے دھندلکے میں سورج کی تیز روشنی کے باعث ان سے خیرہ کن چمک پیدا ہوتی ہے پاس ہی احمدی نام نیا شہر آباد ہو گیا ہے جس میں کمپنی کے ملازم رہتے ہیں۔ اس کے بازار اور گلیاں پختہ ہیں۔ یہاں ہر قسم کی سہولتیں مہیا ہیں۔ مشینوں کی مرمت کے لیے وسیع دکانیں ہیں۔ نہایت عمدہ بنگلوں کی قطاریں ہیں۔ جنہیں ٹھنڈا رکھنے کا بہت اچھا انتظام کر لیا گیا ہے۔

سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ تازہ پانی ناپید تھا۔ کمپنی نے کئی کنوئیں کھدوائے۔ لیکن ان میں سے کھارا پانی نکلا لہذا میٹھا پانی ٹینکروں میں بھر بھر کر لایا جاتا تھا۔ اب ایک نئی مشین منگوا لی گئی ہے۔ جو پانچ لاکھ گیلن سمندری پانی روزانہ صاف کر لیتی ہے۔ اس نے پانی کی بہت سی ضرورتیں پوری کر دی ہیں البتہ ابھی تک باغوں کو زیادہ پانی نہیں مل سکتا اور ریاست بھر کی ضروریات کا بھی بندوبست نہیں ہوا۔ مسئلے کا مستقل حل یہ ہے کہ شط العرب سے بڑے نلوں (پائپ لائن) یا نہر کے ذریعے سے پانی لایا جائے۔ متعدد کمپنیاں اس کے لیئے اجارہ حاصل کرنے کی خواہاں ہیں۔

خوراک کا مسئلہ پانی سے کم مشکل نہ تھا۔ زیادہ تر غذائی جنسیں عراق، ہندوستان، انگلستان، آسٹریلیا بلکہ امریکہ سے لانی پڑتی تھیں۔ دمشق سے تازہ سبزیاں لانے کے لیئے جنوری ۱۹۴۹ء میں ایک منصوبہ مکمل ہوا اور ٹرکوں کا قافلہ بھیجا گیا۔ جو راستہ ان ٹرکوں نے اختیار کیا۔ وہ دو ہزار دو سو کلو میٹر (پونے چودہ سو میل) لمبا تھا۔ جو پہلے موٹر گاڑیوں نے کبھی عبور نہ کیا تھا۔ جب پہلی مرتبہ یہ ٹرک سبزیاں لے کر

آئے تو کویت میں شادمانی کی لہریں دوڑ گئیں۔ ہجوم نے خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے ٹرکوں کو گھیرے میں لے لیا۔ شیخ کویت نے ان کے اعزاز میں جشن منایا۔ اب ہوائی جہازوں کے ذریعے سے غذائی جنسیں لبنان اور شام سے چند گھنٹے میں کویت پہنچ جاتی ہیں۔

ریاست کویت کے جنوب میں دولت سعودیہ اور کویت کا جو غیر منقسم حلقہ ہے، وہاں بھی تغیر کی ہوائیں پہنچ گئی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد شیخ کویت نے یہ ارادہ ظاہر کر دیا کہ اس حلقے کے کویتی نصف میں تیل کا اجارہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے شمال میں برغان کا چشمہ تھا، اور اس سے کسی قدر جنوب میں ارامکو (دولت سعودیہ والی کمپنی) ایک بیش بہا ذخیرہ دریافت کر چکی تھی، لہذا غیر منقسم حلقے میں تیل نہ ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ انگریز، فرانسیسی، ولندیزی اور امریکی پہنچے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولیاں دینے لگے۔ آخر جولائی ۱۹۴۸ء کو رالف کے ڈیویز[1] نے اعلان کیا کہ امریکہ کی انڈیپنڈنٹ آئل کمپنی[2] کی بولی سب سے زیادہ رہی تو اس اجارہ کی شرطیں واضح کی گئیں، لیکن افواہ مشہور تھی کہ شیخ کو ستر لاکھ ڈالر سے بھی اوپر رقم فوراً دے دی گئی۔ اور ۱۹۴۹ء میں تیل نکلنا شروع ہوگا۔ تو شیخ فی بیرل پینتیس سنٹ کی رقم مستقل طور پر رائلٹی کے سلسلے میں لے گا۔ اس کے ساتھ بونس بھی شامل ہوگا۔ ساتھ ہی ابن سعود نے اپنا نصف حصہ اجارے پر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس

(i) Ralph K. Davies (ii) American Independent Oil Company

میں سات کمپنیوں نے کوشش کی۔ آخر مارچ ۱۹۴۹ء میں پیسفک ویسٹرن آئل کمپنی[لف] کو اجارہ مل گیا۔ اس کی شرطیں یہ بتائی جاتی ہیں کہ ایک کروڑ ڈالر کی رقم فوراً دے دی گئی اور پچپن سنٹ فی بیرل رائلٹی مقرر ہوئی۔ مشرق قریب میں اتنی رائلٹی آج تک کسی کو نہیں دی گئی۔

اس اثنا میں امریکن انڈی پنڈنٹ کمپنی نے کام شروع کر دیا۔ انجنیروں موٹروں ڈرلروں ریاتیے والے کے سے بھرا ہوا ایک جہاز دسمبر ۱۹۴۸ء میں کویت پہنچ گیا اور ماہرین ارضیات ضروری سامان لے کر ۱۹۴۹ء کے وائل میں موقع پر پہنچ گئے دیکھ بھال کا کام موسم بہار کے اواخر میں پورا ہو گیا۔ سردیاں شروع ہوئیں تو برملنے وڈرلنگ کا آغاز ہو گیا۔

امریکن انڈی پنڈنٹ اور پیسفک ویسٹرن نے کاروباری معاہدہ کر لیا تھا۔ ادھر کویتی حلقے میں کارکنوں کے رہنے کا انتظام کر دیا گیا۔ ابتدا میں جہاں جہاں برما یا گیا، کچھ نہ کچھ نکلا۔ اس اثنا میں کمپنی نے شیخ کویت کو ایک عالی شان تفریحی کشتی بطور ہدیہ پیش کی جو ہر قسم کے سامان سے آراستہ تھی۔ اس میں ایک دربار ہال بھی تھا۔ ایک جگہ بھیڑیں اور دنبے رکھنے کے لیے بنا دی گئی تھی۔ باورچی خانہ ایسا بنایا گیا تھا جس میں بہ یک وقت تین تین دنبے تلے جا سکیں۔ اس تحفے کا بڑا پروپگنڈا ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں ایک چشمہ مل گیا جس کا تیل عمدہ تھا اور مقدار بھی خاصی بڑی تھی۔

کویت کا اصل مسئلہ محض تیل کے چشموں کی دریافت نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ رائلٹی کی جو رقمیں ملتی ہیں۔ انہیں صحیح طریق پر صرف کرنے کا مشورہ شیخ کو دیا جائے

لف pacific western oil company

جب تک تیل نہیں نکلا تھا۔ رعایا بھی غریب تھی اور شیخ بھی قرضدار تھا۔ اب افلاس کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ شیخ اور اس کے خاندان کو محلوں، موٹروں، کشتیوں اور قصروں کو ٹھنڈا رکھنے کے سامانوں کا جو لپکا تھا، وہ بھی ایک حد تک تسکین پا چکا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ قومی فلاح کے لیئے منصوبہ بندی کی جائے جو قابل قدر اصلاحات ہو چکی ہیں، ان کی کیفیت یہ ہے:۔ ایک نیا ہسپتال، متعدد نئے سکول، کسٹم کے مرکزوں کی از سر نو تعمیر، شیخ کے محل سے کویت شہر کے مرکزی چوک ایک شاندار ایویی نیو کا انتظام۔ کام کی رفتار البتہ ذرا سست ہے۔ بعض پرانی عمارتیں توڑ کر شہر کی پیچ پیچ و خم گلیاں ختم کر دی گئی ہیں۔ نئے انداز کی عمارتیں بنانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پرانے شہر کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا جائے اور فصیل سے باہر نکل کر ایسی نئی آبادی کا بندوبست کیا جائے جس مفصلاتی آبادی میں سڑکیں سیدھی اور پختہ ہوں، جابجا پارک بنے ہوئے ہوں۔ پانی کا عمدہ انتظام ہو شیخ کے عزیزوں اور رشتہ داروں۔ دولتمند تاجروں نیز تیزی سے بڑھنے والی اجنبی آبادی کے لیئے صد درجہ عمارہ باغوں والے شہر مہیا کر دیے جائیں۔ دولت سعودیہ کی حکومت نے جدہ کے سلسلے میں یہی طریقہ اختیار کیا۔

تعلیم کے لیئے اچھے سرمایہ کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ بارہ نئے سکول کھولے جا رہے ہیں۔ ان کے لیئے بھی سابقہ سکولوں کی طرح مصری معلم منگوائے جائیں گے۔ اور ان میں مصری نصاب کے مطابق تعلیم دی جائے گی۔ کویت میں فی الحال ثانوی تعلیم تک کا انتظام ہے۔ لڑکیاں ابتدائی درجوں تک تعلیم پا سکتی ہیں۔ کالج کا انتظام نہیں ہوا۔ اس کی جگہ قاہرہ میں "ایوان کویت" کے نام سے ایک عمارت بنا دی گئی

ہے، جس میں کم و بیش پچھتر طلبہ ہر سال اعلی تعلیم پاتے ہیں۔ گویا کویت اور بحرین تعلیم میں پورے جزیرۃ العرب سے آگے ہیں[۱]۔

پانی اور بہتر مکانوں کے انتظام کے بعد محکمہ طبابت پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ شروع میں معالجات کا بڑا مرکز امریکی مشن کا ایک ہسپتال تھا جو ۱۹۰۳ء میں قائم ہوا۔ پھر طاعون پھوٹ پڑا۔ سمجھا گیا کہ یہ طاعون مشنریوں نے پھیلایا ہے۔ چنانچہ شیخ نے حکم دے دیا کہ تمام مشنری ڈیرہ ڈانڈا اٹھا کر نکل جائیں۔ ۱۹۰۸ء میں خود شیخ بیمار ہو گیا اور اسے ڈاکٹر بینٹ[۲] کے علاج سے صحت ہوئی۔ جو بصرہ کے امریکی مشن ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ شیخ نے اس معالجے کے شکریے میں مشنریوں کو ہسپتال کے لیے زمین دے دی۔ چنانچہ بصرہ کے مشن سے ڈاکٹر بیلرے[۳] کویت پہنچا۔ اور ۱۹۱۲ء میں نیا ہسپتال قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر ای۔ ای کیلورلی[۴] (لیڈی ڈاکٹر) نے عورتوں کا علاج شروع کیا اس کے شوہر نے کتابوں کی دکان کھول لی اور وہ نوجوانوں کو نوشت و خواند سکھانے لگا۔

۱۹۵۰ء کے اوائل میں کویت میں تین امریکی ڈاکٹر تھے اور مشن کا اصل کام علاج معالجے کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو مریض سال بھر میں آئے اور دوائیں لیں، ان کی تعداد باسٹھ ہزار تھی۔ تین سو بڑے آپریشن (عمل جراحی) کیے گئے، تین سو چودہ چھوٹے آپریشن اور بیس ہزار ٹیکے صرف ہسپتال میں لگائے گئے۔ زنانہ ہسپتال کے مریضوں کی تعداد اس سے نصف تھی۔

سڑکوں کی توسیع سے ریاست کو فائدہ پہنچے گا۔ ایک سڑک شمالی سمت

---

[۱] یہ حالات ۱۹۵۲ء تک کے ہیں۔
(iii) Bylray (VI) E. E. Calverly

میں کویت سے بصرہ تک بن جانی چاہیئے اور ایک سڑک جنوب میں راس الشعب تک جانی ضروری ہے۔ جہاں سے دولت سعودیہ کی پائپ لائن شروع ہوتی ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ آیا کویت سے بصرہ تک ریلوے لائن مناسب ہوگی۔ ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ ہوائی اڈا اول درجے کا بن جائے۔ کویت آئل کمپنی نے ایک اڈا شہر سے اٹھ میل کے فاصلے پر بنا دیا ہے، جہاں چار انجن والے ہوائی جہاز اتر سکتے ہیں۔ یہ سوال غور طلب ہے کہ آیا کویت کو بھی دولت سعودیہ کی طرح اپنے ہوائی جہاز چلانے چاہیئیں؟

۱۹۳۸ء میں شیخ کویت نے ایک قانون ساز مجلس اور ایک مشورتی کونسل بنائی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ قانون ساز مجلس کے ممبر چنے جائیں گے۔ اور وہ مجلس پارلیمنٹ کے وظائف ادا کرے، لیکن مجلس کے قائم ہوتے ہی ممبروں کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ کی رائے تھی کہ کویت کا الحاق عراق سے کر دیا جائے اور دوسرے کی رائے تھی کہ شیخ کے ماتحت پوری خود مختاری مل جانی چاہیئے۔ نوجوان کویتیوں کا گروہ، جو عراق کی طرف مائل تھا۔ مجلس میں اقتدار کا مالک بن گیا جب معاملات تعطل کی منزل میں پہنچ گئے تو مجلس توڑ دی گئی۔ اور از سر نو انتخاب ہوئے۔ لیکن نئی مجلس پہلی سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ اس نے ایک دستور تجویز کیا جس پر عمل ہوتا تو برطانیہ سے تعلقات کم تر رہ جاتے۔ اور ملک کے مالیے کا معتد بہ حصہ شیخ کے ہاتھ سے نکل کر فلاح عامہ میں صرف ہوتا۔ مارچ ۱۹۳۹ء تک سیاسی حالات خاصے خراب

۱۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ملک کے عوام کی بہبود کے خلاف نہ تھیں، مگر اجنبی اقتدار اور برسر حکومت طبقے کو عوام کی بہبود سے کہیں زیادہ اپنے خاص مقاصد کا خیال رہتا ہے اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اور عوام کے درمیان خلیج وسیع ہوتی جاتی ہے اور اسکا اثر نظام انتظامی و فلاحی مقاصد

ہو گئے ۔لہٰذا مجلس پھر توڑ دی گئی اور اس کے ممبروں کو قید کر دیا گیا ۔فسادات ہو لیے جنھیں شیخ کی فوجوں نے فرو کیا ۔اس سلسلے میں کچھ جانیں بھی تلف ہوئیں ۔

شیخ نے مجلس کے مجوزہ دستور کو مسترد کرتے ہوئے خود ایک دستور تیار کیا اور ایک محدود قانون ساز مجلس بنائی ۔یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کے فیصلے شیخ کی تصدیق کے بغیر نافذ نہ ہو سکیں گے ۔اس کے لیے بیس ممبر ایسے رکھے گئے جو رائے عامہ سے منتخب ہوں اور قریباً اتنے ہی ممبر شیخ نے خود نامزد کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا ۔ اگرچہ یہ دستور جاری ہے مگر ۱۹۳۹ء کے بعد مجلس کا کوئی اجلاس نہیں ہوا ۔مشورتی کونسل کے آٹھ رکن ہیں ۔مگر شیخ کے لیے اس کے مشورے ماننے بھی لازم نہیں ۔ اس طرح کویت کے نظام حکومت میں تغیر کی کوشش بے نتیجہ رہی ۔نوجوان کویتی گروہ کے ارکان عمر و دانش میں بڑھ گئے تھے اور انھیں اس امر کا انتظار کرنا پڑا کہ بوڑھا شیخ انتقال کر جائے گا تو پھر کوشش شروع کریں گے ۔اس اثنا میں معاشی دائرے کے اندر خاصی تبدیلیاں ہو گئیں ۔

نیا شیخ عبداللہ ابن سالم الصباح فروری ۱۹۵۰ء میں مسند نشین ہوا اور اس کی عمر چھپن سال کی تھی وہ اپنے پیشرو اور چچیرے بھائی سر احمد الجابر الصباح سے بھی زیادہ قدامت پرستانہ انداز میں زندگی بسر کر رہا ہے ۔اس نے تفریحی کشتی نائب السلطنت عراق[۱] کے ہاتھ فروخت کر دی ۔اور ذرا چھوٹے محل میں

---

[۱] نائب السلطنت عراق سے مراد عبدالالہ مرحوم ہے، جو مرحوم شاہ فیصل ثانی کے سرپرست کی حیثیت میں مدت تک عراق کا نائب السلطنت رہا ۔

منتقل ہوگیا۔ جہاں وہ اپنے اہل و عیال اور دوستوں کے درمیان اطمینان کی زندگی گزارتا ہے۔ اس کے پاس صرف چند موٹریں ہیں۔ البتہ اس کی خاص توجہ اس مقصد پر بھی ہوتی ہے کہ کویت کو ہر لحاظ سے مشرق قریب کی بہترین ریاست بنادے، جو دور حاضر کی خوبیوں سے مزین ہو۔ اسے ساڑھے سولہ کروڑ ڈالر کی رقم سالانہ رائلٹی کے طور پر ملتی ہے۔ وہ یقیناً اپنی غریب ریاست کو مشرق وسطیٰ میں اول درجے کی فلاحی ریاست بنا سکتا ہے۔

سراولیف کیرو نے اپنی کتاب "ویلز آف پاور" میں تین باتوں پر زور دیا ہے، اول مشرق وسطیٰ کے دفاع کے لیے بین الاقوامی تعاون کا بندوبست کیا جائے دوم اس حصے کے مزدوروں کی تنظیم و تقسیم پر خاص توجہ مبذول کی جائے سوم اس حصے کے سب سے بڑے ذریعہ ثروت یعنی تیل سے جو رقمیں حاصل ہوتی ہیں، ان کی زیادہ سے زیادہ مقدار بہتر طریق پر استعمال کی جائے۔

کویت کے مسائل دوسری ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ سہل اور آسان ہیں۔ اگر اس کی دولت کا ایک حصہ بھی ریاست کے مجموعی نشوونما و ارتقاء پر صرف ہو تو یہ امر ارباب اختیار کے دانش و تدبر کا ایک عمدہ ثبوت ہوگا اور ان لوگوں کے دلوں میں امید کی نئی روشنی پیدا ہو جائے گی، جو سمجھتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کا استحکام اس کی خوشحالی کا مترادف ہے۔

(i) Olaf Caroe (ii) Wells of Power
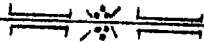
ضمیمہ

کویت کے تیل کی کیفیت پہلے بیان ہو چکی ہے۔ وہاں بھی ہندوستانی سکہ رائج اور پونڈ کے تبادلے کی شرح سوا تیرہ روپے کے قریب ہے۔ تمام مالی معاملات فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں۔ سمندر کے پانی کو صاف کرنے کے لیے پہلا کارخانہ ۱۹۵۴ء میں مکمل ہوا جو روزانہ دس لاکھ گیلن پانی صاف کرتا تھا۔ ایسا ہی ایک کارخانہ ۱۹۵۵ء میں لگا دیا گیا۔ اس طرح پانی کی قلت کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو گیا۔ بجلی ۱۹۵۳ء میں صرف سات ہزار سات سو پچاس کلو واٹ تھی جو ۱۹۵۵ء میں تیس ہزار کلو واٹ پر پہنچ گئی۔

تیرھواں باب:

معاہدہ ریاستیں

بحری قزاقی معمولی رئیس

جنوبی عرب میں اسے ایک بدیہی امر سمجھنا چاہیئے کہ ساحل جتنا زیادہ بنجر ہوگا۔ باشندے اتنے ہی زیادہ بحری قزاقی کو ذریعہ معاش بنا لیں گے[1]۔ رومیوں کے عہد اقتدار میں پلینی نے لکھا تھا:۔

مصر عرب کی جانب ہر سال بحری سفر کیئے جاتے ہیں۔ مگر جہازوں پر تیر اندازوں کے دستے متعین کرنے پڑتے ہیں ہم اس لئے کہ یہ سمندر بحری قزاقوں سے بھرے

---

[1] ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے پاس گزارے کے لیئے کچھ نہ ہوگا وہ دوسروں کے مال کی طرف ضرور متوجہ ہونگے ایسے جرائم کی ابتدا دراصل ضرورت سے ہوتی ہے۔ پھر عربوں میں قزاقی کا آغاز دراصل پرتگیزوں کی چیرہ دستیوں سے ہوا۔ جنہوں نے سولھویں صدی کے اوائل میں بحرین اور دوسرے ساحلی مقامات پر قبضے بنا لیے تھے اور عربوں کی تجارت بالکل روک دی تھی — عربوں نے یہ کوشش حصول آزادی کے لیئے شروع کی تھیں۔

بڑھتے ہیں۔

کوئی بارہ سو سال بعد وینس کے سیاح مارکوپولو[1] نے بیان کیا کہ عرب قزاقوں نے خلیج فارس کے دہانے پر جہازوں کی ایک قطار کھڑی کر رکھی ہے اور کوئی تاجر ان کے حملوں سے بچ نکلنے کا موقع نہیں پاتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس حصے میں تجارتی سرگرمیاں شروع کیں تو اسے بھی عمانی قزاقوں سے سابقہ پڑا۔ اور اس کے کئی بڑے بڑے جہاز تیز رفتار عربی کشتیوں سے لڑتے لڑتے غرق ہو گئے یا پکڑے گئے۔ ہندوستان کے ساتھ تجارت کا سلسلہ وسیع ہوا تو عمان اور اس کے آس پاس بحری قزاقی اتنی نفع بخش ہو گئی تھی کہ یورپ اور امریکہ کے قزاق بھی قسمت آزمائی کے لیے یہاں پہنچ گئے۔ نیویارک جیسے دور افتادہ مقام سے جہاز تیار کر کے بحری قزاقی کے لیے خلیج فارس میں بھیجے جاتے تھے ۱۶۹۵ء میں اطلاع ملی تھی کہ قزاقوں کے پانچ جہاز برطانوی پرچم اڑاتے ہوئے عربی سمندروں میں پہنچ گئے ہیں۔ مشہور قزاق کپتان کڈ[2] بھی ایسا بہترین موقع ہاتھ سے نہ دے سکتا تھا۔ لیکن عربوں کے ساتھ مقابلہ اتنا سخت تھا کہ وہ بہت جلد اس میدان کو چھوڑ کر امریکی سمندروں کی طرف لوٹ گیا۔

صاحب کی جانے وقوع ایسی تھی کہ قزاق خلیج فارس۔ خلیج عمان اور بحر ہند

---

[1] Marco Polo (۱۲۵۴ء۔ ۱۳۲۴ء) مشہور اطالوی سیاح جس نے لمبی مدت قبلائی خان کی سلطنت میں گزاری اور چین، ہندوستان وغیرہ کے متعلق اس کا سفرنامہ قیمتی معلومات کا ذخیرہ ہے۔

[2] Captain Kidd

میں بے تکلف داخل ہو سکتے تھے۔ اس وجہ سے عمانی قزاق عربوں میں اپنے تمام عمر ان پر بازی لے گئے۔ وہ مشرق میں ہندوستان کے ساحل تک پہنچ جاتے تھے۔ شمال میں بصرہ ان کی ترکتازوں کا آخری مقام تھا اور مغرب میں انھوں نے زنجبار کو مسخر کر لیا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں احمد بن جابر بڑا کامیاب اور خوفناک قزاق تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی ملاح کی حیثیت میں شروع ہوئی۔ اس نے ایک مرتبہ سلطان مسقط کو بحرین کے حملے میں امداد دی، یہ حملہ اتنا کامیاب رہا کہ پھر احمد مصریوں کے ساتھ ہو گیا۔ جو عرب علاقوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ گراں قدر خدمات کے عوض میں اسے دمام دے دیا گیا جو آج کل دولت سعودیہ کی مشہور بندرگاہ اور ریلوے لائن پر مشرقی جانب آخری مقام ہے۔ احمد نے دمام کو اپنا مرکز بنا کر جہازوں کا بیڑا تیار کیا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی اس کے پاس تھیں۔ دو ہزار جنگجو اس کے ساتھ تھے۔ غرض وہ کچھ مدت تک خلیج فارس میں سب سے زیادہ با اقتدار بنا رہا، اور دُور دُور تک دہشت پھیلا دی تھی۔ آخر ایک موقع پر بڑی قوت سے مقابلہ پیش آ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تو گرفتاری پر موت کو ترجیح دیتے ہوئے اپنا جہاز بارود سے اڑا دیا اور خود بھی جہاز کے ساتھ ہی موت کے گھاٹ اتر گیا۔

اٹھارھویں صدی میں نیز انیسویں صدی کے اوائل میں عمانی قزاقوں کا مستحکم ترین مرکز وہ بنجر اور بے آب و گیاہ ساحل تھا جو قطر اور راس المسندم کے درمیان واقع ہے[۱]۔ یہ ساحل اس زمانے میں برائے نام سلطان مسقط کے ماتحت تھا لیکن

---

[۱] خلیج فارس کے دہانے پر خلیج عمان ہے۔ جہاں خلیج عمان ختم ہوتی ہے (باقی برصفحہ ۲۵۶)

حقیقتہً یہاں کے شیخ اور رئیس یا تو خود مختار تھے یا وسط عرب کے وہابی حکمرانوں کو خراج ادا کرتے تھے۔ اس حصے میں جواسم قبیلے کے لوگوں کی آبادی زیادہ تھی۔ اس وجہ سے تمام باشندوں کو عام لوگ "جواسم" ہی کہتے تھے۔

برطانوی جہازوں کی آمد و رفت بڑھی تو ساتھ ہی قزاقوں کے چھاپے بھی بڑھ گئے سنہ ۱۸۰۰ء میں "جواسم" نے وہابیوں کی بیعت اختیار کر لی۔ چند ماہ کی ہر مہینے کے بعد یا تو کوئی برطانوی جہاز پکڑا جاتا یا اسے بچ نکلنے کے لیے بھاگنے پر مجبور کر دیا جاتا۔ لیکن ہندوستان میں جو لوگ برطانوی نظم امور کے کفیل تھے، انھوں نے نرمی اور مصالحت کی پالیسی جاری رکھی۔ آخر ایسٹ انڈیا کمپنی کے دو جنگی جہازوں پر حملہ ہوا۔ ان میں سے ایک کا نام "مورننگٹن"[1] تھا جس پر چوبیس توپیں نصب تھیں۔ بمبئی کے ارباب اختیار نے اس وقت بھی بدلے کے لیے قدم نہ اٹھایا۔ بلکہ "فیوری"[2] نام ایک انگریزی جہاز کے کپتان نے قزاقوں کا مقابلہ کیا تو حکومت بمبئی نے کپتان کی مذمت کی۔

(بقیہ صفحہ ۲۵۵) وہاں سرزمین عرب کا ایک گوشہ بہت آگے بڑھ گیا ہے اور ایران کا ساحل نیم دائرے کی شکل میں پیچھے ہٹ گیا ہے۔ بڑھے ہوئے گوشے کو راس المسندم کہتے ہیں۔ اور ایران کے مذکورہ بالا نیم دائرے میں بندر عباس واقع ہے۔ یہیں ہرمز ہے جو پہلے ایران کی خاص بندرگاہ تھی۔ اس حصے میں سمندر بہت تنگ ہو گیا ہے۔ اور اسے آبنائے ہرمز کہتے ہیں۔ اس سے گزر کر آگے بڑھیں تو اصل خلیج فارس شروع ہوتی ہے۔ معاہد ریاستوں کا ساحل راس المسندم سے شروع ہو کر جزیرہ نمائے قطر تک جاتا ہے۔

[1] Mornington [2] Fury

[3] اس معاملے کا ایک پہلو اور بھی ہے، جسے مصنف نے پیش نظر نہیں رکھا۔ یعنی (باقی صفحہ ۲۵۷)

۱۸۰۸ء میں "جواسمی" نے برطانیہ کے ایک بڑے بحری جہاز "منروا"[۱۱] پر لڑائی کے بعد قبضہ کر لیا اور دو کے سوا تمام مسافروں اور ملاحوں کو قتل کر ڈالا۔ مسافروں میں ایک خاتون بھی تھی جس کا نام مسز ٹیلر[۱۲] تھا۔ اسے فدیے کی بھاری رقم دے کر رہا کرایا گیا مگر خود خاتون کا بیان ہے کہ اسیری کی حالت میں اس سے کوئی بدسلوکی نہ ہوئی[۱۳]۔ قزاقوں نے "منروا" پر چوبیس توپیں لگا لیں اور اسے اپنے رئیس دامیر کا خاص جہاز بنا لیا۔ ان کے بیڑے میں ساٹھ بڑی کشتیاں اور آٹھ سو چھوٹی کشتیاں تھیں اور ان کا لشکر بیس ہزار سے کم نہ تھا۔ آخر ستمبر ۱۸۰۹ء میں ان قزاقوں کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ تیغ و خنجر کی لڑائی میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا، مگر آتش بار ہتھیاروں کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ راس الخیمہ[۱۴] ان کا سب سے

(بقیہ صفحہ ۲۵۶) عربوں نے جو کچھ کیا اپنی آزادی محفوظ رکھنے اور چھنے ہوئے حقوق بحال کرنے کے لیے کیا۔ آخر پرتگیزوں نے سولھویں صدی کے آغاز میں کیا کیا تھا؟ کیا ساحل ایران، ساحل ہندوستان اور سواحل عرب کا کوئی قابل ذکر مقام چھوڑا تھا، جہاں فتنے کی آگ مشتعل نہیں کی تھی؟ کیا مسلمان تاجروں کے جہازوں کو نہیں لوٹا تھا؟ کیا حاجیوں کے جہازوں پر حملے نہیں کیے جاتے تھے۔ جہاں تک کہ بعض لوگوں نے امن طریق نہ ہونے کے باعث حج سے رک جانے کا حکم دے دیا تھا؟ کیا عدن پر دو مرتبہ ان کا حملہ نہیں ہوا تھا؟ کیا ملکا پر اس لیے قبضہ نہیں کیا تھا - کہ مسلمانوں خصوصاً عربوں کی تجارت تباہ ہو جائے؟ وہ فرنگیوں کو ہر ممکن کوشش سے تباہ کرنے کے سوا اور کون سا راستہ اختیار کر سکتے تھے، یہی انھوں نے کیا۔ انگریزوں نے ابتدا میں نرمی کی جو پالیسی اختیار کیے رکھی، وہ خاص نیک دلی پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ ان کا عام طریقہ یہی تھا کہ جب تک کوئی مقامی سہارا تیار نہ کر لیتے چپ چاپ کام کرتے جاتے اور جب سہارا ملا (باقی صفحہ ۲۵۸)

بڑا مرکز تھا۔ اس پر قبضہ کر کے نذرِ آتش کر دیا گیا اور بندرگاہ میں جتنے جہاز موجود تھے، وہ بھی جلا دیئے گئے۔ ان میں خود منرداء بھی شامل تھا۔ "بحر اسم" کے باقی قصبے بھی برباد کر دیئے گئے۔ اس کارروائی کے بعد سمجھ لیا گیا تھا کہ اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ مگر "بحر اسم" ختم نہیں ہوئے تھے، صرف اندرونِ ملک میں نکل گئے تھے۔ جب انہیں موقع ملا تو پھر قزاقی شروع کر دی اور صرف تیز رفتار اور بھری مسلح جہاز ہی ان سے بچ کر نکل سکتے تھے۔ ۱۸۱۸ء تک یہ حالت تھی کہ مشرق میں ساحل ہند اور مغرب میں عدن تک جہاز پکڑے جانے کی اطلاعیں ملتی تھیں۔ جب ابراہیم پاشا نے وہابیوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اور "بحر اسم" امداد کے ایک بہت بڑے سہارے سے محروم ہو گئے تو موقع مناسب دیکھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی بھی حرکت میں آئی۔ اس نے سلطان مسقط کو حلیف بنایا اور بحر ہند کے بیڑے کا بڑا حصہ اس کی امداد کے لیئے بھیج دیا۔ سمندر کی جانب سے برطانوی جہازوں کی گولہ باری جاری تھی۔ عقب سے سلطان مسقط کی چار ہزار فوج نے حملہ کر دیا۔ چھ روز کی جنگ کے بعد راس الخیمہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا، جسے پہلی تباہی کے بعد "بحر اسم" نے از سرِ نو آباد کر لیا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۲۵۷) ہل ہوتا تو معصومیت کا لباس اتار کر زور و قوت سے کام لیتے۔ آخر انگریزوں یا پرتگیزوں کو خلیج فارس میں پہنچ کر عربوں کے تہاد ابلہ معاش یعنی تجارت پر چھاپا مارنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور یہ تجارت امن پسندانہ بھی ہوتی تو عربوں کو انگریزوں اور پرتگیزوں میں کیا تمیز ہو سکتی تھی؟

(i) Minewa (ii) Mrs. Taylor ۳؎ اس واقعے سے خود ثابت ہوتا ہے کہ "بحر اسم" اور جو کچھ بھی ہوں، مگر وہ محسن ناشناس نہ تھے۔ اور کم از کم عورتوں کے احترام میں وہ سب متفق تھے۔ کیا پرتگیزوں نے کہیں بھی ایسا کوئی ثبوت پیش کیا؟ ۴؎ یہ راس الخیمہ مسقط کے جنوب میں تھوڑے فاصلے پر ہے۔

پھر دوسرے شہر بھی یکے بعد دیگرے مسخر ہو گئے[1]

اب انگریزوں نے آگے بڑھ کر مقامی شیوخ سے جنوری ۱۸۲۰ء میں معاہدے کیئے۔ ان سے صرف یہ اقرار لیا کہ جہازوں پہ چھاپے نہ ماریں گے۔ باہمی رزم و پیکار سے باز رہنے کا کوئی اقرار نہ لیا[2]۔ اس کا نتیجہ پھر یہ نکلا۔ کہ آہستہ آہستہ بحری قزاقی شروع ہو گئی۔ ۱۸۳۵ء میں پھر ایک معاہدہ ہوا جس میں شیوخ سے اقرار لیا گیا کہ سال بھر میں چھ ماہ تک وہ ساحل پہ کوئی ہنگامہ بپا نہ کریں گے۔ چھ ماہ کی مدت ان موتی نکالنے والوں اور ماہی گیروں کے لیئے مقرر کی گئی تھی۔ ۱۸۵۳ء میں ان شیوخ سے انگریزوں کا آخری معاہدہ ہوا۔ اس وقت سے اس ساحلی علاقے کو معاہد ریاستوں کا ساحل کہتے ہیں[3]۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جب تک دخانی جہاز

---

[1] بتایئے اس تفصیل میں انسانیت پروری کا کون سا مظاہرہ نظر آتا ہے؟ جب تک رہایوں کی قوت زور پر تھی، انگریز چپ بیٹھے رہے۔ جب وہ قوت مصریوں نے برباد کردی تو عین اسی موقع پر انگریز چڑھ دوڑے اور جواسم کا خاتمہ کر دیا۔ اس سلسلے میں بھی حسب عادت سلطان مسقط کو آلۂ کار بنایا۔ تو کامیابی کا دروازہ کھلا۔ پھر جہاز جلانے اور شہروں کو نذر آتش یا برباد کردینے میں کون سا پہلو قابل تحسین تھا؟ نیز وہابیوں کی قوت تباہ کرنے سے معاملہ محض انہیں تک محدود نہ رہا۔ دوسرے بہت سے اجزاء قوت بھی برباد ہوئے۔ ان میں سے ایک جزء جواسم بھی تھے [2] عجیب بات ہے کہ قزاقی روکی اور خانہ جنگی نہ روکی۔ حالانکہ قزاقی رکنے سے ان لوگوں کی معاش خطرے میں پڑتی تھی! اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر حملے شروع کر دیتے [3] یعنی ان ریاستوں یا امارتوں کے علاقوں کا ساحل جن سے انگریزوں نے صلح کے معاہدے کر لیے ہیں۔ انگریزی میں اس خطے کو ٹروشیل عمان Trucial Oman کہتے ہیں اور ساحل کو ٹروشیل کوسٹ Trucial Coasts

نہ چلنے لگے۔ خلیج فارس قزاقی سے بالکل پاک نہ ہو سکی۔ دخانی جہازوں کا چلنا بادبانی جہازوں کی طرح ہواؤں یا لہروں پر موقوف نہ تھا۔ نیز ان پر لوہا چڑھا ہوا تھا اور عام چوبی کشتیاں ان سے ٹکرا نہ سکتی تھیں۔

۱۸۹۲ء میں ان شیوخ سے اقرار لیا گیا کہ وہ برطانیہ کے سوا کسی طاقت سے کوئی معاہدہ نہ کریں گے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں اس معاہدے کو پھیلا کر موتیوں کے اجاروں پر عائد کیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک دفعہ بڑھا دی گئی۔ کہ ہر مقامی شیخ کسی دوسری طاقت کو کوئی اجارہ دیتے وقت برطانوی ریذیڈنٹ سے مشورہ کرے گا۔

جس شخص نے ان علاقوں کو دیکھا ہے، اس پر خود بخود واضح ہو گیا ہو گا کہ "جواسم" نے کس وجہ سے قزاقی شروع کی۔ ان میں کل اسی ہزار لوگ رہتے تھے۔ اور یہاں چھ امارتیں قائم ہیں۔ غالباً یہ لوگ عرب میں سب سے زیادہ غریب ہیں۔

تمام علاقوں کا رقبہ چھ ہزار مربع میل کے قریب ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ریت ہی ریت ہے۔ کہیں کہیں خام ہموار میدان یا کھارے پانی کے نالے ملتے ہیں۔ بارش کا اوسط پانچ انچ سالانہ ہے۔ گرمیوں میں درجہ حرارت سایے میں بھی ایک سو دس رہتا ہے۔ ایک دلدل ان علاقوں کی مغربی حد ہے۔ اس دلدل اور ابوظبی کے درمیان ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ ضرور ہو گا۔ یہ سارا علاقہ بنجر ہے۔ کہیں کہیں معمولی پہاڑیاں ہیں، باقی پورا خطہ ریتلا یا شورہ زار ہے۔ وہاں صرف معمولی ہی سبزہ مل سکتا ہے۔ جو جنگلی جانوروں کے لیئے کفایت کرے۔ یہاں ایک بھی مستقل مکان نہیں مل سکتا، البتہ مناصیر، بنی یاس، مرہ، بنی ہاجر، اور دواسر وغیرہ قبیلوں کے بعض افراد کبھی کبھار پہنچ جاتے ہیں۔

ساحل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں اور چٹانوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔
ٹاپوؤں میں سے ایک کا نام دلما ہے، جو تین میل لمبا ہے۔ یہاں موتی نکالنے کے
موسم میں تاجر غوطہ خوروں کے پاس پہنچ جاتے ہیں، تاکہ جو مال موجود ہو اسے خرید
لیں۔ اس جگہ لوہے اور بلور کی بھی کچھ مقدار ملی ہے۔ مزید مشرقی جانب ایک
بڑا جزیرہ ہے۔ یہ بنی یاس ہے۔ یہاں سے ساحل کوئی پینتالیس میل تک شمالی رُخ
ہوتا چلا گیا ہے۔ اسی طرح خور العبیدن آ جاتی ہے۔ یہ کھاڑی پانچ میل چوڑی ہے
اور ساحل کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف پچاس میل تک چلی گئی ہے۔ خلیج فارس
کی جانب سے ریت کے ٹیلوں نے اسے چھپا رکھا ہے۔ انیسویں صدی کے قزاقوں
اور بیسویں صدی کے سمگلروں کے لیئے یہ بہترین پناہ گاہ تھی۔

تمام ساحلی بلاد و قصبات کو ایک سڑک کے ذریعے سے ملا دیا گیا ہے۔ لیکن یہ
سڑک ایک صحرائی راستے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ۱۹۳۱ء میں مناصیر قبیلے
کے ایک شیخ نے فورڈ موٹر کار میں ابوظبی سے مکہ معظمہ تک سفر کیا تھا۔ لوگ اس
سفر کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتے تھے۔ ساحلی شہروں میں عرب بھی آباد ہیں، بلوچ،
ایرانی اور ہندو بھی۔ حبشیوں کی بھی خاصی بڑی تعداد رہتی ہے۔ اندرون ملک
میں دس ہزار بدو ہیں۔

جزیرۃ العرب کی آبادی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یعنی اوّل
وہ لوگ جو صحرائی علاقوں میں رہتے ہیں، دوسرے وہ لوگ جو پہاڑوں میں آباد ہیں،
تیسرے وہ لوگ جن کا خاص تعلق سمندر سے ہے۔ یہ الفاظ دیگر صحرائی، جبلی یا
کوہستانی اور بحری۔ کویت، بحرین اور معاہدانہ امارتوں کے ساحلی باشندے طبعاً بحری تھا

ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنا لیتے ہیں۔ پھر موتی نکالتے یا مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اور خلیج فارس میں تجارتی مال لاتے لے جاتے رہتے ہیں۔

خلیج فارس میں موتیوں کا دوسرا ذخیرہ جسے دوسرے درجے پر سمجھنا چاہیئے اسی ساحل کے سامنے ہے۔ موتی نکالنے اور مچھلیاں پکڑنے کی زیادہ تر کشتیوں کے مالک ہندو اور خوجے ہیں۔ وہ گراں نرخ پر ضرورت کی چیزیں نیز اُن کے ملاحوں اور غواصوں کو دے دیتے ہیں اور بیشتر بڑا نفع کماتے تھے۔ اب موتیوں کی تجارت پر زد پڑی تو سب سے بڑھ کر بُرا اثر اس ساحل کے لوگوں پر ہوا جن کے پاس گزارے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ موتی نکالنے کا طریقہ یہاں بھی وہی استعمال کیا جاتا ہے جس کا ذکر بحرین کے سلسلے میں آ چکا ہے۔

قطر کی جانب سے ساحل کے ساتھ ساتھ چلیں تو سب سے پہلے جو شہر آتا ہے، وہ ابوظبی ہے لیکن بحرین یا کویت کے مقابلے میں ساحلِ امارتوں کے بلاد و قصبات خاصے کم حیثیت ہیں اور ابوظبی کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے چند اچھے مکان پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر مکانوں کی دیواریں کچی ہیں۔ پانی بہت کم ہے اور جو ہے وہ اتنا کھارا ہے کہ سبزیوں کے چند باغات یا کھجوروں کے جھنڈوں یا گندم کے معمولی کھیتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ان شہروں کے بازار اور منڈیاں بھی کویت و بحرین کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ با ایں ہمہ ابوظبی کے ایرانی دکاندار مختلف اقسام کی چیزیں فروخت کرتے ہیں مثلاً کپڑا، اچھے قِقال کھجوریں، غلّہ، قہوہ، چائے، چینی، مسالے، مٹھائی، کارتوس کی پیٹیاں، خنجر اور خرجیاں تاہم بدو ایرانیوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔

علاقے کے بدو ابوظبی میں خیمہ لگا کر ٹھہرنا پسند کرتے ہیں چونکہ اس لیے ابن سلطان رئیس ابوظبی اور مشرقی جانب
کی امارت کے شیخ سعید ابن مکتوم کے درمیان لڑائیاں جاری رہتی ہیں۔ اس لئے ابن سلطان سمجھتا ہے کہ
بدو ان لڑائیوں میں سہارے و امداد کا باعث ہیں شیخ ابن سلطان رئیس ابوظبی کا محل بہت بڑا ہے لیکن
اور کسی مقام پر اسے زیادہ اچھا نہ سمجھا جائے گا۔ شہر کے لوگوں یا بدوؤں یا باہر سے آنے والے سیاحوں میں سے جو بھی
اس کے پاس پہنچ جائے اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ محل کے علاوہ ابوظبی میں ایک کچا قلعہ بھی ہے جس
کی دیواریں زیادہ بلند نہیں۔ اس میں چند زنگ خوردہ توپیں پڑی ہیں ممکن ہے ان میں سے بعض پرتگیزوں کے زمانے
کی ہوں شیخ کے مہمان خانے سے بندرگاہ کا نظارہ بخوبی کیا جا سکتا ہے جہاں ہر وقت کھجوروں، غلے، خشک مچھلیوں
اور کپڑے سے بھری ہوئی کشتیاں ٹھہری رہتی ہیں۔ ایسی کشتیاں بھی ہیں جو لوگوں کو ساحل سے قریب کے جزیروں
میں لے جاتی ہیں، جن کی حیثیت محض چٹانوں کی ہے۔ ایک زمانے میں ابوظبی کا بیڑا موتی نکالنے والوں میں سب
سے بہتر تھا مگر اب اس تجارت کے سرد پڑ جانے سے پہلے کی سی رونق اور چہل پہل نہیں رہی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، شیخ ابن سلطان رئیس ابوظبی اور شیخ ابن مکتوم رئیس دبی کی خراب تعلقات
کا اثر پورے ساحل کی سیاسیات پر پڑا ہے۔ دبی، ابوظبی سے قریباً اسی میل مشرق میں ہے اور اس ساحل
کا سب سے بڑا شہر ہے۔ انگریزوں نے دونوں کے درمیان لڑائی ۱۹۴۷ء میں رک دی تھی۔ مگر فریقین اب تک
ایک دوسرے سے خفا ہیں اور اندرون ملک میں بھی کبھی کبھی ان دونوں کے درمیان جنگ کی آگ
مشتعل ہو جاتی ہے۔

دبی بنی یاس کے قبیلے کا مرکز و مرجع ہے۔ بازار تنگ اور کسی قدر تاریک معلوم
ہوتے ہیں۔ سورج کی حدت کو روکنے کے لیے ان پر چٹائیوں کی چھتیں ڈال دی گئی
ہیں۔ بازاروں میں ایرانی، عرب، حبشی نوکر چاکر، غلام، ملاح، تاجر، ماہی گیر، موتی
نکالنے والے، غرض ہر قسم کے آدمی ملتے ہیں۔ بدو بھی چھ ماہ کے لیے ضروری جنسیں

غوطہ لگانے کی غرض سے آجاتے ہیں۔ ساحل بالکل مسطح ہے۔ اور اس کے متوازی ایک زیرِ آب چٹان چلی جا رہی ہے، جو بہت سی ناواقف کشتیوں اور جہازوں کا قبرستان بن چکی ہے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا جہاز "الفنسٹن" ۱۸۲۷ء میں یہیں ٹکرایا تھا۔

دبی میں اڑن کشتیوں کا ایک اڈا بنا ہوا ہے۔ معاہد امارتوں کے علاقے کو بیرونی دنیا سے ملانے کا یہ ایک اہم ذریعہ ہے اور اس سے معتدبہ آمدنی ہوتی ہے جس کی دبی کو ضرورت ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں یہاں ہوائی جہازوں کی خاصی آمد و رفت رہی اور برطانوی کمپنی بی، او، اے، سی کے بحری طیارے ہندوستان جاتے آتے اس جگہ ٹھہر کر پٹرول لیتے تھے۔ ہوائی ڈاک اور مسافر بھی یہاں چھوڑ جاتے تھے۔ جو لانچ میں سوار ہو کر ڈاک بنگلے میں پہنچتے تھے۔

بڑے بڑے تاجروں نے موتیوں اور زنانہ ریشمی پارچوں کے ذریعے سے بڑی دولت کمائی۔ اب وہ بڑے سے بڑے مکانوں میں آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں تیل اگرچہ ابھی تک نہیں ملا مگر سب سے بڑھ کر آراستہ مکان پٹرولیم کمپنی کے نمائندے ہی کا ہے۔ کچھ مدت پیشتر تک یا اس لیے یہ خدمت انجام دے رہا تھا۔ ان علاقوں میں وہ معروف ترین اور ہر دلعزیز ترین آدمی تھا۔ اسے قبائل کے متعلق سب سے زیادہ معلومات تھیں۔ تمام بڑے بڑے رئیسوں سے بے تکلف ملتا، اس لیے کہ ان کے درمیان بیس سال گزار چکا تھا۔ ہزاروں روپے لے کر نکل جاتا۔ اور جن سے ٹھیکے لے رکھے تھے، انہیں دے آتا۔ عربی لباس پہنتا اور تمام مقامی بولیاں بولتا۔

دبی سے قریب ہی ایک اور ریاست شارجہ ہے۔ یہاں ایک قلعہ بھی ہے

۱؎ Basil Lermith

۲؎ Elphinstone.

جس میں بی، او، اے، سی کے کارکن رہتے تھے ۔ اس قلعے کے اوپر بڑی تیز روشنیاں
لگی ہوئی ہیں جن سے دور دور تک صحرائی علاقہ روشن ہو جاتا ہے ۔ قلعہ انیسویں صدی
میں تبا تھا ۔ برطانیہ نے اس کی خوب مرمت کر لی ہے اور اونچے درجے کے عہدیداروں کے
لیئے ہندوستان سے ساگوان کا فرنیچر بنوا لیا ہے ۔ شرجہ میں کشتی سازی کے لیئے ساگوان
عام طور پر استعمال ہوتا ہے ۔

رائل ایر فورس کی عمارتیں بھی قریب ہیں ۔ انھیں میں ایک عمارت ہے جو دوسری
جنگ عظیم میں امریکہ کی فضائی حمل و نقل کے ذمہ دار استعمال کرتے تھے ۔ بارشیں نہ ہوں
تو شرجہ کا ہوائی سفر بہت اچھا ہوتا ہے ۔ لیکن معمولی بارش بھی ہو جائے تو یہ مقام طول
بن جاتا ہے ۔ ہوائی جہازوں کی حد پرواز طویل تر ہوتی جا رہی ہے ۔ اس لیئے شرجہ میں
ٹھہرنے کا سلسلہ بھی کم ہوتا جا رہا ہے ۔ شرجہ میں برطانوی پولٹیکل افسر کی قیام گاہ ہے
جس کا رخ خلیج کی طرف ہے یہاں بڑے بڑے تجربہ کار افسر رہ چکے ہیں ۔ یہاں سے
پانچ میل کے فاصلے پر شیخ کا قلعہ ہے ۔ جو پرتگیزوں نے سولھویں صدی میں تعمیر کیا تھا ۔
شیخ نوجوان ہے ، وہ اپنے باپ کی وفات پر ۱۹۵۱ء میں مسند نشین ہوا تھا ۔

عام عرب حکمرانوں کی طرح شیخ شرجہ بھی اپنے مہمانوں کو دعوت دے کر خوش
ہوتا ہے ۔ کھانا فرش پر کھایا جاتا ہے ۔ قالین پر سفید کپڑا بچھ جاتا ہے ۔ اور شیخ آلتی
پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے ۔ بڑے بڑے تھالوں میں پلاؤ آتا ہے ۔ جس پر سالم دنبا دھرا
ہوتا ہے ۔ آس پاس در جنوں رکابیاں سبزیوں سے لبریز ہوتی ہیں شیخ دنبے کا کوئی
ٹکڑا کاٹ کر اپنے معزز مہمان کی خدمت میں پیش کرتا ہے ۔ شیخ کی مزاج پرسی کے
علاوہ بارش یا تیل کے متعلق بات چیت ہوتی ہے کھانے کے کمرے میں عود اور لوبان

سلگتے رہتے ہیں۔ قہوہ پینے کے بعد مہمان رخصت ہو جاتے ہیں۔ شرجہ کی پوری زمین شیخ کی ملکیت ہے۔ وہی ٹیکس لگاتا ہے، وہی کاروبار پہ کمیشن وصول کرتا ہے۔ وہی ہوائی اڈے کا کرایہ اور جہازوں کے اترنے کی فیس لیتا ہے۔ تاہم وہ دولت مند نہیں شرجہ کے پاس ہی ایک جگہ ہے۔ جہاں سمندر کا کنارا اہل مغرب کے لئے خوشگوار ترین مقام ہے۔ سفید ریت پر رنگ رنگ کے گھونگھے اور سیپیاں نظر آتی ہیں۔ چونکہ پانی اتھلا ہے۔ اس لیئے شارک مچھلی وغیرہ کے آجانے کا وہاں کوئی خوف نہیں۔ اگر شرجہ میں کبھی تیل نکل آیا تو یہ مقام وہی حیثیت حاصل کر لے گا جو فرانس کے جنوبی ساحل پر ریویرا کو حاصل ہے۔

شرجہ سے پانچ میل شمال مشرق میں عجمان ہے جو دس مربع میل صحرائی علاقے اور ایک گہری کھاڑی کا مرکز حکومت ہے۔ شہر خوب بنایا گیا ہے۔ گلیاں پختہ، مکان سفید، ہر ایک میں پانی کا تالاب اور باغ پاس ہی بحری قزاقوں کا ایک بہترین قلعہ ہے جس کے برج اور دمدمے بادامی رنگ کے پتھر کے ہیں۔ اس میں اب تک رشید بن حمید عجمان کا شیخ رہتا ہے عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ قد لمبا، رنگ نکھرا ہوا، آنکھیں نیلی۔ اسے شکار کا بہت شوق ہے اور اس کا محل نہایت خوبصورت غزالوں کے سروں سے آراستہ ہے۔ یہ سب اس نے شکار کیئے ہیں۔ اسے گھوڑے پالنے کا بھی بہت شوق ہے۔ زیادہ تر گھوڑے شاہ ابن سعود کے ریاض سے حاصل کیئے۔ اب کوئی اڑتالیس گھوڑے اور گھوڑیاں ہوں گی۔ یہ جانور دن کے وقت قلعے کے صحن میں پھرتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت وہ سائبانوں میں چلے جاتے ہیں۔ عام عربوں کی طرح عجمان میں بھی گھوڑوں کو رسے سے نہیں باندھتے۔ صرف پچھلی ٹانگیں باندھ دیتے

ہیں۔ شیخ رشید نے نسل کشی کے لیے جو سانڈ رکھے ہیں وہ کوئی ساڑھے چار فٹ اونچے ہوں گے۔ پٹھے اور کولے بھرے ہوئے، ماتھے چوڑے، کان چھوٹے چھوٹے اور نتھنے تنگ۔ ان کی یالیں اور دُمیں لمبی رکھی جاتی ہیں۔ زیادہ تر کے رنگ سفید یا ہلکے بادامی تھے۔ یہ گھوڑے بڑے شریف ہیں۔ ایڑ اور گھٹنے کا اشارہ پہچانتے ہیں۔ چونکہ ان علاقوں میں چارے اور پانی کی بہت کمی ہے اس لیئے معاہد امارتوں میں گھوڑوں کا غالباً یہی ایک اصطبل ہے۔

عجمان سے چند میل مشرق الحمریہ کی بستی ہے۔ یہ نام وہاں کے پانچ بُرج والے قلعے کی وجہ سے مشہور ہوا۔ جس کا رنگ سُرخ ہے۔ مزید تیرہ میل آگے ایک اور قصبہ اور امارت ہے۔ قزاقی ختم ہو گئی۔ موتیوں کی تجارت سرد پڑ گئی۔ ہمسایہ ریاستوں سے جھگڑے بھی ممکن نہ رہے۔ اب لوگوں کی حالت بہت پتلی ہے۔ بعض ماہی گیری پہ گزارا کرتے ہیں، جس سے بعض اوقات خاصے پیسے مل جاتے ہیں۔ بعض کا پیشہ زراعت ہے، جو بہت معمولی حیثیت رکھتی ہے اور فصل اچھی نہیں ہوتی۔ ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھیں تو ایک میدان آتا ہے جس میں سراب بہت پیدا ہوتے ہیں۔ عربوں کا خیال ہے کہ یہ سراب نمک کی ہلکی سی تہ کا نتیجہ ہیں۔ موسم بہار میں یہ میدان تھوڑی دیر کے لیئے سرسبز ہو جاتا ہے۔ اور کہیں کہیں پھول بھی نکل آتے ہیں۔ اس علاقے کا مرکز حکومت راس الخیمہ ہے۔ ایرانی ۱۷۶۲ء تک اس پر قابض رہے۔ پھر انہیں شدید جنگ کے بعد نکال دیا گیا۔ یہ جواسم قبیلے کا مرکز ہے جس کا حاکم شیخ صقر ابن محمد ہے۔ اس حصے کے دوسرے شہروں کی طرح راس الخیمہ میں بھی ایک قلعہ ہے۔ تاکہ اگر کبھی صحرائی علاقے سے حملہ ہو تو اس کی روک تھام

کی جا سکے۔ البتہ یہاں پانی خاصا ہے اور شہر کے عقب میں جو کھاڑی ہے۔ اس میں مچھلیاں خوب پکڑی جاتی ہیں۔ شہر کے قریب سمندر کے کنارے ایک ساٹھ فٹ اونچی بلندی ہے جسے "الصنم" کہتے ہیں یعنی بت۔ غالباً اسلام سے پیشتر کے دور میں یہاں عبادت ہوتی تھی۔ اس جگہ کھدائی ہونی چاہیئے۔ پاس ہی ایک مسلمان بزرگ شیخ زبیر کا مزار ہے جس کی وضع قطع ایرانی ہے۔ بارش خوب ہو جائے تو سبزیوں کو پانی مل جاتا ہے انجیر، خربوزے اور انار بھی یہاں ہوتے ہیں۔

راس الخیمہ سے مشرق کی طرف چلیں تو شمیلیہ پہاڑ سمندر سے قریب تر آ جاتا ہے اور عمان کے مشہور پہاڑی سلسلے حجر کی بلند ترین چوٹی دھندلی سی نظر آنے لگتی ہے۔ سرما میں ان پہاڑیوں کے دامن رہنے کے لیئے بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ اور بدو بہت بڑی تعداد میں یہاں خیمے لگا لیتے ہیں۔ چند ہفتوں کے لیئے خشک وادیوں میں پانی بہنے لگتا ہے اور ابر بہار مرغزاروں میں سبزے کا فرش بچھا دیتا ہے۔

ان پہاڑوں میں وہ قبیلے آباد ہیں، جو قدیم ترین زمانے کے تمدن سے آگے نہیں بڑھے اور جن کے متعلق لوگوں کو کم سے کم معلومات حاصل ہیں۔ وہ ایسی بولی بولتے ہیں، جو عرب میں کہیں نہیں بولی جاتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جزیرۃ العرب کے بالکل ابتدائی باشندوں کے اخلاف ہیں۔ عرب انھیں سندباد ملاح کی اولاد بتلاتے ہیں۔ ان میں بعض اب تک پہاڑوں کے غاروں میں رہتے ہیں۔ یا گڑھے کھود لیتے ہیں۔ اور انھیں ببول کی ٹہنیوں سے پاٹ کر اوپر مٹی بچھا لیتے ہیں۔ اس طرح نسبتۃً ایک خنک تیامگاہ تیار ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ان کا عام پیشہ ریوڑ چرانا ہے لیکن ان میں

بعض ساحلی علاقے میں بھی آجاتے ہیں۔ یا تو مچھلیاں پکڑتے ہیں یا کھجوروں کے باغوں میں محنت مزدوری پر لگ جاتے ہیں۔ یہاں کا حکمران شیخ حسن ابن محمد ہے۔ ۱۹۳۰ء میں ایک برطانوی پارٹی سروے کے لیئے اترنا چاہتی تھی۔ شیخ نے اجازت نہ دی انگریزوں نے چند گولے چلائے اور شیخ حسن خود کشتی میں سوار ہو کر جہاز پر پہنچ گیا۔ اور اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔

اندرونی علاقے کے عرب کسی قانون کے تابع نہیں۔ وہ اجنبیوں اور عیسائیوں کے سخت دشمن ہیں۔ سلطان مسقط اور شیوخ امارت ہائے معاہدہ دونوں کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان قبائل میں ہنوز خونی انتقام کا سلسلہ چلا آتا ہے۔ وہ لڑنے کے اتنے مشتاق ہیں کہ پیسے لے کر شیخ کے پاس جاتے ہیں تاکہ ان سے لڑائی کا کام لیا جائے۔ مجھے نہیں ایجانے کے لیئے شیوخ میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تو ہر شیخ ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر تحفے پیش کرتا ہے اور ان کی خوب خاطر تواضع ہوتی ہے۔

دو قبیلوں میں مدت سے ایک جھگڑا چلا آتا ہے۔ جس کی وجہ سے عمان سالہا سال تک کشمکش گاہ بنا رہا۔ قبائلیوں کے نزدیک اس قسم کے جھگڑے دولت سے بدرجہا زیادہ عزیز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فرنگیوں کو اندر نہیں آنے دیتے اور سمجھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے جھگڑے بند ہو جائیں گے۔ اگرچہ اب حالات بہتر ہو گئے ہیں

لیکن اگر یہ سب کچھ درست ہے اور یہ لوگ اسی دور میں چلے جا رہے ہیں جو آج سے تیرہ چودہ سو سال پیشتر پورے عرب پر طاری تھا تو کیا ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب معاشرے کو کس پست حیوانی حالت سے اٹھا کر حقیقی انسانی علو و برتری کے سدرۃ المنتہیٰ

ہیں۔ لیکن ۱۹۲۸ء کی بات ہے جب دبی سے مناصیر پہ حملہ ہوا اور اس میں بارہ (دن) آدمی مارے گئے۔

ان علاقوں میں خطرہ جان صرف شمیلیہ پہاڑوں کے اندرونی حصے ہی تک محدود نہیں۔ صرف ایک دولت سعودیہ ہے جہاں ہر قسم کے جھگڑے کا قلع قمع ختم ہو گئے ہیں ورنہ ہر جگہ حملے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ حملے عموماً رات کے آخری حصے میں اس وقت ہوتے ہیں جب چاند گھٹتے گھٹتے ایک چوتھائی رہ جاتا ہے۔ اس روشنی میں رہزن کو سب کچھ نظر آتا رہتا ہے، لیکن خود اسے دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ لوگ اتنے بیباک ہوتے ہیں کہ ۱۹۵۱ء میں رائل ایر فورس کی بارکوں اور امریکہ کے کیمپ میں گھس گئے اور اس وقت تک کسی کو پتہ نہ چل سکا جب تک ایک بدو نے ایک سوئے ہوئے ڈاکٹر کا کمبل کھینچنا شروع نہ کیا۔ ڈاکٹر کی آنکھ کھل گئی۔ جب یہ لوگ کمبل، کھانا پکانے کے برتن، قالین، جواہرات وغیرہ فراہم کر لیتے ہیں تو انتہائی تیزی سے اندرون ملک بھی چلے جاتے ہیں اور وہ جگہ شیخ کے دائرہ اقتدار سے باہر ہوتی ہے۔ بعض اوقات آدمیوں کو بھی اٹھا لے جاتے ہیں اور ان کا فدیہ وصول کرتے ہیں۔

برَیمی ان حملہ آوروں کی خاص اقامت گاہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہاں بردہ فروشی بھی ہوتی ہے۔ عرب لڑکا دو ہزار کو بکتا ہے۔ عرب لڑکی ڈیڑھ ہزار

(بقیہ صفحہ ۲۶۹) پر پہنچا دیا؟ جس قوم کی یہ حالت تھی وہ اسلام کی آغوش میں پہنچتے ہی تہذیب، شرافت، فضائل، اخلاق، حسن و عمل اور کمالات علمیہ میں دنیا بھر کی معلم بن گئی اور حکومت کا جو نمونہ اس نے دنیا کے سامنے پیش کیا، اس کی نظیر آج تک کہیں نہیں مل سکی۔ وہ قوم ایسے ہی لوگوں میں صرف تیئس سال کی مدت میں تیار ہو گئی جن میں سے اطمینان کے ساتھ کام کرنے کی مدت صرف چند سال تھی۔ موج چاند اور تاروں کی آنکھ نے اس سے بڑا معجزہ آج تک نہیں دیکھا اور یہ معجزہ اپنی دلیل آپ ہے۔ بکر

کر اور حبشی ایک ہزار کو[۱] ایسے لوگوں کو سزائیں دی جاتی ہیں، مگر یہ سلسلہ کاملاً ختم نہیں ہوا۔ اس کے لیے یا تو یہ ضروری ہے کہ کوئی زبردست حکمران برسرکار آجائے یا یہ ضروری ہے کہ تیل، سونے، ٹین یا کسی دوسری قدرتی دھات کی دریافت افلاس کی حالت ختم کر دے۔

بریمی نے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔ جب دولت سعودیہ اور اس کے ہمسایوں کے درمیان حد بندی کے متعلق جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ برطانیہ نے دولت سعودیہ کے خلاف شیخ ابوظبی اور سلطان مسقط کی حمایت کی تھی۔ رہزنوں کے چھاپوں کے علاوہ خود شیوخ میں بھی کشمکش ہوتی ہی رہتی ہے۔ مثلاً ۱۹۴۰ء میں شارجہ اور دبی کے درمیان لڑائی ہو گئی، جس کی ذمہ دار شیخ دبی کی ایک بیوی ام رشید تھی۔ جب دبی کے قلعے پر حملہ ہوا تو یہ خاتون خود دفاع کرتی رہی۔ برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ نے لڑائی رو کی۔ اسی طرح ۱۹۴۸ء میں عجمان و مناصیر کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی تھی، اس لیے کہ عجمان نے مناصیر کی چراگاہوں پر اعتراض کر دیا تھا۔ یہ جھگڑے دور جاہلیت کے "ایام العرب" کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔

ان علاقوں کے باشندوں کی حالت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ اس حالت سے بچ نکلنے کی تین صورتیں ہیں۔ اول تیل کی دریافت، دوم کشتی سازی

---

[۱] بریمی اب تک برطانیہ کے زیر اثر ہے جس نے تیل کے لالچ میں اسے ابوظبی اور مسقط کا حصہ قرار دیا، لہٰذا بردہ فروشی وغیرہ کو رد کرنے کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔

کی صنعت کا فروغ، لوٹ مار اور قزاقی کی غرض سے نہیں، صرف تجارت کی غرض سے، سوم ان باشندوں کو عرب کے کسی ایسے حصے میں آباد کر دینا جہاں پانی مناسب مقدار میں مہیا ہو، ورنہ یہ دردناک حالت ختم نہیں ہو سکتی۔ کہ بحر پیما لوگ سمندر سے ضرورت کے مطابق روزی حاصل نہ کر سکتے، اور زمین ان کے پاؤں کے نیچے اپنی روح نشوو ارتقا ختم کرتی جا رہی ہے ان علاقوں کی خوش نصیبی ہے کہ پہلی صورت بروئے کار آ گئی ہے یعنی ابوظبی کے نزدیک تیل مل گیا ہے ؎

ضمیمہ

تیل کی رائلٹی اور کسٹمز کی آمدنی دبی کے لیے پنتالیس لاکھ ہے، ابوظبی کے لیے تینتیس لاکھ اور باقی ریاستوں کی مجموعی آمدنی آٹھ نو لاکھ کے درمیان ہے سڑکیں بھی کسی قدر بن گئی ہیں۔ انتظامی امور عام طور پر بحرین و مسقط کی طرح برطانیہ کے مشورے سے چل رہے ہیں ؏

چودھواں باب

مسقط

مشرق قریب میں ہمارا قدیم ترین حلیف

عرب حکومتوں میں ہمارا[1] معاہدہ سب سے پہلے ۱۷۸۷ء میں مراکش کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد ہم نے سلطان مسقط سے عہدنامہ کیا جس پر ۱۸۳۳ء میں دستخط ہوئے۔ یہ معاہدہ سعید ابن سلطان سے ہوا تھا جو مسقطی سلطانوں میں سب سے زیادہ قابل، سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ مشہور و معروف تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں وہ مسقط و زنجبار دونوں پر حکومت کرتا تھا۔ عہد طفلی میں اس کا چچا نائب السلطنت کی حیثیت میں کاروبارِ حکومت کا کفیل تھا۔ سعید نے اختیارات طلب کیے تو چچا نے انکار کر دیا، بلکہ سعید کو قتل کر دینے کے لیے سازباز شروع کر دیا۔ سعید نے یہ اطلاع پاتے ہی چچا سے ملاقات کی اور بجلی کی تیزی سے خنجر مار کر اسے زخمی کر دیا۔ چچا زخم کھا کر محل سے بھاگ نکلا

---

[1] "ہمارا" سے مراد امریکہ ہے، اس لئے کہ مصنف امریکی ہے۔

سعید نے گھوڑے پر سوار ہو کر بچھا کیا اور برچھی سے اس کا کام تمام کر ڈالا۔ ۱۸۰۶ء میں مسند نشین ہوا۔ اس نے ملک کا نظم و نسق بڑی مستعدی سے سنبھالا۔ خوب دولت جمع کی اور سب اسے احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

اس کے بیڑے میں پچھتر جہاز تھے، جن میں سے ہر ایک پر چار سے پچاس تک توپیں نصب تھیں۔ جہازوں کے منتظم اور ملاح ہندوستان سے تربیت پا کر آئے تھے۔ ایک موقع پر اس نے اپنا ایک جنگی جہاز برطانیہ کو بھی دے دیا تھا۔ ۱۸۲۴ء میں وہ اپنے جہاز پر سوار ہو کر حج کے لیئے مکہ معظمہ گیا، تو حکومت نے اس کا رسمی استقبال کیا۔

مسقط کے ملاحوں اور قزاقوں نے مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقے پر ایک حد تک اقتدار قائم کر رکھا تھا۔ سعید نے جزیرہ زنجبار کو اپنا مرکز بنایا۔ وہاں ایک محل تعمیر کیا اور لونگ کی کاشت شروع کرادی، جو بہت جلد جزیرے کی سب سے بڑی پیداوار بن گئی۔ پھر اس نے تجارتی چوکیوں کا ایک سلسلہ وسطی افریقہ سے چین اور جزائر شرق الہند تک قائم کر لیا۔ کلکتہ، ایران وغیرہ میں بھی اس کے کارندے موجود تھے۔

عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ اس نے بہت بڑا خزانہ جمع کر رکھا ہے، اور زنجبار یا مسقط میں کسی خفیہ مقام پر دفن کر دیا ہے۔ اس کی وفات ۱۸۵۶ء میں ایک جنگی جہاز پر ہوئی۔ نزع کی حالت میں اس نے زنجبار کے انگریزی قونصل کو بلایا۔ سمجھا جاتا ہے کہ وہ شاید اسے دفینے کا مقام بتانا چاہتا تھا، لیکن قونصل کے پہنچنے سے پیشتر ہی وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے چوبیس بیٹے اور بارہ بیٹیاں

تھیں۔ مرنے سے پہلے اس نے ہر بیٹے کو ساٹھ ہزار کراؤن اور ہر بیٹی کو انتیس ہزار کراؤن کی رقم دے دی تھی[1]۔

امریکہ کے ساتھ معاہدے کی داستان بڑی عجیب ہے۔ ہمارے اں کی ریاست نیو انگلینڈ کے ایک تاجر ایڈمنڈ رابرٹس[2] نے بہت سا روپیہ قرض لیا۔ سامان خریدا اور جہاز کرایے پر لے کر زنجبار پہنچ گیا۔ اسے امید تھی کہ تجارت میں بہت سا منافع ہوگا مگر زنجبار پہنچ کر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وہاں تجارت کا پورا کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہے اور جن ملکوں نے زنجبار کی حکومت سے معاہدے نہیں کیے، ان کے شہری سخت گھاٹے میں رہتے تھے۔ نفع کی توقعات کا تو خون ہو چکا تھا، تاہم اس نے سلطان سعید سے دوستی پیدا کر لی اور مشورہ دیا کہ امریکہ اور مسقط کے درمیان دوستانہ تعلقات پیدا ہو جانے سے کاروبار کو بہت فروغ حاصل ہوگا۔

امریکہ پہنچ کر رابرٹس نے گفت و شنید شروع کرنے کے لیے اپنے آپ کو حکومت کا معتمد علیہ نمائندہ مقرر کرا لیا اور ایک جنگی جہاز پی کاک[3] میں بوسٹن سے چلا تاکہ اعلیٰ حضرت سیدی سعید بن سلطان امام مسقط سے گفتگو کی ابتدا کرے۔

"پی کاک" جہاز ۱۸ ستمبر ۱۸۳۳ء کو مسقط میں لنگر انداز ہوا۔ سلطان سعید

---

[1] گویا اگر کراؤن پانچ شلنگ کا مانا جائے تو ہر بیٹے کو پندرہ ہزار پونڈ اور ہر بیٹی کو سوا سات ہزار پونڈ کی رقم دی۔ اس طرح کل رقم چار لاکھ سینتالیس ہزار پونڈ بنتی ہے۔ [2] Edmund Roberts [3] Peacock

کو خبر ملی تو چار قسم کے انگور اور تازہ توڑی ہوئی کھجوریں کثیر مقدار میں جہاز پر بھیج دیں ساتھ ہی امریکی سفارت کے بخیریت پہنچنے پر مبارک باد دیتے ہوئے تکلیف کا شکریہ ادا کیا۔

رابرٹس کا اندازہ یہ تھا کہ مسقط کی آبادی بارہ ہزار کے قریب ہے اور پانچ ہزار نفوس اس کے آس پاس رہتے ہیں۔ وہاں باشندے بھی تھے جو کھانے دار دستاریں بُنتے تھے، لوہار، سنار، رسن ساز، بڑھئی اور موچی بھی تھے۔ بازار میں خوش پوش عرب غلام پاکشمیری شال یا گینڈے کی ڈھالیں یا روپہلی تیغے والے خنجر خریدتے پھرتے تھے اور ان کے لباس سے خوشبوئیں اڑتی تھیں۔ غواصوں کا ذکر رابرٹس نے خاص طور پر کیا اور کہا کہ وہ دو منٹ سے زیادہ عرصے تک پانی کی تہ میں رہ سکتے ہیں۔

رابرٹس اور اس کے ساتھی سلطان کے محل میں پہنچے تو تواضع کے لیے مٹھائیاں اور الائچی والا قہوہ پیش کیا گیا۔ پھر رابرٹس نے صدر جمہوریہ امریکہ کا خط سلطان کو پہنچایا۔ ساتھ ہی دونوں ملکوں کے گہرے تعلقات کی اہمیت پر ایک تقریر کی سلطان اس امر پر راضی ہو گیا۔ کہ امریکہ کے جہازوں اور باشندوں کے ساتھ بہترین سلوک کیا جائے گا۔ نیز تجارت اور دوستی کا معاہدہ کر لیا گیا۔ معاہدے کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اگر کبھی امریکہ کا کوئی جہاز سلطان کی مملکت کے کسی حصے میں چٹان سے ٹکرائے گا۔ تو سلطان بچ رہنے والے آدمیوں کی مہمانداری کرے گا اور انہیں واپس امریکہ پہنچا دے گا۔ ایسے حادثے میں جو مال ملے گا، وہ احتیاط کے ساتھ امریکی قونصل یا اس کے مقرر کیے ہوئے کارندے کے حوالے کر دیا جائے گا۔

۴ اگست کو خود سلطان "پی کاک" جہاز پر آیا۔ پھر رابرٹس معاہدہ اور صدر جمہوریہ کے نام سلطان کا ایک خط لے کر واپس چلا گیا۔ امریکہ کے سینیٹ نے جون ۱۸۳۴ء

میں اس معاہدے کی منظوری دے دی اور رابرٹس ہی کے ذمے یہ کام لگایا گیا۔
کہ تصدیق شدہ معاہدہ سلطان کے پاس پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ رابرٹس پھر "پی کاک"
جہاز پر سوار ہو کر زنجبار ٹھہرتا ہوا مسقط کی طرف روانہ ہو گیا۔ سارا سفر بہ خیر و خوبی
طے ہو گیا۔ جب "پی کاک" جزیرہ میسیرہ[۵۱] کے قریب پہنچا، جو عمان کے جنوبی ساحل سے
صرف چند میل کے فاصلے پر ہے تو ایک زیر آب چٹان پر چڑھ گیا۔ اور کوشش کے
باوجود اسے اس مصیبت سے نجات نہ ملی۔ آخر رابرٹس ایک کشتی میں سوار ہو کر
مسقط کی طرف روانہ ہوا۔ تاکہ سلطان سے مدد طلب کرے۔ اس اثنا میں عملے نے
جہاز کو چٹان سے اتار لیا اور وہ راس الحد[۵۲] کا چکر کاٹتے ہوئے آگے بڑھے۔ تو رابرٹس
مدد لے کر آتا ہوا راستے میں ملا۔ "پی کاک" مسقط میں لنگر انداز ہوا تو بہت سے
مستقلی آئے جنھوں نے بتایا کہ آج تک ان زیر آب چٹانوں میں پھنسا ہوا جہاز
سلامت باہر نہیں نکلا۔ "پی کاک" اس سلسلے کی پہلی مثال ہے۔ سلطان نے
مصدقہ معاہدہ لے لیا۔ اور جہاز کا جو سامان ضائع ہوا تھا، اسے اپنے پاس سے
دے دینے کی پیش کش کی، اس سامان میں گیارہ توپیں بھی تھیں۔ جنھیں اس
لیے سمندر میں ڈال دیا گیا تھا۔ کہ جہاز کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

پھر "پی کاک" کے افسروں اور عملے کو محل میں پرتکلف دعوت دی گئی۔
سلطان مہمانوں کو کھانے کے کمرے میں پہنچا کر چلا گیا۔ تاکہ وہ اطمینان سے جس طرح چاہیں

---

[۵۱] یہ جزیرہ عمان کے جنوبی ساحل سے قریب واقع ہے۔ پاس ہی اس نام کی ایک خلیج ہے۔ [۵۲]
راس الحد، خشکی کے اس بڑھے ہوئے گوشے کا نام ہے، جہاں سے عمان کا ساحل شمال کی سمت مڑ گیا
ہے۔ گویا راس الحد خلیج فارس کے دہانے کا مغربی گوشہ ہے۔

کھائیں۔ "پی کاک" کے ڈاکٹر کا بیان ہے کہ کھانا دو سو آدمیوں کے لیئے بھی کافی تھا۔
اس کے بعد "پی کاک" مزید چند روز ٹھہرا رہا اور امریکیوں نے مختلف معلومات
حاصل کیں۔ ۱۰۔ اکتوبر ۱۸۳۴ء کو "پی کاک" روانہ ہوا۔ سلطان نے عربی گھوڑے
دینے چاہے۔ رابرٹس نے معذرت پیش کی کہ انھیں لے جانے میں دقت ہو گی۔ اپنی طرف
سے ریاستہائے متحدہ کا ایک نقشہ، امریکی نظموں کی ایک کتاب اور بہت سے بلوری
لیمپ پیش کیے۔ رابرٹس کی ان کوششوں سے امریکی تجارت خاصی بڑھ گئی۔ معاہدے
سے سات سال پیشتر کی مدت میں صرف ایک تجارتی امریکی جہاز مسقط میں لنگر انداز ہوا
تھا اور معاہدے کے بعد صرف پہلے سال میں نو امریکی جہاز وہاں پہنچے۔

جس امریکی نے سب سے پہلے مسقط و عمان میں توطن اختیار کیا وہ امریکی تجارتی
جہاز "ایسکس"[1] کا ایک خدمت گار تھا۔ ایسکس جہاز پر یمن کی بندرگاہ مخا[2] میں قزاقوں
نے قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے پورے عملے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صرف ایک
لڑکے کو جس کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی، قزاقوں کے رئیس نے اپنے پاس
رکھ لیا۔ آئندہ سال اس قزاق نے، جس کا نام محمد عقیل تھا، ظفار کا علاقہ فتح کر لیا۔
جو عمان کے مغرب میں عرب کے جنوبی ساحل پر واقع ہے۔ ایک انگریز نے ۱۸۳۶ء میں ظفار
کا سفر کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ایسکس کے اس خادم نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور اپنے

---

[1] Essex

[2] مخا یمن کی مشہور بندرگاہ ہے۔ جزیرہ پیرم کے پاس باب المندب کو عبور کر کے بحیرہ قلزم میں داخل ہو جائیں۔ تو سب سے پہلے یمن کے ساحل پر مخا ہی کی بندرگاہ آتی ہے۔

اہل وعیال کے ساتھ بندرگاہ صلالہ میں رہتا تھا۔

پھر امریکی تجارت میں افسردگی پیدا ہو گئی۔ اس وجہ سے امریکہ کا وقار بھی گھٹ گیا۔ مئی ۱۸۵۰ء میں مسٹر فلمور[1] صدر جمہوریہ امریکہ نے سلطان مسقط کو ایک خط لکھا جو موجودہ عہد کی ڈپلومیٹک خط و کتابت سے بالکل مختلف ہے اور اس سے سو سال پیشتر کی بین الاقوامی خط و کتابت کا انداز واضح ہوتا ہے۔ اس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ صدر نے "اعلیحضرت سید سعید سلطان مسقط و ملحقات" کو اپنا عظیم القدر اور خیر خواہ دوست" قرار دیتے ہوئے لکھا

امید ہے آپ بہ خیر ہوں۔ میری دعا ہے کہ آپ کو طویل عمر عطا ہو۔ آپ کا عہد حکومت امن، خوشحالی اور عظمت و شان کے ساتھ جاری رہے اور آپ کے سایہ عاطفت میں کبھی کمی نہ آئے۔

میرے ایک پیشرو مسٹر جیمز ناکس پولک[2] کو آپ کے کئی مکاتیب وصول ہوئے تھے۔ آپ نے ان کی صحت کے بارے میں استفسار فرمایا تھا۔ میں افسوس کے ساتھ اطلاع دیتا ہوں۔ کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ مجھ سے پیشتر جنرل زکری ٹیلر[3] ریاستہائے متحدہ کے صدر تھے میکسیکو میں ان کی زیر دست

---

[1] Millard Fillmore ۱۸۴۹ء میں نائب صدر منتخب ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں صدر کا انتقال ہو گیا تو فلمور اپنے عہدے کی بناء پر صدر بن گیا اور ۱۸۵۳ء تک صدر رہا۔

[2] James Knox Polk عہد صدارت (۱۸۴۵ء سے ۱۸۴۹ء)۔ ۵۳

[3] Zachary Taylor عہد صدارت (۱۸۴۹ - ۱۸۵۰)

لڑائیوں اور فتوحات کے بارے میں آپ ہمارے قونصل چارلس وارڈ[1] سے اکثر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ میرا دل یہ تسلیم کرتے ہوئے ڈوب رہا ہے کہ وہ بھی لافانی ہستیوں کی صف میں شامل ہو گئے .....

ہمارے ملکوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، وہ اب ہمارے وطن کا ایک قانون بن چکا ہے۔ میں اسے قوم کی مجلس عالیہ یعنی سینیٹ کی منظوری کے بغیر بدل نہیں سکتا۔ آپ کے جہاز ہماری بندرگاہوں میں انھی شرطوں کے مطابق آسکتے ہیں جن شرطوں کے مطابق ہمارے جہاز آپ کے ملک میں جا سکتے ہیں۔ اوقیانوس اور خلیج میکسیکو میں ہماری بے شمار بندرگاہیں ہیں، جن میں آپ کے جہاز داخل ہو سکتے ہیں۔ بالکل یہی کیفیت بحرالکاہل کی جانب ہماری نئی ریاست کیلی فورنیا کی بندرگاہوں کی ہے، جہاں سنگ مرو کی چٹانیں سونے سے بھری پڑی ہیں۔ دریا سونے کے خطوں پر سے بہتے ہیں اور سمندر کے کنارے کی ریت میں بیش بہا دھاتوں کے ذرے جگمگاتے ہیں۔

شمالی جانب کے برفستانوں سے جنوبی جانب کی سنگترے کے پھولوں سے بھری ہوئی زمین تک ایک سو دن کی راہ ہے۔ مشرقی کناروں سے جن پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں سب سے پہلے پڑتی ہیں، مغرب تک جہاں یہ کرنیں غائب ہوتی ہیں۔ ڈیڑھ سو دن کی مسافت ہے[2]

---

[1] Charles Ward

[2] اس زمانے میں طول و عرض ملک کے بیان کا عام طریقہ یہی تھا۔ اگرچہ امریکہ میں ریلیں اور دخانی جہاز جاری ہو چکے تھے، جیسا کہ خود خط میں بیان کیا گیا ہے لیکن مغرب میں اس وقت ایسے وسائل حمل و نقل کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ صدر امریکہ نے طول و عرض کو عام طریق سفر کے مطابق پیش کرنا ضروری سمجھا۔

اور یہ وسیع ملک ریگ زار نہیں، بلکہ آباد شہروں سے بھرپور ہے۔ اس میں عظیم الشان دریا بہتے ہیں۔ بلند پہاڑوں نے اسے تاج پہنا رکھے ہیں۔ اس عظیم الشان ملک کے شہری ریلوں اور دخانی کشتیوں میں سوار ہو کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک اس تیزی سے جاتے ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے صدر مقام واشنگٹن سے میں اپنے احکام تار برقی کے ذریعے سے چند لمحوں میں ریاستہائے متحدہ کے ہر حصے تک پہنچا دیتا ہوں۔ اور ان کی تعمیل ہوتی ہے۔

ان چیزوں کے ذکر سے میرا مقصد فخر و مباہات نہیں، بلکہ میں سب کچھ دوستی اور امن کو پیش نظر رکھ کر کہہ رہا ہوں۔ میرا مدعا یہ ہے کہ اس وسیع ملک کا گوشہ گوشہ تجارت کی غرض سے آپ کے لیئے، آپ کے جہازوں کے لیئے اور آپ کے آدمیوں کے لیئے کھلا پڑا ہے۔ جو جہاز آپ کا پرچم اڑاتے ہوئے آئیں گے۔ ہر بندرگاہ میں ان کا خیر مقدم ہو گا۔ ہمارے جہاز آپ کی بندرگاہوں میں جا سکیں گے۔ یہ حقوق معاہدے کے مطابق فریقین کو حاصل ہیں اور معاہدے کی پابندی بہر حال ضروری ہے۔ عظیم القدر اور نیک دل فرمانروا! آپ اسے کیونکر قرین انصاف قرار دے سکتے ہیں۔ کہ ہم تو اپنی سینکڑوں بندرگاہیں آپ کے لیئے کھول دیں اور آپ ہمیں صرف ایک بندرگاہ تک محدود رکھیں، اور سلطنت کے دوسرے حصوں میں جانے کی اجازت نہ دیں یہ مناسب نہیں، آزاد تجارت عام طور پر مطلوب ہے۔ اس طرح مختلف ملکوں سے قسم قسم کی پیداوار بہترین طریق پر دنیا کے ہر حصے میں پہنچ سکتی

ہے ۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت فریقین
کے لیے فائدہ مند ہو گی ۔ یہ بھی امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا ۔ بلکہ
بڑھتا جائے گا ...... آپ کا خیر خواہ دوست

(لارڈ فلمور)

اس مکتوب کے بعد امریکہ کی اپنی پوزیشن بحال ہو گئی ۔

۱۸۵۶ء میں سلطان سعید نے وفات پائی اور اس کے دو بڑے بیٹوں کے درمیان
جانشینی کا جھگڑا شروع ہو گیا ۔ دونوں نے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کیننگ
کو فیصلے کا مختار بنا دیا ۔ اس نے ۱۸۶۱ء میں یہ فیصلہ صادر کیا کہ زنجبار کو مسقط و
عمان سے الگ کر دیا جائے ۔ ایک بیٹا زنجبار لے لے اور دوسرا مسقط پر حکمران رہے ۔
امریکہ اور مسقط کے تعلقات کی کیفیت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں یہاں
ایک مشن قائم ہوا ۔ ۱۸۹۳ء میں بصرے سے پادری پیٹر جے زویمر[1] مسقط پہنچا ۔ اور اس
نے حالات کے بارے میں ایسی رپورٹ بھیجی کہ مشن کا ایک تیسرا مرکز قائم کر لینے کی اجازت
دے دی گئی ۔ قبائلی جنگوں کے باعث سفر سخت مشکل ہو گیا تھا ۔ ۱۸۹۵ء میں
قبائلیوں نے مسقط پر قبضہ کر لیا اور کئی دو سو جانیں تلف ہوئیں ۔ مشن کا مکان
اور کتابیں لوٹی گئیں ۔ زویمر کو برطانوی قونصل خانے میں پناہ لینی پڑی ۔ جب حالات
پرسکون ہوئے تو مشنری اور ان کے ساتھیوں نے دورہ کر کے بائبل کے ایک سو
کے قریب نسخے فروخت کیے ۔

کچھ مدت بعد اٹھارہ حبشی لڑکے ایک ڈوبتی ہوئی کشتی سے بچائے گئے

---

[1] Peter J. Zwemer

تھے۔ پادری زویمر نے ان کے لیئے ایک سکول جاری کر دیا، اور تھوڑی سی جگہ ایک چھاپے خانے کے لیئے حاصل کر لی۔ مسقط کی گرمی اور بخار نے پادری زویمر کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا اور وہ ۱۸۹۹ء میں امریکہ چلا گیا۔ جانتے ہی وفات پائی۔

زویمر کے بعد پادری بارنی[i] کو بھیجا گیا۔ وہ تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا اور اسے علاج کے لیئے ہندوستان جانا پڑا۔ پھر اس کی جگہ پادری جارج سٹون[ii] کو مقرر کیا گیا۔ وہ جوان تھا۔ صرف انتیس سال کی عمر تھی، مگر لو لگنے سے اس نے بھی وفات پائی۔ ان مشکلات کے باوجود مشن جاری رہا۔ تعلیم بھی دی جاتی تھی اور علاج معالجہ بھی کیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۳ء ہومر بریٹ[iii] مسقط میں امریکی قونصل تھا۔ اس نے رپورٹ بھیج دی کہ یہاں قونصل رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک کارندہ سب کام کر سکتا ہے۔ تجارت کی یہ کیفیت ہے کہ ۱۸۵۵ء کے بعد ۱۸۹۷ء تک کوئی امریکی جہاز نہیں آیا۔ پھر ۱۸۹۷ء کے بعد ۱۹۱۳ء تک کوئی جہاز نہیں آیا۔ چھ سال کی کوششوں سے دو موٹر کشتیاں اور دو پمپ فروخت کیئے گئے۔ اور حالت یہ ہے کہ مقامی آدمیوں کی ناواقفیت کے باعث ان سے صحیح کام نہیں لیا جا سکتا۔

باقی رہے مشنری تو بحرین و کویت کی طرح وہ بھی کسی امداد کے بغیر اپنا کاروبار جاری رکھ سکتے ہیں۔

---

[i] Rev. F. J. Barny [ii] Rev. George E. Stone
[iii] Homer Brett

حکومت کی چکی بڑی سست چلتی ہے۔ اس رپورٹ سے دو سال بعد تار پہنچا کہ مسقط کا قونصل خانہ بند کر دیا جائے۔ اس اثنا میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ جرمنوں نے امام عمان کو امداد دے کر کھڑا کر دیا جو اندرون ملک کے پہاڑی علاقوں پہ حکمران تھا چنانچہ امام نے مسقط پہ حملہ کر دیا۔ یہاں سات سو برطانوی فوج سلطان کی امداد کے لیے بیٹھی تھی جملہ تو پس پا ہو گیا۔ مگر کوئی فیصلہ کن نتیجہ سامنے نہ آیا۔ جنگ کے بعد ملک عملاً تقسیم ہو گیا۔ اندرون ملک کے پہاڑی علاقے امام کے قبضے میں رہے۔ اور ساحلی علاقوں پہ سلطان حکومت کرتا رہا۔

نومبر ۱۹۳۳ء میں جان رینڈالف[i] نے، جو بغداد میں امریکی قونصل تھا، سلطان مسقط سے تکریمی ملاقات کی اور مزید دس سال چپ چاپ گزر گئے۔ پھر یہ خیال آیا کہ مسقط کے ساتھ امریکہ کے معاہدے کی صد سالہ تقریب منانے اور باہمی تعلقات کو مستحکم کرنے کے لیئے ایک خاص سفارتی مشن بھیجا جائے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں یہ مشن گیا اور مشہور امریکی ماہر عربیات پال نینبن شو[ii] اس کا رئیس تھا جو بغداد میں امریکہ کی طرف سے وزیر مختار تھا۔ اس کے ساتھ چند اور اصحاب تھے۔ مثلاً نینبن شو کا بیٹا ڈینس[iii] اور امریکی سفارت خانے کا جونیئر سکرٹری جیمز ایس موز[iv] وہ بصرہ سے چلے اور بحرین و بندر عباس ٹھہرتے ہوئے مسقط پہنچے۔ سلطان سعید ابن تیمور دو سال پیشتر مسند نشین ہوا تھا اور چوبیس سال کی عمر تھی۔ اس

i John Randolph [ii] Paul Knabenshue
[iii] Dennis [iv] James S. Moose

نے اپنے محل کے دروازے پر امریکیوں کا استقبال کیا اور انھیں تخت گاہ میں لے گیا۔ سب سے پہلے نہایت مرغن لیئی پیش کی گئی[1] اس میں یہں اتنا تھا کہ کھانے کے بعد عرق گلاب سے ہاتھ دھو کر تولیئے سے پونچھنے پڑتے۔ پھر تقریریں ہوئیں۔ تجارت کو بڑھانے اور تعلقات زیادہ مستحکم بنانے کے متعلق فیصلہ ہو گیا۔ شام کو سلطان نے اپنے محل میں دعوت طعام دی۔ کھانا فرش پر کھایا گیا۔ بڑے بڑے قابوں میں بھنے ہوئے دنبے، چاول، مرغ، سبزیاں، روٹیاں، آم، انگور رکھے تھے۔ کھانے کے بعد نیمن شو اور سلطان کے ہاتھ وہیں دھلا دیئے گئے۔ باقی اصحاب کو اس غرض سے دوسرے کمرے میں جانا پڑا۔

اگلے روز بعد دوپہر نیمن شو نے امریکی مشن کے ایک نئے ہسپتال کا افتتاح کیا۔ اس تقریب میں امیر سعید محمد سلطان کا نمائندہ بن کر آیا تھا۔ دوسرے امراء، سرکاری افسروں اور غیر ملکی افراد کی بھی خاصی تعداد موجود تھی۔ یہ ہسپتال پادری ڈرک ڈکسٹرا[2] کی کوششوں سے بنا تھا۔

۲۰۔ مارچ ۱۹۳۷ء کو سلطان نے ایک خط صدر روزویلٹ کو لکھا کہ آپ کے وزیر مختار نیمن شو کی بازدید کے سلسلے میں امریکہ آنا چاہتا ہوں۔ روزویلٹ نے فوراً سلطان کو دعوت دے دی۔ چنانچہ وہ ہندوستان سے مشرق بعید کے راستے ۱۹ فروری ۱۹۳۸ء کو سان فرانسسکو پہنچا۔ قریباً ایک

---

[1] یہ مسقطی حلوا تھا۔ جو اپنی شیرینی، لذت، لطافت اور خوشگواری کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ تعجب ہے مصنف بھی اس سے آگاہ نہ ہو سکا حالانکہ عرب میں جگہ جگہ پھرتا رہا۔

[2] Rev. Dirk Dykstra

مہینا امریکہ میں بسر کیا - اور ۲۳ - مارچ کو نیو یارک سے واپسی کا سفر شروع ہوا۔
چلتے وقت روز ویلٹ کو شکریے کا خط بھیجا، اس کے ساتھ ایک سنہری خنجر
بہ طور تحفہ پیش کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں منا بہ تناف تک ہوائی جہازوں کے سفر کے
لیے اڈوں کی ضرورت تھی - چنانچہ سلطان سے مشورہ کر کے صلالہ (مغربی ظفار) اور
جزیرہ مصیرہ میں اڈے بنا لیے گئے - جنگ کے بعد ان کی ضرورت نہ رہی۔ ضروری
سامان اٹھا لیا گیا - اور باقی سب کچھ سلطان کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔

سلطنت کا رقبہ بیاسی ہزار مربع میل ہے یعنی یمن سے کسی قدر زیادہ
ہے۔ جیسے جزیرۃ العرب کے جنوبی و مغربی گوشے میں وہی حیثیت حاصل ہے
جو مسقط و عمان کو جنوبی و مشرقی گوشے میں حاصل ہے۔ مگر مسقط و عمان
کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے۔ جو یمن کا ۱/۵ حصہ ہے۔ ساحل آٹھ سو میل کے
قریب ہے۔ اندرون ملک میں برہنہ اور خشک پہاڑ ہیں۔ مغربی حد پر ناقابل عبور
صحرا[1] ہے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ آبادی غیر مسلموں کی سخت مخالف ہے،
اس وجہ سے اندرون ملک کی دیکھ بھال اور چھان بین اب تک پوری طرح
نہیں کی جا سکی۔

اندرون ملک کے پہاڑوں کے بعد عمان کا ساحلی میدان آتا ہے۔ جسے

---

[1] یہ ناقابل عبور صحرا ربع الخالی ہے۔ جس کا مفصل ذکر اس کتاب
کے دسویں باب میں آ چکا ہے۔ مصنف چونکہ اطراف ملک کا ذکر کر رہا تھا۔ اس لیے اس
کا نام لینا غالباً ضروری نہ سمجھا۔

بطینہ کہتے ہیں۔اس کے ساتھ جو علاقہ ہے، وہ دنیا کے عظیم ترین نخلستانوں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ اندرون مسقط و عمان میں صرف چار یا پانچ سالانہ بارش ہوتی ہے، مگر بطینہ میں بارش اتنی ہو جاتی ہے کہ یہاں خوب کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ کھجوریں پرورش کی جاتی ہیں۔ گندم بوئی جاتی ہے، قسم قسم کے پھل والے درخت لگائے گئے ہیں۔ جانور اور مرغیاں بھی پالی جاتی ہیں۔ دیہات میں مختلف قوموں کے لوگ آباد ہیں۔ مثلاً عرب، حبشی، ایرانی، عراقی، ہندوستانی، ہندو، بلوچ کہیں کہیں پرتگیزی خون بھی نظر آجاتا ہے۔ عام مکان کھجور کی چٹائیوں سے بنائے گئے ہیں۔ بڑے بڑے مکان کچی دیواروں کے ہیں۔ قلعوں اور محلوں کی تعمیر میں پتھر استعمال ہوا ہے۔ یہ لوگ شارک مچھلیاں بھی مار لیتے ہیں۔ اور ان کے بازو فروخت کی غرض سے چین تک بھیجے جاتے ہیں۔ مقامی کپڑوں میں سے دھوتی خاص طور پر قابل ذکر ہے جسے مقامی کشتیوں کے لیے بادبان بنانے کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ مسقط کی شمالی جانب دو سو میل موٹریں جا سکتی ہیں۔ اندرون ملک میں اونٹ، گھوڑے اور گدھے کی سواری استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے، خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ نیز پانی کی کمیابی اور ملکی حالات کی بے یقینی کے باعث یہ خطرناک بھی ہے۔

اندرون ملک میں لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں، لیکن پانی کی قلت نقصان رساں ہے۔ پہاڑوں کے اندر بعض وادیوں میں اب تک کافی پانی مل جاتا ہے۔ وہاں کھجوروں کے علاوہ، لیموں، سیب، غلہ اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مسقطی انگور غالباً پرتگیز لائے تھے۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مسقط سے ایک سو چالیس میل شمال میں عمان کی ایک بندرگاہ کا نام سہام ہے۔ یہاں امریکہ کی دو خاتونوں نے ایک ہسپتال قائم کر رکھا ہے جو دنیا کے منقطع ترین ہسپتالوں میں سے ہے۔ زیادہ سن رسیدہ خاتون ڈاکٹر سارا لونگ ورتھ ہاسمن مدت تک مسقط کے زنانہ ہسپتال میں انسر رہی ۱۹۳۲ء میں اس نے سہام میں الگ ہسپتال کھول لینے کا فیصلہ کیا۔ سات سال تک تنہا اس میں کام کرتی رہی۔ پھر سے ایک نوجوان مددگار مل گئی۔ ان خاتونوں نے سہام کے باشندوں کو مغربی دواؤں اور طریق علاج سے فائدہ پہنچایا۔ ۱۹۴۹ء کے موسم بہار میں انھیں دوائیں منگوانے کے لیے طہران کے امریکی قونصل سے درخواست کرنی پڑی چنانچہ دوائیں ہوائی جہاز میں سے سہام پہنچا کر چھتری کے ذریعے سے اتار دی گئیں۔

مسقط کے شمال میں تھوڑی دور قصبہ سِیب ہے جہاں گرمیوں میں مسقط کی نصف آبادی منتقل ہو جاتی ہے اور سمندر کے کنارے روزانہ بڑا ہجوم رہتا ہے۔ پاس ہی مطرح ہے، جسے سلطنت کا تجارتی مرکز سمجھنا چاہیئے۔ اس کی آبادی دس ہزار ہوگی۔ پانچ میل جنوب میں مسقط کی بندرگاہ کے قریب ہی ایک برطانوی جہاز کا ڈھانچا نظر آتا ہے جس پر دوسری جنگ عظیم میں جاپانی آبدوز نے تارپیڈو چلایا

(بقیہ صفحہ ۲۸۷) انگور کی ایک قسم کشمیر میں دیکھی جسے مسقطی کہتے ہیں۔ اس کی جلد ذرا سخت ہوتی ہے اور کھایا جائے تو اس میں سے شیرینی کے ساتھ نہایت عمدہ خوشبو نکلتی ہے جو طبیعت میں انشراح پیدا کرتی ہے۔ ممکن ہے یہ قسم مسقط سے آئی ہو۔ (صفحہ ۲۸۸) [1]

[1] Sarah Longwarth Hosma ان خاتونوں کا جذبہ خدمت خلق یقیناً صد درجہ قابل ستایش ہی نہیں قابل تقلید بھی ہے۔

تھا اور جہاز غرق ہو گیا تھا۔ مسقط اور مطرح جزیرۃ العرب کے گرم ترین شہر ہیں۔ یہاں سایے میں بھی درجہ حرارت ۱۲۵ رہتا ہے۔ البتہ راتیں کسی قدر خنک ہوتی ہیں۔ برطانوی قونصل خانے کے اردگرد پتھر کی بلند دیوار ہے اور دیکھنے میں یہ قونصل خانہ قلعہ معلوم ہوتا ہے۔ نمائندے کا سرکاری لقب پولٹیکل ایجنٹ ہے۔ امارت مسقط کے اندرونی اور بیرونی معاملات میں اس کا وظیفہ مشیر کا ہے۔ مشہور سیاح اور مکتشف برٹرام ٹامس بھی ایک زمانے میں یہاں برطانوی افسر تھا۔

مقامی طور پر کوئی چیز نہیں بنتی۔ بیشتر چیزیں باہر ہی سے آتی ہیں۔ مہینے میں دو انگریزی جہاز یہاں آتے ہیں۔ ایک خلیج فارس کے اندر جاتے ہوئے اور ایک لوٹتے ہوئے۔ عرب زنجبار، عدن یا خلیج فارس کی امارتوں سے جو سامان لاتے ہیں وہ کشتیوں میں آتا ہے۔

مسقط میں انگریزی فوج کوئی نہیں، مگر ایک پنشن یافتہ انگریز افسر کو سلطان نے اپنی فوجوں کا کمانڈر بنالیا ہے۔ ہوائی جہاز میں سوار ہو کر جنوب مشرق کی طرف سفر کیا جائے تو ایک قصبہ آتا ہے، جس کی آبادی سات ہزار سے کم نہ ہو گی۔ پھر راس الحد کا چکر کاٹتے ہوئے جہاز کا رُخ مغرب کی جانب ہو جاتا ہے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جزیرہ مسیرہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے آگے ایک وسیع خلیج ہے، پھر صلالہ آ جاتا ہے۔ جو مسقط کے صوبہ ظفار کا مرکز حکومت ہے۔ سارے ملک میں یہ مقام صد درجہ خوشگوار رہتا ہے۔ سلطان اور اس کے درباری گرمیوں کا موسم یہیں گزارتے ہیں۔ یہاں سال بھر ہوا خوشگوار رہتی اور راتیں خنک ہوتی ہیں۔ سلطان نے اس جگہ نیا محل تعمیر کرایا ہے جو ہوائی اڈے سے دس میل پر ہے۔ اس کے اردگرد اینٹوں کی دیوار ہے۔ پھولوں کی کیاریاں

اور پھل والے درختوں کے جھنڈ ہیں جو ایک چشمے سے سیراب ہوتے ہیں۔ چشمہ عقبی پہاڑوں سے آتا ہے جو بارہ میل دور واقع ہیں۔

ظفار پر دو ہزار سال تک افسردگی و پژمردگی طاری رہی، اس لیے بخورات (عود و لوبان) کی جس تجارت کا یہ واحد مرکز تھا، وہ ختم ہو چکی تھی۔ صلالہ کی بندرگاہ میں موسمی ہواؤں سے محفوظ رہنے کا کوئی انتظام نہیں، اس لیے کہ پانچ ماہ تک یہ بالکل بے کار ہو جاتا ہے۔ مسقط سے خشکی کے راستے آنا ہو تو موٹریں نہیں آ سکتیں، اونٹ پر آئیں تو بیس دن لگ جاتے ہیں۔ عدن کی جانب سے آنا اور بھی مشکل ہے۔ اس لحاظ سے سمجھنا چاہیئے کہ ظفار کے بیس ہزار باشندے آج کل بھی اسی طرح الگ تھلگ زندگی بسر کر رہے ہیں، جس طرح دو ہزار سال پیشتر کرتے تھے۔ وہ اجنبیوں خصوصاً غیر مسلموں کو بہت شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

شرجہ اور معاہدا ساحلوں کے ساحل پر یورپ کے لوگ آتے جاتے ہیں۔ یمن کے باشندے جیپوں کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ حضرموت کی الگ تھلگ وادیوں میں بھی موٹریں پہنچنے لگی ہیں، لیکن مسقط میں بیسویں صدی نے تاحال ایک ہی قدم رکھا ہے۔ یہ عمان اور ظفار کے صوبے تک نہیں پہنچی۔ اگر وہاں تیل یا معدنیات میں سے کوئی دوسری چیز دریافت نہ ہوئی تو اغلب یہی ہے کہ زندگی جس نہج پر اب جاری ہے، اسی نہج پر باقی رہے گی۔

پندرھواں باب

عدن کی نو آبادی
عرب میں برطانیہ کا دوسرا جبل الطارق

دنیا میں بہت کم بندرگاہیں ہیں۔ جو آب و ہوا کی خرابی میں عدن کے برابر بدنام ہوں۔ عام جہاز صرف چند گھنٹے یہاں ٹھہرتے ہیں اور مسافر اپنے روزنامچے میں یہی لکھے گا کہ عدن میں بے آب و گیاہ چٹانوں، سنگین تالابوں اور جھلسا دینے والی گرمی کے سوا کچھ نہیں۔ ایک امریکی قونصل کا قصہ مشہور ہے۔ اس نے عدن میں دو سال کی مدت ملازمت پوری کر لی تو واشنگٹن سے تار پہنچا کہ نئے قونصل کا تقرر ہو چکا ہے اور وہ جائزہ لینے کے لیے پہنچنے والا ہے۔ دوسرے روز تار ملا کہ وہ شخص ملازمت سے مستعفی ہو گیا ہے اور نئے آدمی کا انتظار کرنا چاہیئے۔ دو مرتبہ یہی ہوا۔ پھر ایک صاحب پہنچ گئے۔ سابق قونصل نووارد کو لے کر کلب گھر گیا۔ وہاں نہ برف تھی، نہ پنکھے چل رہے تھے۔ اور درجہ حرارت سایے میں ایک سو تھا۔ قونصل خانے میں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد وہ لوگ ایک پہاڑی پر چلے

گئے۔ جہاں سے بندرگاہ عدن کا نظارہ بخوبی دیکھا جا سکتا تھا اور یہ بھی خیال تھا کہ وہاں ہوا خوشگوار ہو گی، لیکن اتفاق سے ہوا گرم بھی تھی اور اس میں ریت بھی ملی ہوئی تھی۔ نووارد نے پہاڑی کی چوٹی ہی پر قونصل سے پوچھا جس جہاز سے میں اترا ہوں، اس کے بعد امریکہ جانے والا جہاز کب آئے گا؟ جواب ملا کہ مہینے بھر میں ایک جہاز آتا ہے۔ جب جہاز آئے گا تو ہمارے لیے آئس کریم اور برف میں لگی ہوئی دوسری چیزیں بھی لائے گا۔ نووارد نے کہا: نہیں، ان کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر امریکہ جا رہا ہوں۔

مئی سے ستمبر تک عدن گرم ہوتا ہے۔ مئی اور ستمبر کے مہینے اس وجہ سے بدترین ہیں کہ ان میں برساتی ہواؤں کا رُخ بدلتا ہے۔ ہفتوں تک ایسا حبس رہتا ہے کہ جس میں دم گھٹے۔ اکتوبر سے اپریل تک شمالی و مشرقی برساتی ہوائیں چلتی ہیں۔ اس زمانے میں مقابلتہً خنکی ہوتی ہے۔ نومبر، دسمبر اور جنوری میں ہوا یقیناً خوشگوار رہتی ہے۔ اب کمروں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے انتظامات جاری ہو گئے ہیں اور سفید فام لوگ بھی وہاں صحت و توانائی کو نقصان پہنچائے بغیر کام کر سکتے ہیں۔

گرمی کے باوجود جو امریکی عدن میں رہتے ہیں۔ وہ اس مقام کے لیے ایک عجیب پسندیدگی پیدا کر لیتے ہیں۔ ہوٹل، اجتماع کے خوشگوار مقام ہیں۔ شہر میں دکانیں بھی ہیں۔ ان کے علاوہ گالف، ٹینس، پولو، کشتی رانی، تیراکی، ماہی گیری۔ اور شکار کے مشغلے ہیں۔ بعض لوگ پہاڑوں پر چڑھتے ہیں۔

عدن کی نوآبادی دو جزیرہ نماؤں پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے تھے۔ جو مدت ہوئی خاموش ہو چکا تھا اور آج کل زیر آب ہے۔

مغربی جزیرہ نما "عدن خورد" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں تیل صاف کرنے کا کارخانہ لگ جانے سے خوب چہل پہل ہو گئی ہے۔ مشرقی جزیرہ نما میں اصل عدن واقع ہے۔ یہیں جہاز ٹھہرتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے باشندے سمندر کے کنارے یا اونچے ٹیلوں پر رہتے ہیں۔ پرانا عدن شہر جو ایک آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ ہے، اس جزیرہ نما سے آگے مشرقی جانب واقع ہے۔ عربوں کے شہر کا نام شیخ عثمان ہے۔ وہ اس سے بھی آگے ہے۔

یہ دو جزیرہ نما، دو نہایت عمدہ بندرگاہیں ہیں۔ اس وجہ سے عدن نے دنیا کی تجارت میں خاص اہمیت حاصل کی۔ ان کے سر پر جو پہاڑ کھڑا ہے اس کی بلندی ایک ہزار سات سو چھتر فٹ ہے۔ انگریزوں نے اس پر ۱۸۳۹ء میں قبضہ کیا تھا۔ اس وقت سے یہ آزاد بندرگاہ بن گیا۔ کوئلہ اور تیل لینے کا یہ ایک اہم مرکز ہے۔ نہایت اہم بحری اور ہوائی اڈا بھی بن گیا ہے۔

نوآبادی عدن میں تقریباً اسی ہزار افراد رہتے ہیں جس میں عرب بھی ہیں، صومالی بھی، پارسی بھی ہیں اور یہودی بھی۔ مصری بھی ہیں اور شامی بھی۔ ایرانی بھی ہیں اور تھوڑے سے چینی بھی۔ ایک درجن سے کم امریکی ہیں۔ نیز برطانوی بری فوج، بحری فوج اور ہوائی فوج کے افسر اور تعلیم و نسق کے ذمہ دار بھی رہتے ہیں[1]۔

---

[1] امین ریحانی نے اپنی کتاب ملوک العرب میں عدن کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: عدن ایک عام شہر ہے، نہ یہ مغربی ہے نہ شرقی اور نہ عربی، یہ صرف تجارتی شہر ہے۔ کوئلے کا مرکز ہے اور فوجی معسکر ہے یہاں مسلمان خدا کی عبادت کرتے ہیں، پارسی سورج کی (باقی برصفحہ ۲۹۷)

غالباً ۱۵۰ق م میں عدن ایک جزیرہ تھا۔ ہندوستان سے مسالہ اور مشرق بعید سے ریشم عدن ہی کے راستے عربوں کی ان شہری ریاستوں میں پہنچتا تھا جو مشرقی یمن یا بحیرہ روم تک بخورات وغیرہ کی تجارتی شاہراہ پر واقع تھیں۔ بحیرہ احمر پر اقتدار حاصل کرنے والی ہر طاقت کو عدن کی اہمیت کا احساس ہوتا رہا۔ رومیوں نے بھی اس اہمیت کو محسوس کر لینے کے بعد ۲۴ء میں عدن پر قبضہ جمایا تھا۔ ممکن ہے یہ ایلیس گیلس[1] کی مشہور مہم یمن کے سلسلے کا واقعہ ہو۔ عقلمند لوگ جولائی کے مہینے میں ہندوستان آجاتے تھے اور موسم خزاں کے آتے ہی عدن پہنچ جاتے تھے۔

مسیحیت ۳۵۶ء میں عدن پہنچی، جب شاہنشاہ کانسٹن ٹیس[2] ثانی نے تھیوفیلس[3] انڈس کی سرکردگی میں مبلغوں کی ایک جماعت بھیجی تھی اور تھیوفیلس انڈس ہی نے وہاں گرجا تعمیر کیا تھا۔ پھر یہاں باری باری حبشی، ایرانی اور یمنی برسر اقتدار رہے۔ مارکوپولو ۱۲۸۵ء میں عدن پہنچا تھا۔ وہ اسے خوشحال و بارونق بندرگاہ قرار دیتا ہے جسے عرب کے جنوبی ساحل پر مسقط تک اقتدار حاصل تھا اور وہاں مسلح جہازوں کا ایک زبردست بیڑا بھی موجود تھا۔ ایک اطالوی سیاح ڈیی ورتھیما تھی لغاً ۱۵۰۴ء میں وارد عدن ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جو جہاز عدن کی بندرگاہ میں پہنچتا ہے اس کے مستول، بادبان وغیرہ اتار لیئے جاتے

(بقیہ صفحہ ۲۹۳) پرستش میں سرگرم ہیں۔ بنیے بتوں کو پوجتے ہیں عیسائی تصویروں کا احترام کرتے ہیں۔ اسماعیل صاحب اذان کرتے ہیں یہاں سب تجارت میں مصروف ہیں ایک دوسرے سے تعرض نہیں کرتے (حوالہ صفحہ ۲۹۳ معہ ضمیمہ)۔ [1] Aelius Gallus رومیوں نے یہ مہم جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے دیو سے تیار کر کے جنوب کی طرف روانہ کی تھی۔ (باقی صفحہ ۲۹۵)

ہیں تاکہ وہ بندرگاہ کا محصول ادا کیئے بغیر روانہ نہ ہو سکے۔ پہلا انگریزی جہاز ۱۶۰۹ء میں عدن پہنچا تھا اس کا نام "اسنشن"[۱] تھا۔ اس پر مشہور سیاح اور تاجر جان جورڈائین[۲] سوار ہو کر آیا تھا جسے عدن، صنعا اور مخا میں بعض حیرت انگیز واقعات سے سابقہ پڑا۔

۱۷۳۵ء میں سلطنت لحج نے امام صنعاء کے اقتدار کا جوا اتار پھینکا اور آئندہ سو سال تک عدن لحج کے ماتحت رہا۔ اس زمانے میں یہ مقام بحر ہند کے قزاقوں کے لیئے ایک بین الاقوامی نوآبادی بن گیا۔ وہ لوگ اسی بندرگاہ سے نکل کر ہندوستان سے بحر احمر یا راس امید کی طرف جانے والے مالدار جہازوں پر چھاپے مارتے تھے۔ مشہور امریکی قزاق کپتان کڈ[۳] بھی کچھ مدت تک عدن کی بندرگاہ سے چھاپے مارتا رہا، مگر اس نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہ دیا۔ البتہ ایک اور امریکی قزاق کپتان ٹیو[۴] نے خاصی کامیابی حاصل کی۔ وہ خلیج عدن سے واپس امریکہ پہنچا تو بڑی دولت ساتھ لے گیا۔ دوسری مرتبہ اس حلقے میں آیا تو بحیرہ قلزم کے جنوبی حصے میں ایک برطانوی جہاز پر چھاپا مارتے ہوئے مارا گیا۔ یہ قزاقیاں برطانیہ اور امریکہ کے تجارتی جہازوں کے لیئے اس درجہ اذیت افزا بن

(بقیہ صفحہ ۲۹۴) لیکن گیلیس راستے میں ہی رہ گیا۔ جنوب تک نہ پہنچ سکا۔ ممکن ہے عدن کو کسی اور شخص نے فتح کیا ہو۔

(i) Constantius (ii) theophilus Indus (iii) Di Varthemd
(i) Ascension (ii) John Jourdain (iii) Kidd
(iv) Tew

چکی تھیں کہ ۱۸۱۵ء میں بمبئی سے ایک بحری مہم ان کے خلاف بھیجی گئی۔ لحج کی طرف سے عدن میں جو حاکم مقرر تھا اسے قزاقوں سے خوب رقمیں مل جاتی تھیں، لہٰذا اس نے قزاقی کے انسداد میں برطانیہ کے ساتھ تعاون نہ کیا۔

۱۸۳۵ء میں ایک برطانوی جہاز عدن کے قریب کنارے کی چٹانوں سے ٹکرا گیا۔ اس کے عملے اور مسافروں کو سلطان لحج نے قید کر لیا۔ آخر ان کی رہائی کے لیے برطانیہ کو ایک مہم بھیجنی پڑی۔ اس قسم کے حالات سے مجبور ہو کر برطانیہ نے ۱۸۳۹ء میں عدن پر بزور قبضہ کر لیا۔ کپتان ہینز[41] پہلا شخص تھا، جسے برطانیہ کی طرف سے ریزیڈنٹ بنا کر عدن بھیجا گیا۔

انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اس نوآبادی کی رفتار ترقی تیز نہ تھی، لیکن جب سویز کے افتتاح سے عدن دنیا کی شاہراہ تجارت کا ایک اہم مقام بن گیا تو اس کے تاجروں نے خوب نفع کمایا۔ پہلی جنگ عظیم میں ترک کی فوجیں لحج تک پہنچ گئی تھیں جو عدن سے صرف بیس میل شمال میں ہے۔ مگر وہ عدن پر قابض نہ ہو سکیں۔ ۱۹۳۰ء میں اٹلی نے بحیرۂ قلزم میں پاؤں جمانے کی کوشش کی، اس وجہ سے عدن کی حفاظت اور تجارت کے لیے خطرہ پیدا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں اٹلی نے عدن پر بم برسائے اور اس کی آبدوزوں نے کئی برطانوی جہاز عدن کی بندرگاہ میں ڈبو دیے۔

تجارت عدن کی زندگی ہے اور یہاں عرب کی تمام بندرگاہوں سے زیادہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بندرگاہ بہت اچھی ہے۔ تاجر کاروبار کا خاص ملکہ

---

[41] Haines

رکھتے ہیں۔ اور یہاں محصول وغیرہ کوئی نہیں۔ اس وجہ سے تجارت خوب ترقی کر گئی ہے۔ علاوہ بریں یہ مقام جنوبی افریقہ، سنگاپور وغیرہ کے راستے کا زبردست مرکز ہے۔ یہاں کے تاجر مقامی کارندوں کے ذریعے سے جنوبی و مغربی عرب اور شمالی و مشرقی افریقہ سے کھالیں، چمڑے، قہوہ اور سیپیاں خریدتے ہیں۔ پھر یہ چیزیں امریکہ، برطانیہ، ہندوستان، مصر وغیرہ میں فروخت کر دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں بہ کثرت بیرونی سکے مل جاتے ہیں، جن سے کپڑا، مٹی کا تیل اور اپنے گرد و پیش کے حلقے کی ضرورت کی دوسری جنسیں خرید کر تقسیم کر دیتے ہیں، البتہ تجارت میں مقابلہ سخت ہے۔

باشندگان عدن جس لباس کے عادی ہیں، اس کے لیے شوخ رنگوں کے کپڑوں کی خاصی مقدار درکار ہوتی ہے۔ عورتیں سر سے پاؤں تک بھاری کپڑوں کی تھوں، شالوں اور نقابوں میں ملفوف رہتی ہیں۔ مرد ٹخنوں تک لمبا کرتا پہنتے ہیں۔ کندھے پر لنگی یا شال رکھتے ہیں اور پگڑی باندھتے ہیں۔ پہلے کپڑے کی درآمد میں امریکہ کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ موجودہ صدی کے عشرۂ ثالثہ میں جاپان آگے نکل گیا۔ اب کچھ مدت سے پھر امریکہ نے اپنا سابقہ مقام ایک حد تک دوبارہ حاصل کر لیا ہے۔ تاہم جاپانی کپڑا پھر عدن کے بازار میں آنے لگا ہے۔ نمک عدن کی خاص برآمدی جنس ہے۔

بندرگاہ کے سامنے نمک بنانے کے بڑے بڑے کھیت ہیں۔ چاندنی رات میں یہ حصہ ایسا نظر آتا ہے جیسے دور تک برف پڑی ہوئی ہو۔

عدن، جنوبی افریقہ، کولمبو، بمبئی اور سویز کے قریباً وسط میں واقع

ہے۔ یہاں پٹرول خلیج فارس سے آتا ہے۔ اور کوئلے کے ذخیرے جنوبی افریقہ سے لائے جاتے ہیں۔ تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ اینگلو ایرانین آئل کمپنی نے ساڑھے بارہ کروڑ ڈالر کے خرچ سے لگایا ہے جس میں ایک لاکھ ٹن تیل روزانہ صاف ہو سکے گا۔ اس میں اڑھائی ہزار کے قریب امریکی، برطانوی اور دوسرے یورپی ملکوں کے ماہرین فن اور دس ہزار عرب اور ہندوستانی مصروف کار ہیں۔ جو خام تیل اس کارخانے میں صاف ہوگا، وہ زیادہ تر کویت سے آئے گا۔ قریباً نصف تیل بحری جہازوں میں استعمال کے لیے ہوگا۔ اس وجہ سے عدن کی اہمیت اور بڑھ جائیگی۔

ان مسافروں کے ذریعے سے بھی اہل عدن کو آمدنی ہوتی ہے، جو جہازوں کے چند گھنٹے ٹھہرنے کے دوران میں اتر کر شہر پہنچ جاتے ہیں۔ اور دکانوں سے چیزیں خریدتے ہیں۔ برطانیہ کی بری، بحری اور فضائی فوج اب بھی وہاں موجود ہے اور ان لوگوں نے بہترین جگہ پر قبضہ کر رکھا ہے پہلے عنان نظم بری فوج کے ہاتھ میں تھی، اب فضائی فوج کے ہاتھ میں ہے۔ ہوائی اڈا ایک مسطح اور ریتلی خاکنائے پر ہے، جو جزیرہ نما کو اوپر ملاتی ہے۔ نوآبادی کا داخلی نظم و نسق پولیس کے ہاتھ میں ہے، جس کے اعلیٰ افسر انگریز ہیں اور زیر حمایت امارتوں میں قیام امن کی ذمہ دار دو فوجی تنظیمیں ہیں، اول سرکاری گارڈ، دوم حضرمی بدوؤں کا لیجن، یہ دونوں فوجیں عدن میں رہتی ہیں اور زیادہ تر داخلی عرب کے رضاکاروں پر مشتمل ہیں۔ البتہ ان کے افسر انگریز ہیں۔ نظم و نسق کے ذمہ داروں کو جب ضرورت پڑتی ہے، مختلف قبائل میں سے بقدر ضرورت آدمی بھرتی کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ تنخواہ، خوراک اور لباس کے ساتھ جنگجوئی کی زندگی بہت سے آدمیوں کو اپنی طرف

کھینچ لاتی ہے۔

پہلا جیش (سرکاری گارڈ) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سرکاری چوکیوں اور اندرون ملک کے افسروں کی حفاظت کے لیئے ہے۔ ایک تیسرا جیش بھی تیار کر لیا گیا ہے اس کا نام ہے عدن لیویز (عدنی خاصہ دار) ہے اسے باقاعدہ فوجی تربیت دی گئی ہے۔ مسلح موٹروں اور ہلکی توپوں کے ساتھ میدان جنگ میں بھیجا جا سکتا ہے۔ یہ جیش اس وقت بھیجا جاتا ہے جب کوئی شیخ اپنے کسی ہمسایے کے خلاف جنگ چھیڑ لیتا ہے۔ یا قافلے کا راستہ روک لیتا ہے اور پہلے دو دستے اسے راہ راست پر لانے میں ناکافی متصور ہوتے ہیں۔

مغربی پیمانے کے مطابق تو آبادی کے دیسی باشندوں کا معیار زندگی پست ہے لیکن اگر یمن یا زیر حمایت امارتوں کے سادہ اور قدیم وضع کے معیار کو سامنے رکھا جائے تو مذکورہ بالا معیار خاصا بلند نظر آتا ہے۔ عدن پورے علاقے کا مرکز ہے اس لیئے بہت سے مسافر روزانہ پیدل یا اونٹ اور ٹوٹی پھوٹی موٹر پر یا کشتی کے ذریعے سے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ مغرب کا کوئی باشندہ کھچا کھچ بھرے ہوئے بازار دیکھے گا۔ تو حیران ہوگا کہ عدن جیسے بنجر علاقے میں ان سب کے لیئے کھانے پینے کا سامان کیونکر مہیا ہوتا ہے۔ سب کے گزارے کی ایک بنیاد تو خاندانی روابط ہیں۔ اس لیئے کہ جو بیکار لوگ عدن پہنچ جاتے ہیں۔ وہ جب تک بیکار رہتے ہیں، رشتہ دار انہیں کھانا کھلاتے ہیں اس لیئے کہ اگر ان پر کبھی بے کاری کا دور آئے گا تو وہ خود بھی دوسرے عزیزوں کے ہاں کھانے کے حقدار ہوں گے۔

بہت سے آدمیوں کو گودیوں پر یا عمارتیں بننے کی جگہ مزدوری مل جاتی ہے بعض لوگ خانگی ملازمتیں قبول کر لیتے ہیں۔ یا دفتروں میں قاصد بن جاتے ہیں اور بعض چھوٹی دکانوں پر نوکر ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ تھوڑے پڑھے لکھے ہوتے ہیں انھیں کسی فرم میں سرکاری محکمے میں محرری مل جاتی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں مناسب موقع مل گیا اور وہ اچھے کاروباری بن گئے یا زمینیں خرید لیں یا قانون دانی کا پیشہ اختیار کر لیا یا ڈاکٹری شروع کر دی یا سکول میں معلمی پسند کر لی۔ اگرچہ آبادی میں عربوں کا حصہ غالب ہے۔ لیکن صومالیوں، یہودیوں اور ہندوستانیوں کے لئے بھی روزی پیدا کرنے کے امکانات موجود ہیں۔

اکثریت اینٹوں کے پلستر کیے ہوئے گنجان مکانوں میں رہتی ہے۔ ان کی نیچے کی منزلیں عموماً دکانوں کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ وہاں بے شمار چائے خانے ہیں جہاں دن بھر لوگ جمع رہتے ہیں اور مسلسل باتیں کرتے جاتے ہیں۔ قات کھانے والے لوگ ذرا الگ تھلگ نشست گاہوں میں بیٹھتے ہیں۔ اگرچہ حجام کو مجلسی لحاظ سے اونچا درجہ حاصل نہیں تاہم عدن میں اس کی خاص حیثیت ہے۔ شادی کی تقریبات میں اس کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ فصد بھی وہی لیتا ہے اور اچھے پیسے کماتا ہے۔

عدن میں مسجدیں بہت ہیں۔ بہت سے لوگ سہولت کے لیے کھلی جگہوں میں جمع ہو کر پانچ وقت نماز ادا کر لیتے ہیں۔ مسجد جامع کے میناروں سے اذان کی صدا بلند ہوتی ہے تو ساتھ ہی ہر کونے سے اللہ اکبر اللہ اکبر گونج اٹھتا ہے۔ عدن میں دلچسپی کی بھی بعض چیزیں ہیں۔ مثلاً معلی میں کشتی سازی

کا کارخانہ۔ یہاں عدنی کاریگر ایسی کشتیاں بناتے ہیں، جو بصرہ، بمبئی اور زنجبار تک مسافر اور سامان لے جاتی لاتی ہیں۔ عوام میں مشہور ہے کہ حضرت نوح کی کشتی عدن ہی میں بنی تھی[1] اور غالباً ملکہ سبا بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کے لیئے عدن ہی سے جہاز پر سوار ہوئی تھی، بہ شرطیکہ ہم سمجھ لیں، وہ خشکی کے بجائے سمندر کے راستے گئی تھی[2]۔ یہاں دو دو سو ٹن کی کشتیاں بنتی ہیں۔ کشتیوں کے کارخانے کے عقب میں جو ملنار ٹیلے ہیں، ان کے اوپر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ایک سنگین دیوار ہے۔ یہ اس زمانے کی یادگار ہے، جب اندرون ملک کی طرف سے آبادی پر قبائلی حملے ہوتے تھے اور فوجی اس دیوار کی اوٹ میں بیٹھ کر حملوں کی روک تھام کرتے تھے۔ اس دیوار کے ایک حصے کے پاس ایک بلند چوٹی پر قابیل[3] کی قبر بتائی جاتی ہے۔ اس لیئے کہ مقامی روایت کے مطابق "باغ عدن"، عدن ہی کے علاقے میں تھا۔ ممکن ہے جزیرہ سقوطرہ[4] یا وادی حضر موت میں ہو۔

---

[1] یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا اس لیے کہ مسلمہ حقائق کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کا وطن دوآبہ دجلہ و فرات میں تھا۔ [2] یہ بھی صحیح نہیں اس لیے کہ کتاب مقدس میں ملکہ سبا کا سفر اونٹوں کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ یعنی یہ سفر یقیناً خشکی کے راستے ہوا۔ ملاحظہ ہو کتاب مقدس ۲۔ تواریخ نواں باب)۔ [3] قابیل ابن آدم علیہ السلام جسے انگریزی میں قائن کہتے ہیں۔ [4] جزیرہ سقوطرہ خلیج عدن کے دہانے پر جنوبی سمت میں ہے اور عرب کا ایک نہایت مشہور جزیرہ ہے بمبئی، کراچی وغیرہ کی طرف سے خلیج عدن کے دروازے میں پہنچیں تو پہلے سقوطرہ آئے گا۔

شہر عدن میں پہاڑوں کے دامن کے ساتھ ساتھ ایسے بڑے تالاب بنائے گئے ہیں، جن میں بارش کا پانی جمع کیا جاتا تھا۔ یہ تالاب انیسویں صدی کے اختتام پر دریافت ہوئے تھے، اور انہیں صاف کیا گیا تھا۔ اندازہ ہے کہ ان میں دو کروڑ گیلن پانی کی گنجایش تھی۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں عدن کے اندر اوسط بارش موجودہ ایک انچ سالانہ سے بہت زیادہ تھا۔ یہ تالاب حضرت مسیح علیہ السلام سے پیشتر کے بنے ہوئے ہیں جب عدن تجارات کی تجارت کا مرکز تھا۔

۱۸۳۹ء سے ۱۹۳۷ء تک عدن کا نظم و نسق وزارت ہند کے ماتحت تھا۔ ہر تجویز پہلے عدن سے ہندوستان بھیجی جاتی تھی۔ اور حکومت ہند اس تجویز کو لندن بھیجتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کاروبار میں خاصی تاخیر ہو جاتی تھی۔ برطانوی فوج نظم و نسق کی ذمہ دار تھی۔ بمبئی سے کسی میجر یا فسٹ کرنیل کو بھیج دیا جاتا تھا۔ اور وہی ناظم اعلیٰ ہوتا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں عدن کو تاج کی نوآبادی بنا دیا گیا۔ اور اس کا انتظام حکومت بمبئی سے منتقل کر کے وزارت مستعمرات برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ جنگ کے بعد حکومت برطانیہ نے ایک رقم عدن کو ارتقائی منصوبوں کے لیئے دی۔ ایک پروگرام تیار کر لیا گیا جس کے مطابق امید ہے کہ کسی روز بڑی بڑی فرمیں، کارخانے دکانیں، مکان اور تیل کے ذخیرے وغیرہ کلڑ مٹر نہ رہیں گے، بلکہ الگ الگ حلقوں میں چلے جائیں گے۔ اس طرح عدن کی آبادی زیادہ دلکش ہو جائے گی۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں قانون ساز مجلس قائم ہوئی۔ گورنر عدن کی مختلف

آبادیوں کے نمائندوں کو ممبر نامزد کرتا ہے۔ اس طرح سیاسی ذمہ داری کی طرف پہلا قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ امید ہے مقامی باشندے ایک روز پورے اختیارات کے مالک بن جائیں گے۔ ۱۹۴۹ء میں مجلس بلدیہ کے لیے ممبروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور چنے ہوئے ممبروں نے اسی سال اپریل میں کام شروع کیا۔

جزیرہ سقوطرہ بھی عدن ہی کے انتظامی حلقے میں شامل ہے جو جنوبی سمت میں ساحل عرب سے تین سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ جزیرہ اسی میل لمبا اور تیس میل چوڑا ہے۔ مقامی روایت یہ ہے کہ یہی جزیرہ باغ عدن تھا۔ ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کہ زمانہ قدیم میں جزیرہ جنوبی عرب کی شہری ریاستوں کی ایک نوآبادی تھا۔ اور یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے ایک ہزار سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ جزیرے کے جنوبی و مغربی گوشے میں ایک سنگین عمارت کے کھنڈر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عمارت رسول توما[1] نے بنائی تھی۔ یہ امر قرین قیاس نہیں۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں نسطوری مسیحیوں کا ایک گرجا سقوطرہ میں موجود تھا۔

مارکوپولو کے بیان سے واضح ہوتا ہے۔ کہ اس کے زمانے میں ہندوستان سے عدن کی جانب آنے والا ہر جہاز سقوطرہ میں ٹھہرتا تھا۔ اور یہاں تجارت کی گرم بازاری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پرتگیزی امیر البحر البوقرق[2] نے ۱۵۰۷ء میں سقوطرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس لیے کہ اسے لزبن سے یورپ اور ہندوستان

---

[1] Apostle thomas حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ حواریوں میں سے ایک۔
[2] Albuquerque (۱۵۱۵-۱۴۵۳) مشہور پرتگیزی گورنر

کے درمیان تجارتی شاہراہوں پر قبضہ کرنے ہی کی غرض سے بھیجا گیا تھا ظاہر ہے
کہ یہ جزیرہ بحیرۂ قلزم کے جنوبی گوشے سے بہت فاصلے پر واقع تھا اس لیے تجارتی شاہراہ
پر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا۔ پرتگیزوں کے تعمیر کیے ہوئے قلعے کے کھنڈرات اب تک
موجود ہیں۔ جو قبیلہ جزیرے کے مشرقی حصے میں رہتا ہے، وہ پرتگیز حملہ آوروں
ہی کی اولاد ہونے کا مدعی ہے۔ البوقرق کے ہمراہیوں نے مسیحیت کے احیاء
کی کوشش کی۔ کرملی[1] فرقے کے ایک پادری نے سترھویں صدی میں اس
جزیرے کو دیکھا تو گرجاؤں کی حالت خاصی خراب تھی، اگرچہ عوام تیلیاں
اور صلیب لے کر جلوس کی شکل میں نکلتے تھے اور چاند کی پوجا کرتے تھے۔
انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں وہابی مبلغ وہاں پہنچ گئے۔
لوگ امن پسند اور تن آسان ہیں۔ کھجوروں اور شارک مچھلی کے گوشت
پر ان کا گزارا ہے۔ اتنا ہی کماتے جس سے ان کے گزارے کا بندوبست ہو۔
شمالی حصے میں کچھ خطے سرسبز ہیں۔ وسطی حصے میں اچھی چراگاہیں ہیں۔ جہاں
جانور پالے جاتے ہیں اور گھی باہر بھیجا جاتا ہے۔ یہاں دم الاخوین[2] کی کثرت ہے۔
عرب اس سے روغن اور وارنش بناتے ہیں۔ سقوطرا میں گھوڑے اچھے پائے گئے

---

[1] CARMELILE یہ مسیحی درویشوں کا ایک فرقہ تھا۔ ان کے پیشوا
نے فلسطین کے مشہور پہاڑ کوہ کارمل (کوہ الیاس) پر ایک جھونپڑی بنائی تھی۔
اسی سے یہ فرقہ چلا۔ یہ لوگ بہت عابد و زاہد برتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں
باتیں نہیں کرتے۔ اور غربت و افلاس سے انہیں محبت ہوتی ہے [2] دم الاخوین
کو انگریزی میں DRAGON'S BLOOD TREE کہتے ہیں۔

نہیں ہوتے۔ صرف اونٹ سے باربرداری اور سواری کا کام لیا جاتا ہے۔

جزیرے کا حکمران خاندان راس فرسان سے آیا تھا۔ ۱۸۸۶ء سے یہ عدن کے ماتحت چلا آتا ہے۔ مختلف سیاحوں نے بیان کیا ہے کہ قرون وسطیٰ میں جزیرۂ سحری تنزاتی اور ساحری کے لحاظ سے بہت بدنام ہے۔ اس کے نشو و ارتقا میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ یہاں کوئی اچھی بندرگاہ نہیں۔ جنوبی سطح مرتفع کے باشندے جو زبان بولتے ہیں، وہ جنوبی عرب کی قدیم حکومتوں کی زبان سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اگر ان لوگوں کے مطالعے میں وقت صرف کیا جائے تو امید ہے کہ حمیری عہد کے متعلق ہمارے علم میں اضافہ ہوگا۔

کوریا موریا اور جزیرۂ قمران[1] بھی عدن ہی کے علاقے میں شامل ہیں۔ کوریا موریا چھوٹے چھوٹے اور بنجر جزیروں کا ایک مجموعہ ہے جو مسقط کے صوبہ ظفار کے سامنے واقع ہے۔ ان سے صرف ماہی گیروں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ قمران یمن کے سامنے ہے۔ (بحیرہ احمر میں) عثمانی سلطان سلیمان اعظم کے ماہرین بحریات نے اس جزیرے کی اہمیت محسوس کر لی تھی۔ اور ۱۹۱۵ء تک یہ ترکوں کے قبضے میں رہا۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی بیڑے نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۴۹ء میں اس کا انتظام عدن کے پاس کی ان امارتوں میں شامل کر دیا گیا، جنھیں مغربی جانب کی زیر حمایت امارتیں کہتے ہیں۔ یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ یمن اس جزیرے پر تمام دعووں سے دست بردار ہو گیا ہے۔

قمران کے متعلق تین چیزیں قابل ذکر ہیں:-

۱- یہاں زمانہ سابق میں ان حاجیوں کے لیے قرنطینہ تھا، جو سمندر کی

---

[1] اس جزیرے کو ہمارے ہاں عام طور پر کامران لکھتے ہیں، لیکن جدید علم کے مطابق صحیح قمران ہی ہے۔

بندرگاہوں سے مکہ معظمہ جانے تھے۔ انھیں جزیرے کے مشرقی حصے میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ جہاں ایک اچھا ہسپتال بنا دیا گیا تھا۔ عمارت پتھر کی تھی۔ اور مختلف اقوام کے لوگ وہاں کام کرتے تھے۔

۲۔ وہاں ایک عمدہ ہوائی اڈا ہے، جہاں اسمرا سے عدن آنے جانے والے ہوائی جہاز ٹھہرتے ہیں۔

۳۔ میجر ٹامسن جو تھوڑی دیر ہوئی پنشن پر سبک دوش ہوا، وہ برسوں جزیرہ قمران میں رہا اور وہاں کا بے تاج بادشاہ مشہور تھا۔ اسی کی کوششوں سے وہاں برف کا کارخانہ لگ گیا۔ اور کھاری پانی کو صاف کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

جزیرے کی آبادی صرف تین ہزار ہے۔
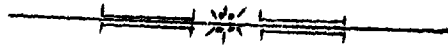
سولھواں باب:

عدن کی زیر حمایت امارتیں

لحاج اور شغلک پرمس امارتوں کے خطے

عدن اور متعلقہ جزیرے تاج برطانیہ کی نوآبادی ہیں۔ اس سے بدرجہا زیادہ
وسیع وہ امارتیں ہیں جو برطانیہ کے زیر حمایت ہیں۔ ان میں سے مشرقی امارتوں میں
حضرموت کی خوش منظر اور سطح مرتفع آگئی ہے۔ مغربی امارتیں عدن کے
شمال میں واقع ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے حلقے ہیں۔ جو تعداد میں اٹھارہ ہیں
اور ان میں تیئیس سلطان، چوبیس شیوخ اور ایک امیر حکمران ہیں۔ ان کی حیثیت
وہ نہیں جو خلیج فارس کے زیر حمایت حکومتوں مثلاً کویت، بحرین، قطر اور معاہد
امارتوں کے ساحلی علاقے کی ہے۔ یہ آخر الذکر خطے اصلاً آزاد ہیں۔ صرف
خارجی معاملات کا انتظام برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ مغربی امارتوں
میں لحج، حوشبی، عوزالی اور ضالع بھی شامل ہیں۔ یہاں انگریز مشیروں
نے ایسا نظام حکومت قائم کر دیا ہے جو سلطنت برطانیہ کے مقاصد اور مقامی

آبادی کی طبیعتوں کے عین مطابق تھا۔

مغربی امارتوں کا علاقہ عدن کے عقب سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے گرم اور ریتیلا میدان آتا ہے جو چار میل سے چالیس میل تک چوڑا ہے۔ مزید اندر کی طرف بڑھیں تو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آجاتی ہیں۔ اور علاقے نے سطح مرتفع کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جو دو ہزار فٹ بلند ہے۔ پھر اونچے پہاڑ آجاتے ہیں، جن میں سے جنوبی عرب کے چار دریا اور بہت سے نالے نکلے ہیں۔ یہ سب ریگ زار میں گم ہونے سے پیشتر مغربی امارتوں کے علاقے کو سیراب کرتے ہیں۔ ان پہاڑوں کی ہوا مقابلتاً خنک اور خوشگوار ہے۔ موسم گرما کی کسی شام میں عدن کے کسی مکان کی چھت پر بیٹھ جائیں تو یہ دیکھ کر دل کو سخت رنج ہوتا ہے کہ سورج کی کرنوں نے جو پانی بحر ہند میں سے اٹھایا تھا، بادل وہ سارے کا سارا لے جاکر زیر حمایت امارتوں کے بالائی علاقے پر موسلا دھار بارش کی شکل میں برسا دیتے ہیں۔

ان امارتوں کے حلقے میں آہستہ آہستہ توسیع ہوئی۔ جب کسی بڑی طاقت نے عدن کے آس پاس کوئی قدم گاہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو حکومت برطانیہ اندرونی حصوں کے عرب قبائل سے معاہدے کرتی گئی۔ اب پرانے خونی انتقام ختم ہو رہے ہیں اور نہ شیخ نئے اپنے حدود کی توسیع کے لیے کوشش کرتے ہیں، اور نہ بھاری محصول گزر لگا کر قافلوں کا راستہ روکا جاتا ہے۔ اس حلقے میں تشویش کا اصل سرچشمہ امام یمن کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کا ملک جنوبی سمت میں بحر ہند تک جاتا ہے، یہاں تک کہ عدن کی آبادی اور زیر حمایت

امارتیں بھی یمن ہی کا حصہ ہیں ۔ امام یمن سے تو بہ ظاہر کوئی خطرہ نہیں ۔ مصیبت یہ ہے کہ جنوبی یمن کے سرحدی قبیلے وقتاً فوقتاً زیر حمایت امارتوں کے شمالی حصے پر چھاپے مارتے رہتے ہیں اور ان کی طرف سے سخت تر جواب دیا جاتا ہے[۱] جب ایسا کوئی واقعہ پیش آتا ہے یا کوئی مقامی رئیس امن میں خلل ڈالتا ہے تو پولیٹیکل افسر پہلے ثالثی کے ذریعے سے تصفیہ کی کوشش کرتا ہے ۔ یہ تدبیر کارآمد ثابت نہ ہو تو رائل ایرفورس کو خاص منصوبے کے مطابق کام کا حکم مل جاتا ہے ۔ مثلاً پہلے انتباہ کیا جاتا ہے کہ طور طریقے درست کر لو ، ورنہ بم برسائے جائیں گے ۔ اگر قبائل نہ مانیں تو بتا دیا جاتا ہے کہ فلاں مقام پر اور فلاں وقت بم گریں گے ۔ اس طرح وہ مقامات خالی ہو جاتے ہیں اور وہاں پہلے پہل وہ بم پھینکے جاتے ہیں جن سے صرف دھواں اٹھتا ہے ۔ جب کوئی بھی صورت

---

[۱] یہ صحیح نہیں ۔ خود ان امارتوں میں بھی ہزاروں آدمی آزادی کے طلبگار ہیں ۔ لیکن برطانوی اقتدار نے انھیں بے بس کر رکھا ہے ۔ فرض کر لیجیے کہ یمن کا دعویٰ صحیح نہیں یعنی یمن کا علاقہ جنوب میں بحر ہند تک نہیں آتا ۔ تاہم برطانیہ کو اس علاقے پر کیا حق حاصل ہے ؟ یمن تو زبان ، نسل اور قومیت کا دعویٰ بے تکلف پیش کر سکتا ہے اور اسے جھٹلایا نہ جا سکے گا ۔ مگر برطانیہ کس بنا پر کوئی دعویٰ کر سکتا ہے ؟ یمن جغرافیائی وحدت کا سوال بھی اٹھا سکتا ہے ، برطانیہ کا ملک تو ان علاقوں سے کم از کم چار ہزار میل کے فاصلے پر ہے ۔ یہ وہی سامراج کے باقیات ہیں ، اور جتنی جلدی ختم ہوں تمام اجنبیوں کے ساتھ خصوصاً برطانیہ کے ساتھ تعلقات بہتر ہوں گے ۔ برطانیہ کا انحصار صرف خود غرض شیوخ یا رؤسائے قبائل پر ہے لیکن یہ سہارا کب تک ساتھ دے سکے گا ؟ یہ آج ہے تو کل نہیں ، کل ہے تو پرسوں نہیں ۔

کارگر نظر آئے تو واقعی ہم برسائے جاتے ہیں۔ اس پورے معاملے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یمن اور زیر حمایت علاقے دونوں کے جنگجو ان ہوائی جہازوں پر گولیاں چلاتے رہتے ہیں اور زیادہ بلندی پر نہیں اڑتے۔ جب کشمکش ختم ہو جاتی ہے اور ہوائی جہاز زمین پر اترتے ہیں کہ بمباری کے نتائج کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو قبائلی باشندے آکر گرمجوشی سے ان کے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی چلائی ہوئی گولیاں جہاز کے کہاں کہاں لگیں۔

نو آبادی سے بالکل ملا ہوا علاقہ عبادلہ[1] کا ہے۔ جس پر امیر علی بن عبدالکریم العبدلی سلطان لحج حکمران ہے۔ اس امارت کا دارالحکومت "الحوطہ" ریتلے بنجر زار میں ایک شاداب و روح افروز نخلستان ہے۔ یہ آبادی دو وادیوں کے درمیان نہایت موزوں مقام پر واقع ہے۔ اور عدن کی ضرورت کے مطابق زیادہ تر خوراک یہیں پیدا ہوتی ہے یہاں لیموں، کھجور، امرود، کٹھل کے گھنے باغ ہیں۔ شہد بھی بہت ہوتا ہے۔ سبزی بھی کثرت سے پائی جاتی ہے اور عمدہ فصلوں کے وسیع کشت زار بھی ہیں۔ ان تمام چیزوں کا مالک یا تو سلطان ہے یا مقامی امرا ہیں۔ رعایا کا ادنیٰ فرد بھی اپنی شکایات سلطان کے پاس پیش کر سکتا ہے۔ ترکوں نے ۱۹۱۵ء میں "الحوطہ" کو تباہ کر دیا تھا۔ لیکن اسے دوبارہ نئے انداز پر آباد کر لیا گیا۔

لحج سے آگے جائیں تو ریت اور خشک وادیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور چلتے وقت گرد و غبار بہت اڑتا ہے۔ دس میل کا سفر طے کر کے آدمی پہاڑوں کے دامن میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ندی نالوں پر شہتیر ڈال کر پل بنائے گئے ہیں۔ ان میں

---

[1] یعنی قبیلہ عبدلی، عبدل کی جمع عبادلہ ہے۔

اچانک زبردست سیل آجاتے ہیں۔ ان ندی نالوں کے ساتھ ساتھ گاؤں آباد ہیں جن کی دیواریں پتھر کی ہیں۔ اوپر گھاس پھوس ڈال لیا گیا ہے۔ عام لوگ جہاں کہیں زمین کا اچھا ٹکڑا پاتے ہیں، کاشت کر لیتے ہیں یہی ان کے گزارے کا ذریعہ ہے۔ قبرستانوں کو دیکھو تو ہر دس بارہ قبروں میں سے دو چار ضرور چار چار فٹ اونچی نظر آئیں گی بس سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ لوگ جنگ میں مارے گئے۔ ان لوگوں کو بڑے احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جو شخص بندوق اور جنبیہ[۵۱] حاصل کر لے اسے قبیلے کا صحیح رکن سمجھا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ ۱۹۲۹ء میں یہاں بے امنی پیدا ہوئی تھی جب سلطان صالح بن عمر اور اس کا بیٹا عمر بن صالح مارے گئے۔ اطلاعات یہ تھیں کہ چند آدمی سلطان سے ملنے کے لیے آئے۔ کھانا کھایا۔ پھر خاصی رات گئے تک قات چباتے رہے۔ سلطان کے پہرہ دار سو گئے۔ تو وہ لوگ دو بجے اٹھے۔ دروازہ کھولا اپنے دس ساتھیوں کو اندر داخل کر لیا، سلطان اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا۔ محافظین پر قابو پا لیا۔ عورتوں کو باہر نکال دیا۔ اور محل پر قابض ہو گئے۔ یہ سنتے ہی سلطان کے دوسرے بیٹے محمد بن صالح نے دو ہزار آدمی جمع کر کے حملہ کیا تو قلعے کے دروازے کھلے تھے اور قاتلوں کا گروہ جا چکا تھا اور دوسرا سامان لے کر چمپت ہو چکا تھا۔ ممکن ہے وہ اس لیے نکل گئے ہوں کہ ہوائی جہازوں سے بم باری کے لیے انتباہ ہو چکا تھا۔

ان پہاڑی دیہات میں سے ہر ایک کا شیخ ہے جو اپنے علاقے کے سلطان

---

[۵۱] جنب کے معنی پہلو اور کنارے کے ہیں۔ جنبیہ اس خنجر کو کہتے ہیں جو عرب عموماً پہلو میں لگاتے رہتے ہیں۔

کے تابع ہوتا ہے۔ ہواشب[1] کے علاقے کا سلطان محمد بن بہرور ہے جس کا دارالحکومت
مسیمیر ہے۔ اس کا محل بہت بڑا ہے۔ ارد گرد چھوٹے چھوٹے مکان ہیں۔ بڑے
دروازے پر مسلح پہرہ رہتا ہے۔ صحن میں داخل ہوں تو مرغیاں، بکریاں اور ایک دو
گائیں پھرتی نظر آتی ہیں۔ ایک طرف پرانی موٹر کا زنگ خوردہ ڈھانچا پڑا ہے۔ پاس
ہی ایک نئی سٹیشن ویگن ہے جس میں سلطان عدن جاتا ہے۔ کوئی بلند پایہ مہمان
آجائے تو سلطان اور اس کے متعلقین دروازے پر استقبال کرتے ہیں اور ایک
تاریک زینے میں سے ہوتے ہوئے ملاقات کے کمرے میں لے جاتے ہیں۔ جوتے
دروازے پر اتارنے پڑتے ہیں۔ فرش نرم گدیلوں کا ہے۔ سلطان سیگریٹ پیتا ہے۔
نصف سیگرٹ پی کر فرش پر پھینک دیتا ہے اور ملازم اسے اٹھا کر دو تین کش لگا
لیتا ہے۔ سلطان کے لیے تات کے اعلیٰ درجے کے پتے لائے جاتے ہیں۔ مہمان
کھانا کھا کر اور تھوڑی دیر آرام کر کے رخصت ہوتا ہے۔ تو سلطان اسے ایک دو
مرغیاں اور ایک آدھ بکرا ضرور دیتا ہے۔

اور آگے جائیں تو بلند پہاڑوں کے درمیان سرسبز وادیاں ملتی ہیں۔ اور بن مانسوں
کے لشکر ادھر ادھر بھاگتے نظر آتے ہیں۔ کہیں سستانے کے لیے ٹھہر جائیں تو
ممکن ہے ہُدہُد بھی سامنے آجائے۔ ساحل سے پچاسی میل پر درۂ خریبہ ہے جہاں
سے بلند ترین پہاڑ شروع ہوتے ہیں۔ ایک تنگ اور پُر پیچ وخم سڑک پر سے
گزرتے ہوئے گھاٹی پر چڑھتے جائیں۔ تو ضالع کا زرخیز خطہ آجاتا ہے۔ جس کی
حیثیت سطح مرتفع کی ہے۔ میدانی علاقوں کی تکلیف دہ گرمی کے مقابلے میں

---

[1] ہوشب کی جمع، ایک قبیلے کا نام ہے۔

اس خطے کی خشکی اور خوشگواری ناقابل تصور ہے۔ قصبہ ضالع کی آبادی قریباً چار ہزار ہے اور ایک نوجوان شیخ علی بن علی بن شایف اس کا امیر ہے۔ نظم و نسق میں اس کا انحصار عدن کے ایک تعلیم یافتہ عرب پہ ہے، جو اس مقام پر اسسٹنٹ پولٹیکل افسر کے طور پہ کام کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے تعلیم اور حفظان صحت کے انتظامات بہتر ہو گئے ہیں۔ سبزیاں اور گندم کی کاشت بڑھ گئی ہے۔
یہاں قات بھی بہت ہوتی ہے اور ضالع کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ قات بھی ہے۔
خود حکومت برطانیہ نے بھی اب پرانی پالیسی بدل لی ہے۔ پہلے صرف قبائل کے درمیان باہمی رزم و پیکار کو روکنے پر قناعت کی جاتی تھی۔ اب قبائل کے شیوخ کو نقد روپیہ دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی نشو و ارتقا کے منصوبے ان کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اب سڑکیں درست ہو گئی ہیں۔ کہیں کہیں ہوائی جہازوں کے اڈے بن گئے ہیں۔ اس طرح آمد و رفت اور تجارت میں سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ بڑے مرکزوں میں ہسپتال اور چھوٹے قصبوں میں دواخانے قائم ہو گئے ہیں۔ سکولوں کا جال بچھ رہا ہے۔ زراعت کی اصلاح پہ زور دیا جا رہا ہے۔ اب تمام مقامی رئیسوں کے پاس موٹریں اور ریڈیو موجود ہیں۔ لحج میں بجلی کی روشنی، بجلی کے پنکھوں اور پانی کے نلوں کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔ بلکہ سینما بھی بن گئے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ مغربی امارتوں کی زمین میں تیل کے ذخیرے ہیں۔ اگر یہ خیال درست ثابت ہو تو دور حاضر کے سامان فراہم ہونے کی رفتار تیز تر ہو جائے گی اس لیے کہ سرمایہ خاص مل جائے گا۔
صد درجہ اہم اصلاح یہ ہو گی کہ لوگوں کو پانی کے صحیح استعمال کا طریقہ بتا دیا جائے

جب پہاڑوں پر خوب بارش ہو جاتی ہے تو بعض وادیوں میں چھ چھ فٹ کی گہرائی تک پانی آجاتا ہے۔ افسوس کہ زیادہ تر پانی ضائع جاتا ہے۔ اگر بند بنا دیئے جائیں یا ایسے کنوئیں تعمیر کر دیئے جائیں جن میں پانی محفوظ ہو سکے یا زراعت کے لیئے نالیاں کھودلی جائیں۔ تو سیل اور طغیانی کی لعنت ترقی زراعت کا خوشگوار و بابرکت ذریعہ بن جائے گی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں انگریزوں نے عدن کی آبادی کے لیئے سبزیاں فراہم کرنے کے ایک منصوبے پر عمل شروع کیا تھا۔ چنانچہ ایک فارم عوزالی سطح مرتفع پر قائم کیا گیا۔ ایک اور فارم ابین میں قائم ہوا جو ساحلی میدان میں واقع ہے۔ اور جہاں ایک بہت بڑی آبادی ایک زرخیز خطے کو قطع کرتی ہوئی سمندر تک چلی گئی ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً سیلاب آتے رہتے ہیں۔ انگریزوں کے زیر ہدایت جا بجا مٹی کے بند بن رہے ہیں۔ نہریں کھدرہی ہیں۔ امید ہے کہ کسی وقت ان کی جگہ پختہ بند اور پختہ نہریں بن جائیں گی۔ کپاس کی کاشت کا دائرہ بھی بڑھایا جا رہا ہے۔
مغربی امارتوں کے انیس اجزا کو ملا کر وفاقی انداز کی ایک سیاسی وحدت کی شکل دے دینے کی کوششیں ہو رہی ہیں[1]۔ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو

---

[1] مصنف نے تعداد بتا دی۔ مگر تفصیل کچھ نہ بتائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تھوڑی سی تفصیل مناسب ہے۔ یہ علاقہ جسے مصنف نے زیر حمایت ریاستوں یا حکومتوں یا امارتوں کا مغربی حصہ قرار دیا ہے عام طور پر "لحج اور نواحی تسع" کے نام سے مشہور رہا ہے۔ لحج کا ذکر آچکا ہے۔ امین ریحانی کے بیان کے مطابق باقی علاقوں کی کیفیت یہ ہے، جو قبائل کی بنا پر منقسم ہیں۔ یہ
۱۔ **العقبیہ** :- یہ قبیلہ عدن کے مغرب میں آباد ہے۔ اور اس کا علاقہ ساحل کے ساتھ ساتھ راس عمران سے باب المندب تک چلا جاتا ہے (باقی بر صفحہ ۳۱۵)

ہر طرف کامل امن کا دور دورہ شروع ہو جائے گا، اگر ان کے لیئے کافی خوراک مہیا ہو جائے، آمدورفت کی سہولتیں بڑھ جائیں، اور قات کھانے کا سلسلہ گھٹ جائے تو یہاں کے باشندے مفید شہری بن سکتے ہیں۔

بقیہ صفحہ (۳۱۴) ان میں اور قبیلے بھی ہیں۔ مثلاً مطیقی اور ربزمی۔ یہ لوگ بڑے جنگجو ہیں اور ضرورت کے وقت بیس ہزار آدمی میدان جنگ میں لا سکتے ہیں۔ یہ تین مہینے میں ایک مرتبہ عدن جا کر مہمانی کا ڈیڑھ سو روپیہ لے آتے ہیں۔ یا سلطان لحج کے ذریعے سے وصول کرتے ہیں۔

۲۔ آل فضل یا فضلی:۔ یہ قبیلہ عدن کے مشرق میں ساحل کے ساتھ ساتھ آباد ہے۔

۳۔ عوالق:۔ یہ آل فضل کے مشرق میں آباد ہے اور ان کا علاقہ نواحی تسبع میں سب سے بڑا ہے۔ یہ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک کو عوالق علیا کہتے ہیں اور دوسرے کو عوالق سفلی، یعنی عوالق بالا اور عوالق زیریں۔

۴۔ عوازل:۔ عوالق کے علاقے سے پھر مغرب کی طرف لوٹیں تو آل فضل کے شمال مشرق میں عوازل ہیں۔ الدثینہ ان کا مرکزی مقام ہے۔

۵۔ یوافع:۔ عوازل سے مغرب میں یوافع ہیں۔ ان کے بھی دو حصے ہیں یوافع بالا اور یوافع زیریں۔

۶۔ علوی اور قطیبی: یہ دو قبیلے یوافع اور حواشب کے درمیان ہیں۔

۷۔ حواشب:۔ یہ لحج اور الصبیحہ کے ہمسایے ہیں ان کا مرکز مسیمیر ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور یہ پچیس ہزار آدمی میدان جنگ میں لا سکتے ہیں۔ (باقی بر صفحہ ۳۱۶)

عدن سے ساڑھے چار سو میل مشرق میں ایک وادی ساحلی سطح مرتفع کو قطع کرتی ہوئی بحر ہند میں گرتی ہے۔ یہ وادی حضر موت ہے۔ جو جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے حصوں کی طرح تاریخ، آثار قدیمہ اور رومانیت کے قیمتی ذخیرے اپنے دامن میں سمیٹے بیٹھی ہے۔ حضر موت اسّی سال تک اس علاقے کا حصہ رہا۔ جو عدن کے عقب میں واقع ہے۔ پھر ایک مستقل پولیٹیکل افسر مقرر ہوا۔ صرف چند افسروں یا مبلغوں یا ایئر فورس کے چند ممبروں اور مٹھی بھر امریکی سائنس والوں کے سوا اس علاقے کا دورہ کسی نے نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ بہت سے مسلم قبائل کی مذہبی روش بھی ہے۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضر موت کے مشرق و مغرب میں بلند پہاڑوں کی دیواریں کھڑی ہیں۔ جنوبی سمت میں کوئی اچھی بندرگاہ نہیں شمالی سرحد پر صحرائے ربع الخالی نے پختہ مُہر لگا رکھی ہے۔

عدن کے مشرق میں جو زیرِ حمایت علاقے ہیں، ان کا رقبہ تقریباً ستر ہزار مربع میل اور آبادی تین لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ ساحلی ہوا اگرچہ گرم ہے، مگر عدن سے بہتر ہے۔ البتہ حضر موت کی وادی کے اندر اور پہاڑی علاقے میں موسم خاصا خنک اور خوشگوار ہوتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ نام "حضرہ" سے

۸۔ (بقیہ صفحہ ۳۱۵) العقارب:۔ یہ ایک چھوٹا سا قبیلہ ہے۔

۹۔ الضالع:۔ اس کی تفصیلات متن میں پیش ہو چکی ہیں۔ یہ لحج سے آگے بلند پہاڑوں میں واقع ہے۔

ان کے علاوہ مشرقی حصے میں ایک بہت بڑا قبیلہ الواحدی ہے۔ لیکن اسے نئے انتظامات کے ماتحت غالباً حضر موت یعنی مشرقی امارتوں میں شامل کر لیا گیا۔

ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں شہروں اور مزروعہ خطوں کا علاقہ۔ بعض لوگ اسے عاد سے منسوب کرتے ہیں[1]۔ یہاں سات بڑے علاقے ہیں، جن سے حکومت برطانیہ نے معاہدے کر رکھے ہیں۔ دو الواحدی سلطنتیں۔ ایک بئرعلی کی اور دوسری بلحاف کی، تیسرا علاقہ قشن کا، چوتھا عرقہ کا اور پانچواں حورا کا۔ سب سے اونچا درجہ سلطان شحر و مکلا کا ہے۔ جسے ہز ہائنس (اعلیٰ حضرت) کا خطاب حاصل ہے۔ اس کے لیے گیارہ توپ کی سلامی ہے۔ اس کے بعد ایک سلطان آتا ہے جس کے لیے نو توپ کی سلامی مقرر ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے ہزاروں سال پیشتر جزیرۃ العرب کے صحرا سرسبز و شاداب تھے۔ مشرقی یمن کے علاقوں سے پانی کے جو چشمے بہتے تھے، وہ دریاؤں کی شکل اختیار کر کے حضرموت کی سرزمین کو کاٹتے ہوئے بحر ہند میں گرتے تھے۔ ممکن ہے یہاں بھی ویسی ہی دریائی تہذیب نشو و نما پا چکی ہو جیسی تہذیبیں نیل یا دجلہ و فرات کے کنارے درجہ کمال کو پہنچیں۔ قدیم داستانیں، آثار قدیمہ بلکہ آج کل حضرمی فن تعمیر بھی وادیوں کے ابتدائی باشندوں کو بابل سے ملاتا ہے۔ عربوں کی روایت کے مطابق قحطان یا یقطان، جو عربوں کا پدر اول تھا۔ ۲۲۱۶ء ق م کے

---

[1] حضرموت کا نام قحطان یا یقطان پدر اول عرب کے بارہ بیٹوں میں سے ایک کے ساتھ منسوب ہے، جس کا نام حضرماوت تھا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے بھی اپنی کتاب "ارض القرآن" میں یہی وجہ تسمیہ بیان فرمائی ہے (ملاحظہ ہو جلد اول ص ۹۴) عبرانی میں اس مقام کا نام "حضرموت" یا "حصارموت" مذکور ہوا ہے۔

آس پاس حضرت موت میں پیدا ہوا۔ پھر یہاں سے اٹھ کر یمن چلا گیا۔ یہ تاریخ اس اعتبار سے بڑی دلچسپ ہے۔ کہ یہی زمانہ ہے جب حضرموت، ہندوستان اور مصر کے درمیان بخورات اور لوبان کی تجارت اعلیٰ درجے پر پہنچی اور وادی کے باشندوں کی خوشحالی کا دور شروع ہوا۔

جب وادی خشک ہونے لگی تو باشندے ندیوں اور دریاؤں کے ساتھ ساتھ یمن کے پہاڑی علاقوں کی طرف چلے گئے اور ایک ہزار قبل مسیح کے آس پاس دماں معاین، سبا، قحطان اور حمیر کی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ بعض اوقات حضرموت کے شہر مذکورہ یا لا شہری ریاستوں کے تابع چلے جاتے تھے۔ بعض اوقات وہ آزادی حاصل کر لیتے تھے۔ بہرصورت یہاں سے لوبان باہر جاتا تھا۔ ہندوستان اور مشرق بعید سے ریشم اور مسالے آتے تھے۔ یہ تجارت حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد سے حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد تک پھیلتی رہی۔ تجارتی راستہ یہاں سے مکہ معظمہ ہوتا ہوا بحیرۂ روم کی طرف جاتا تھا۔ جب تجارت کا رخ بحیرہ احمر اور خلیج فارس کی طرف پلٹا تو ان شہروں کی بلند حیثیت ختم ہو گئی۔ ساتھ ہی حضرموت کے لیے تنگی اور عسرت کا دور شروع ہو گیا۔ جو اب ختم ہونا شروع ہوا ہے۔

اسلام اس وادی میں سنہ ۶۳۰ء کے قریب پہنچا۔ ۸۵۷ء میں یمن کے عباسی حاکم نے باشندوں کو سیاہ لباس پہننے پر مجبور کیا، جو خاص عباسی نشان تھا۔ یہ لباس اب بھی حضرموت میں عام ہے۔ جب ترکوں نے خلافت کا منصب حاصل کر لیا اور عرب ان کے قبضے میں آیا تو حضرموت پر بھی ان کی توجہ مبذول ہوئی۔ سلیمان پاشا نے ستر جہازوں کا بیڑا تیار کیا۔ ساتھ سات ہزار ترک سپاہی بھیجے

انھوں نے جنوبی ساحل کی تمام بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ البتہ اندرون ملک میں ترکی اقتدار محض برائے نام رہا۔ پھر دو خاندانوں میں جھگڑا شروع ہوگیا، جن میں سے قعیطی خاندان نے خاصا غلبہ حاصل کر لیا۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے ہندوستان میں (دولت آصفیہ کی ملازمت کر کے) بڑی دولت جمع کر لی تھی ۱۸۸۸ء میں برطانیہ نے حضرموت پر قعیطی خاندان کی حکومت تسلیم کر لی اور خارجی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ نیز اس کی حمایت و حفاظت کا اقرار کر لیا۔

برطانیہ کو ۱۸۳۵ء سے حضرموت کے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی جب ایک برطانوی جہاز پالموراس[i] نے عرب کے جنوبی ساحل کا چکر لگایا تھا۔ حضرموت کی بندرگاہ مکلا کے متعلق کپتان نے لکھا کہ آبادی ساڑھے چار ہزار کے قریب ہے۔ پانچ فی صد محصول لیا جاتا ہے۔ اندر سے جو سامان باہر بھیجا جاتا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے: گوند، لوبان، چمڑے، اسنا کی اور قہوہ۔ باہر سے عام طور پر سوتی کپڑا، سیسہ، لوہے کے برتن، چاول، کھجوریں، خشک پھل، بھیڑیں اور غلام آتے ہیں۔ کپتان لکھتا ہے کہ میں نے بردہ فروشی کی منڈی میں سات سو عربی لڑکیاں فروخت کے لیے دیکھیں ..... ان کی قیمتیں سات پونڈ سے پچیس پونڈ تک تھیں۔ اسی جہاز پر جیمز آر ویل سٹیڈ[ii] نام ایک انگریز سوار تھا۔ وہ تھوڑی دور ملک کے اندر چلا گیا اور وہاں سے حمیری کتبے لے کر آیا۔ یہ اپنی نوعیت کے پہلے کتبے تھے جو دور حاضر میں مغربی دنیا کے اندر پہنچے۔

پہلا یورپی سیاح جس نے حضرموت کے تفصیلی حالات بیان کئے ایڈالف فان ریڈ[iii]

[i] Palmuras [ii] James R. Wellsted
[iii] Adolph von Wrede

تھا جس نے عازم حج کا بھیس بدل کر ۱۸۴۳ء میں علاقے کا سفر کیا۔ وہ وادی دُعان سے حُریبہ تک گیا۔ پھر بھید کھل گیا۔ مقامی شیخ نے اس کی تمام چیزیں چھین لیں اور اسے نکال دیا۔ واپسی میں جان بھی بہ مشکل بچی۔ ریڈ نے اپنے سفرنامے میں دوسری باتوں کے علاوہ اونچی عمارتوں اور دولت مند شہروں کا بھی ذکر کیا تھا۔ سمجھا گیا کہ یہ کہانیاں سنسنی پیدا کرنے کی غرض سے گھڑی گئیں۔ وہ بیچارا بعد میں ٹیکساس (امریکہ) چلا گیا جہاں ۱۸۶۰ء میں خودکشی کر لی۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرموت کے متعلق اس کے بیانات کو شبہ کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔

اگرچہ حضرموت عدن کے ماتحت تھا لیکن ۱۹۱۵ء تک کسی برطانوی افسر نے اس علاقے کا دورہ نہیں کیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں حضرموت کے دو بڑے خاندانوں کی کشمکش کو دور کرنے کے لیے برطانیہ نے ۱۹۱۸ء میں امن و دوستی کا معاہدہ کرا دیا۔ اس معاہدے کے سلسلے میں برطانوی افسروں کو وہاں جانا پڑا۔ اس وقت احساس ہوا کہ حضرموت میں نشوونما کے بڑے امکانات ہیں۔ چنانچہ آئندہ سال سے علاقے کی چھان بین شروع ہو گئی اور بعد میں بہت سے انگریز افسروں نے وہاں کی بندرگاہوں کے دورے کیے۔ ۱۹۳۴ء میں ڈبلیو۔ ایچ۔ انگرامس[1] کو مکلا میں مشیر بنا کر بھیجا گیا۔ یہ قابل ترین نوجوانوں میں سے تھا جو برطانیہ نے بحر ہند کے حلقے میں بھیجے گئے۔ اس نے عربوں میں اعتماد و احترام حاصل کر لیا اور آہستہ آہستہ اندرون ملک میں اپنا اثر بڑھا لیا۔ ۱۹۳۷ء میں انگرامس نے سلطان قُعیطی مکلا ....

---

[1] W. H. Ingrams

کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق سلطان نے مذہبی احکام و معاملات کے سوا تمام امور میں مشیر کی رائے مان لینے کا اقرار کر لیا۔ مختلف دیہات و مواضع میں جھگڑے جاری تھے، انگرامس نے سب ختم کر دیئے۔ ایک صلح نامہ تیار ہوا جس پر چودہ سو آدمیوں کے دستخط ثبت ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں اس صلح نامہ کو مزید دس سال کے لیے توسیع دے دی گئی۔

انگرامس ۱۹۳۷ء میں مکلا پہنچا تھا۔ تو سلطان کا نظام حکومت ایک وزیر، ایک خزانچی، ایک جرنیل، ایک ڈاکٹر اور چند معلموں پر مشتمل تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک مجلس شوریٰ بن چکی تھی جسے کابینہ سمجھنا چاہیئے۔ اور بیس محکمے منظم ہو چکے تھے ایک عمانی عرب کو سکرٹری مقرر کیا گیا، جو ٹانگانیکا کی حکومت میں نظم و نسق کا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں کل مالیہ چھ لاکھ تھا۔ دس سال بعد یہ پندرہ لاکھ پہنچ چکا تھا۔ جن غلاموں کی مالک سلطنت تھی، ان سب کو آزاد کیا جا چکا تھا۔ مکلا میں ایک ہسپتال بن گیا جس میں ... عرب ڈاکٹر کام کر رہے تھے انگرامس کی آمد کے وقت پوری سلطنت کے طلبہ کی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی۔ دس سال بعد یہ تعداد ایک ہزار سات سو پہنچ گئی اور مکلا میں ایک سو چالیس لڑکیاں بھی سکول جانے لگی تھیں۔ فوجیوں کے ایک گروہ نے بالغوں کو نوشت و خواند سکھانے کا ذمہ اٹھا لیا۔ یہ ساری ترقیات اس حالت میں ہوئیں کہ جو حضرمی جاوا اور سنگاپور میں تھے۔ ان کی طرف سے روپے کی آمد بند ہو چکی تھی سات سال سے حضرموت میں خشک سالی چلی آ رہی تھی اور ملک میں جتنے اونٹ موجود تھے، ان میں سے نصف کے قریب مر چکے تھے۔

انگریز اس کا عقیدہ تھا کہ نو آبادیوں کے نظم و نسق کے عام طور طریقے، ان لوگوں کو خود مختاری کی تربیت دینے کے لیئے موزوں نہ تھے۔ اس کے نزدیک عرب حکومتوں کے معاملات میں کم سے کم دخل دینا چاہیئے اور امن قائم ہو جائے تو صرف مشورہ دیتے رہنا چاہیئے۔ نیز طبی اور اقتصادی امداد کا انتظام مناسب ہے۔ اس کا تجربہ یہ تھا کہ بہترین نتائج اس صورت میں حاصل ہوتے ہیں جب لوگوں کو ذمہ داری دے دی جائے، اور غیر ملکی مشیر عوام میں رہ کر کام کریں گے تو وہ تمام معاملات کو عوام ہی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیں گے۔

وادی میں تھاعا پانی بہتا ہے، جس سے کھیتی باڑی خوب ہوتی ہے۔ گندم مکئی، باجرا، نیل، تمباکو، تل، کھجوریں، روئی اور ناریل خاص فصلیں ہیں۔ شہد بھی بہ کثرت پیدا ہوتا ہے[1]۔ سالانہ پیداوار ایک لاکھ پونڈ سے کم نہ ہوگی بہترین شہد وادی دعان سے آتا ہے، جو عدن اور یورپ بھیجا جاتا ہے۔ مکلا اور شحر کے درمیان ساحلی علاقے میں نہایت عمدہ تمباکو کاشت کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ حقے میں پیا جاتا تھا، لیکن نوجوان حضرمی امریکی سیگریٹوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تمباکو کے بعض کھیتوں کو کاریزوں کے ذریعے سے پانی دیا جاتا ہے۔ محدود لوبان بھی پیدا ہوتا ہے، جو گذشتہ تین ہزار سال کی طرح اب بھی ہندوستان اور بحیرۂ روم کے حلقے میں بھیجا جاتا ہے۔ حضرموت میں سوتی کپڑا بھی بنا جاتا ہے۔

---

[1] شہد یقیناً بہت اچھا ہوتا ہے اس سے بھی بڑھ کر قابل ذکر امر یہ ہے کہ شہد اچھی حالت میں رکھا جاتا ہے مثلاً راقم الحروف نے ٹین کے گول گول ڈبے دیکھے جن میں چھتے کے گول گول ٹکڑوں کے ساتھ شہد بھرا ہوا تھا اور وہ حد درجہ لذیذ و خوش ذائقہ تھا۔ ڈبے کو جتنی دیر چاہیں بند رکھیں، شہد خراب نہ ہوگا۔

چمڑے بھی رنگے جاتے ہیں - چوتا بھی بنتا ہے - اور نیل بھی تیار ہوتا ہے - ساحل کے مختلف مقامات پر لوگ ماہی گیری کے لیے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی بناتے ہیں -

آبادی مختلف طبقوں میں منقسم ہے - جن میں سے اہم طبقوں کی کیفیت یہ ہے :-

۱- سیّد :- یہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی اولاد ہیں - حضرموت میں ایک بزرگ نویں صدی عیسوی کے آس پاس بصرہ سے آئے تھے، جن کا نام احمد المہاجر تھا - تمام سید اسی بزرگ کی اولاد ہیں جن میں سے آٹھ خاندانوں کو مستند مانا جاتا ہے - لوگ انھیں روحانی پیشوا تسلیم کرتے ہیں - وہ باہر نکلتے ہیں تو نہ کوئی ہتھیار ساتھ لیتے ہیں، نہ محافظ ان کے ہمراہ ہوتے ہیں - جہاں جاتے ہیں، لوگ ان کا انتہائی احترام کرتے ہیں اور کسی کو خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ انہیں آزار پہنچائے - قعیطی خاندان کے حلقے میں سیدوں کا اثر قریباً زائل ہو چکا ہے، البتہ باقی علاقوں میں ان کی سابقہ حیثیت تا حال قائم ہے -

۲- شیخ :- اگرچہ ان کا درجہ سیدوں سے کم تر ہے، لیکن یہ بھی بڑے محترم مانے جاتے ہیں - اور عموماً اچھے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں -

۳- یافعی :- ان کی کیفیت ینی چری لشکر کی سی ہے - ابتدا میں انھیں تنخواہ دار سپاہ کی حیثیت میں بھرتی کیا گیا تھا - اب یہ خاصے اقتدار کے مالک بن گئے ہیں - اور قعیطی حلقے میں حکمرانی کی تمکنت انھیں کو حاصل ہے -

۴- قبائلی :- حضرموت میں تین قبیلے پائے جاتے ہیں، جن میں سے ہر ایک

کا مالک سردار ہے اور ہر قبیلہ مختلف خاندانوں میں بٹا ہوا ہے - یہ خانہ بدوش ہیں اور ملک کے اندر تجارتی مال لانے لے جانے کا سارا کام انھیں کے ہاتھ میں ہے - یہ ہمیشہ مسلح پھرتے ہیں - ان میں خونی بدلے کے سلسلے بھی جاری ہیں - مگر جب کوئی اقرار و عہد کر لیں تو اس سے کبھی منحرف نہیں ہوتے -

۵ - شہری : وادی کے بڑے بڑے شہروں میں جو لوگ آباد ہیں ان میں سے ان اثنی خاندانوں کے اخلاف ہیں جو سید احمد مہاجر کے ساتھ بصرہ سے آئے تھے - ان میں سے بعض تاجر ہیں ، بعض نے صنعت گری اختیار کر لی بعض مزدوری کرتے ہیں - یا گھروں میں نوکری کر لیتے ہیں -

۶ - غلام : حضرموت میں غلام اب بھی موجود ہیں - ان میں سے زیادہ تر حکومت کی ملکیت ہیں اور ان کے ساتھ برتاؤ بہت اچھا ہوتا ہے - بعض اچھے تعلیم یافتہ ہیں اور اہم سرکاری عہدوں پر مامور ہیں -

۷ - اخدام :- یہ لوگ حضرموت میں حقیر درجے کے کام کرتے ہیں - مثلاً جھاڑو دینا یا زراعت میں مدد دینا -

بخورات (عود اور لوبان) کی تجارت میں تنزل پیدا ہوا تو حضرموت کے شہروں کی چہل پہل بھی جاتی رہی - تدریجاً آبی وسائل میں کمی شروع ہوگئی - اس وجہ سے زراعت بھی گھٹ گئی - اچھی بندرگاہیں موجود نہ تھیں ، اس لیے لوگوں میں بحر پیمائی کا شوق بھی پیدا نہ ہو سکا - رفتہ رفتہ ان میں یہ رجحان شروع ہو گیا - کہ شادیاں کرتے ہی بال بچوں کو وطن میں چھوڑ کر مرد دولت کمانے کے لیے باہر نکل جاتے اور پندرہ پندرہ بیس بیس سال باہر گزار کر خاصی بڑی دولت جمع کر

لانے۔ بعض لوگ مشرقی افریقہ یا صومالی لینڈ یا مصر چلے گئے اور تجارت شروع کر دی۔ بعض نے ہندوستان کا راستہ لیا۔ اور حیدر آباد پہنچ گئے جہاں نظام کی فوج میں ملازم ہو گئے[1]۔ سب سے زیادہ دولت ان لوگوں نے فراہم کی جو ملایا یا انڈونیشیا پہنچ گئے تھے۔ وہاں انھوں نے تجارت یا کاروبار شروع کر دیا یا ہوٹل کھول لیے۔ سنگاپور، پینانگ، ملکا وغیرہ کے عربوں میں سے پچانوے فی صد حضرمی حضرموت کے باشندے ہیں۔ سنگاپور میں بعض بازاروں کی تمام دکانیں انھیں کی ہیں۔ انگرامس کے اندازے کے مطابق بیس فی صد سے تیس فی صد تک حضرمی مرد روپیہ پیدا کرنے کی غرض سے باہر چلے جاتے ہیں۔

قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ اگرچہ وہ لوگ بیس بیس سال سے بھی زیادہ مدت باہر گزار دیں، باہر شادیاں بھی کر لیں اور کنبہ دار بھی بن جائیں، لیکن وہ وطن ضرور لوٹتے ہیں۔ جو لوگ زیادہ دولت جمع کر لیتے ہیں، وہ حضرموت پہنچ کر مسجدیں بناتے ہیں، محل تعمیر کرتے ہیں، موسم گرما میں رہنے کے لیے مکان تیار کرتے ہیں اور ایسے مکان دولت سعودیہ کے شہزادوں کے مکان مستثنیٰ کرنے کے بعد کہیں نہیں ملیں گے۔ مقامی جھگڑے بدستور باقی رہتے ہیں۔ ایک کاروباری آدمی کا ذکر ہے کہ ملایا میں اس کے لاکھوں روپے جمع تھے، مگر وہ حضرموت آیا تو ہمسایوں نے اس طرح گولیاں

[1] حیدر آباد میں ایک فوج کا نام میسرم تھا، جو موسیو ریمان کا بگاڑ تھا۔ ریمان وہ فرانسیسی تھا جس نے سب سے پہلے یہ فوج تیار کی۔ اس میں عرب بھرتی ہوتے تھے۔ مختلف جمعداروں کے ماتحت عربوں کی تعداد معین ہوتی تھی اور جمعداروں کو تعداد ہی کے مطابق دو روپے فی کس کے حساب سے تنخواہ ملتی تھی۔ خاص تقریبات پر دوسری افواج کے ساتھ میسرم کی فوج بھی جلوس میں شامل ہوتی تھی۔ ہزاروں عربوں کے لیے یہ روزگار کا اچھا بندوبست تھا۔

چلانے لگا گویا وہ کبھی باہر گیا ہی نہ تھا۔

عالمی جنگوں کے دوران میں حضرموت پر بڑی آفتیں آئیں۔ دوسری جنگ میں فصلوں کو پے در پے نقصان پہنچا۔ شرق الہند سے روپے کی آمد اس لیے بند ہو گئی کہ جاپان ان علاقوں پر قابض ہو گیا تھا۔ پھر اونٹ مرنے لگے۔ اس زمانے میں برطانیہ نے بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے سے غلہ بہم پہنچانے کا انتظام کیا۔ مصری حکومت نے بھی مالی امداد دی تھی، وہ رقم حضرمیوں ہی کو دے دی گئی۔

اگرچہ اونٹ اور گدھے اب بھی تین ہزار سال پرانے تجارتی راستے پر حمل ونقل کا واحد ذریعہ ہیں، مگر اونٹ اب زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ موجودہ صدی کے عشرۂ ثالثہ میں موٹروں کے پرزے اونٹوں پر لاد کر حضرموت پہنچنے لگے تھے اور منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد میکانک انھیں جوڑ لیتے تھے۔ اب شحر سے تریم تک پختہ سڑک بن گئی۔ دوسری جنگ عظیم سے پیشتر فریا سٹارک[1] نے بتایا تھا کہ حضرموت میں اسّی موٹریں ہیں۔ موٹروں کے علاوہ ہوائی جہاز بھی اندرونی ملک میں آنے جانے لگے تھے۔

دورِ حاضر کی ترقیات کا اصل مرکز تریم ہے، جو حضرموت کا روحانی اور ذہنی مرکز ہے۔ یہاں کے سب سے دولت مند خاندان کے افراد کا صدر مقام بھی یہی شہر ہے۔ اس خاندان کی کوششوں سے ٹیلی فون اور ریڈیو کا انتظام ہو گیا ہے۔ بجلی کی روشنی لگ گئی ہے۔ سینما بھی دکھایا جانے لگا ہے۔ بہت سے مکانوں میں نلکے لگ

---

[1] Freya Stark ملے

چکے ہیں۔ دورِ حاضر کے یورپی انداز کی عمارتیں فصیل سے باہر بن رہی ہیں۔ پہلے پانی نکالنے کے لیے اونٹوں، گدھوں اور عورتوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اب ڈیزل یا پٹرول سے سے چلنے والی موٹریں یہ کام انجام دے رہی ہیں۔ سب سے زیادہ دلکش مقام شبام کا بلند حصار ہے۔ شبام[1] کو حضرموت کا نیویارک سمجھنا چاہیئے۔ یہاں چھ سو کے قریب کئی کئی منزل کے مکان ہیں۔ ان میں سے بعض آٹھ آٹھ منزل کے ہیں۔ بعض اصحاب کے نزدیک سیوٗن[1] زیادہ خوبصورت مقام ہے، اس لیے کہ وہ اس حصے میں واقع ہے، جہاں کھجوروں کے جھنڈوں کا سلسلہ چلا جا رہا ہے۔ اس کی آبادی پندرہ ہزار ہے۔ سلطان کا قصر عرب کی جمیل ترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور یہ صنعا کے قصرِ نشاط یا ابن سعود کے قصرِ ریاض سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ حضرموت میں عمارتیں بہت اونچی بناتے ہیں۔ آٹھ یا اس سے بھی زیادہ منزلوں کی عمارتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ انگرامس نے بتایا کہ شہر کی فصیل کے پاس جو عمارت بنائی جائے گی، وہ کم از کم ایک سو پانچ فٹ اونچی ہونی چاہیئے۔ خیال یہی ہے کہ ابتدائی حضرمی بابل سے آئے تھے۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آج کل حضرموت میں جو فنِ تعمیر رائج ہے، وہ بابل کے کھنڈروں سے بہت ملتا جلتا ہے۔

حضرموت میں مکانوں کی پہلی منزل مال گودام کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ دوسری غلاموں اور ملازموں کے لیے۔ تیسری مہمانوں کے لیے۔ اوپر کی منزلیں سات ہوں یا آٹھ اہل خانہ استعمال کرتے ہیں۔ بیرونِ مکان کی سفیدی دیکھ کر

---

[1] تریم حضرموت کی شمالی سرحد پر پہاڑوں میں واقع ہے۔ اس کے مغرب میں تھوڑے فاصلے پر شبام ہے۔ تریم سے تھوڑی دور جنوب میں سیوٗن ہے۔ تریم و شبام وادی حضرموت کے کنارے واقع ہیں۔ غالباً تریم ہی میں حضرت ہودؑ کی قبر بتائی جاتی ہے۔

مالک کی دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ تر عمارتیں کچی اینٹوں کی ہوتی ہیں۔ اور ان پر لکڑی کی چھت ڈال لی جاتی ہے۔ سیمنٹ ترمیم ہیں ابھی پہنچنے لگا ہے۔ شیشہ بالکل ناپید ہے۔ دروازوں کی کنجیاں لکڑی کی ہوتی ہیں۔ شہروں کے بازار معمولی ہیں۔ پھیری والے زیادہ سودا بیچتے ہیں۔ وہ امیروں کے گھروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ دکانوں پر عموماً چینی، سونٹھ، قہوہ، چاول، نمک، کھجور کے پتوں کی چٹائیاں اور ٹوکریاں ملتی ہیں۔ سکہ عام طور پر میریا تھریسا کا رائج ہے جسے ٹالر[1] کہتے ہیں۔ سنہ ۱۷۸۰ء کا سکہ عام طور پر اچھا سمجھا جاتا ہے، باقی گھٹیا درجے کے شمار ہوتے ہیں۔

مختلف بولیاں رائج ہیں۔ ان میں ایک بولی مہری بھی ہے۔ جو جنوبی عرب کی قدیم بولی مانی جاتی ہے۔ حضرموت اور ملایا، مشرقی افریقہ کے بعض حصوں اور ہندوستان سے تعلقات کی ایک شہادت یہ بھی ہے کہ تجارتی حلقوں میں ان حصوں کی زبانیں بے تکلف استعمال ہوتی ہیں۔ حضرموت کی تاریخ اور آثار قدیمہ کے سلسلے میں ابھی بہت کام باقی ہے۔ گلیاں گندی ہیں، شہروں سے باہر نکل جاؤ تو ہر مقام حد درجہ صاف اور پاکیزہ نظر آئے گا۔ پلیٹوں اور گلاسوں کو بار بار لوبان کی خوشبو دی جاتی ہے۔ صابن کو اہل حضرموت خطرناک سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس سے بیماری پیدا ہوتی ہے۔ نیز جلد کو نقصان پہنچتا ہے۔

طبی انتظامات بہت قدیم زمانے کے ہیں۔ مرد طبیب ہوں یا عورتیں

---

[1] ٹالر ایک سکہ تھا جو آسٹریا اور جرمنی میں رائج تھا۔ جس ٹالر پر میریا تھریسا ملکۂ آسٹریا کی تصویر منقش تھی۔ وہ عرب میں زمانہ حال تک رائج رہا۔ انگریزی میں اسے Thalers کہتے ہیں۔

وہ بیمار کے بالوں کو سونگھ کر بیماری کی تشخیص کرتے ہیں۔ زخموں کا علاج کرنا ہو تو پہلے نتھنے بند کر لیتے ہیں اس لئے کہ حضرمیوں کا خیال ہے زخموں کی بدبو نقصان رساں ہے۔ پھر زخم پر لوہے یا ٹین یا تانبے یا پیسے کا پترا باندھ دیا جاتا ہے۔ لوہا گرم کر کے داغ دینا ہیٹر یا اور اس قسم کی دوسری بیماریوں کا عام علاج ہے۔ اب تریم میں نئے طریق علاج پہنچ گئے ہیں۔

لڑکیوں کو نو سال کی عمر کے بعد تعلیم نہیں دی جاتی۔ فریا سٹارک نے ایک خاتون کو دیکھا تھا، جو بیوہ ہو چکی تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ گفتگو کے دوران میں احادیث، آیات اور شعر بھی نقل کرتی تھی۔ وہ خود شاعرہ تھی۔ اور کھلے مقابلے میں ایک مرتبہ چائے کا سٹ انعام میں حاصل کیا تھا۔ اس کے پاس ہر روز عورتیں جمع ہوتی تھیں۔ قرآن اور بخاری، مسلم یا حدیث کی ایک دو اور کتابیں سنتی تھیں۔

اونچے طبقے کی عورتوں کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہو جاتی ہے۔ ساحلی علاقے کی عورتیں گہرا نیلا یا سیاہ لباس پہنتی ہیں۔ شبام اور سیوون میں آسمانی رنگ کا لباس پہنا جاتا ہے۔ تریم کی عورتوں میں بادامی یا سرخ رنگ رائج ہے۔ لباس پر چاندی کے سکے لگا لیے جاتے ہیں اور جواہرات سے بھی اسے مزین کیا جاتا ہے۔ دلھن کو عموماً معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس کی شادی کب ہو گی۔ جب اس کے بال دھوئے جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے۔ چہرے پر زرد رنگ لگا دیا جاتا ہے۔ وسیع دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تیسرے روز دلھن سرخ پردے کے پیچھے بیٹھتی ہے جسے اس کا شوہر اٹھاتا ہے۔ شادی کے بعد پہلی صبح کو شوہر تکیے پر دس ٹالر رکھ جاتا ہے۔

دوسری صبح کو بہت سے رومال، دس ٹالرکپڑے، عطراور لوبان رکھ دیتا ہے۔ دلہن چالیس روز تک شادی کے جوڑے پہنے رہتی ہے۔ اور اس کی والدہ شادی کے بعد دو ہفتے اس کے پاس ٹھہرتی ہے۔

حضرموت کے سلسلے میں صدور جہ اہم اس زمانے کی تاریخ ہے جب یہ علاقہ بخورات (عود و لوبان) کی پیداوار کا مرکز تھا حضرموت اور ظفار ہی کل سطح مرتفع اور پہاڑ وہ مقام تھے جنھیں بطلیموس نے مراتھا[1] کہا اور پلینی نے مونس ایکسلسس[2] کہہ کر اس کی طرف اشارہ کیا اور اسے جنوبی عرب کا عود و لوبان والا ملک قرار دیا۔ مصر نے بھی عود لوبان کے لیئے ایک مہم حضرموت بھیجی تھی۔ یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار آٹھ سو سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد تین ہزار سال تک تجارت کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔ پلینی اس تجارت کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔

بخورات جمع کر کے اونٹوں پر لادے اور سبوتا[3] (شبوہ) لائے جاتے ہیں۔ اس شہر کا صرف ایک دروازہ کھلا رہتا ہے جس سے اونٹ داخل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص بخور لاتا ہوا راستے سے ادھر اُدھر ہو جائے تو اس کے لیے موت کی سزا مقرر ہے۔ یہاں پروہت تول کر نہیں، بلکہ پیمانے سے ناپ کر اپنے دیوتا کے لیئے عشر (دسواں حصہ) لے لیتے ہیں۔ اس دیوتا کا نام سبیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پروہت جب تک دسواں حصہ نہ لے لیں، بخورات بیچے نہیں جا سکتے۔ اسی دسویں حصے میں

(i) Maratha (ii) Mons Excelsis (iii) Sobota

سے مصارف عامہ پورے ہوتے ہیں اس لیے کہ ہمارے دیوتانے دور دور سے آنے والے اجنبیوں کی خاطر داری کے لیے بڑا عمدہ انتظام کر رکھا ہے۔ بخورات جیانی تائیں میں سے گزارے بغیر باہر نہیں بھیجے جا سکتے۔ اس وجہ سے بادشاہ کو بھی محصول دینا پڑتا ہے۔۔۔ پوری تجارت کی حیثیت ایک وسیع کارخانے کی ہے۔ جسے بڑے اہتمام سے چلایا جاتا ہے۔۔۔ بخورات کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو بادشاہ اور پروہتوں کے سکٹریوں کو دینا پڑتا ہے، ایک حصہ محافظ اور سپاہی بھی لے جاتے ہیں پھر راستے میں کہیں پانی، کہیں چارے، کہیں قیام کا خرچ برداشت کیے بغیر چارہ نہیں اور جگہ جگہ ٹیکس بھی دینے پڑتے ہیں۔ ان مصارف کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سمندر (بحیرۂ روم) کے کنارے تک پہنچتے پہنچتے ایک اونٹ کا خرچ چھ سو اٹھاسی دینار ہو جاتا ہے۔

پلینی نے یہ بھی بتایا ہے کہ بخورات کی فراہمی کو ایک مذہبی رسم سمجھ کر ادا کیا جاتا ہے۔ ان کے درختوں کے مالک تین ہزار خاندان ہیں۔ صرف سبائی اور معینی ہی دیکھ سکتے ہیں کہ بخورات کیوں کر درختوں سے نکالے جاتے ہیں۔ سٹرابو نے بخورات کی تجارت کے متعلق سبائیوں کا طریق عمل بھی بتایا ہے۔ معینی وہ بخورات لے کر اپنے ان ہمسایوں کے حوالے کر دیتے تھے، جو مکہ کے آس پاس مقیم تھے۔ اسی طرح یہ سلسلہ شام و عراق تک جاری تھا۔ اور جب ان پر بخورات کی خوشبو سے غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ تو لوگ وال

لے (i) Gebanitae (ii) Strabo.

یا کاسنی یا ایک اور پودے کو سونگھ کر غنودگی دور کرتے تھے۔

نینوا کے پرانے مندروں کا سنگ مرمر دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ سورج دیوتا اور اس کی بیوی کی پوجا کے وقت بخورات کس کثرت سے سلگائے جاتے تھے۔ اشوری بادشاہ حکمران بھی تھے اور مذہبی پیشوا بھی۔ ان کی قائم کردہ یادگاروں یا عمارتوں پر جو نقش و نگار کندہ ہیں، ان میں بادشاہوں کو بخورات سلگاتے یا نخل حیات پر شراب لنڈھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

ہیروڈوٹس[1] کے بیان کے مطابق بابل کے مندر کی بڑی قربان گاہ پر بعل کا جشن منانے کے دوران میں ایک ہزار ٹیلنٹ[2] وزن کے بخورات سلگائے جاتے تھے۔ پرسی پولس کی یادگاروں اور ساسانیوں کے سکوں سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم ایران میں بھی بابل اور اشوریا کی طرح بخورات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ہیروڈوٹس نے لکھا ہے کہ عرب دارا کے لیے ایک ہزار ٹیلنٹ بخورات بہ طور خراج لائے تھے۔ پھر ہندوستان میں پارسیوں کے ہاں اب یہ رسم جاری ہے۔

رومیوں میں بھی بخورات کا رواج تھا۔ عود، لوبان وغیرہ بخورات میں ایک وہ چیز بھی تھی جسے بالچھڑ کہتے ہیں۔ جب خشکی کے راستے بخورات کا بھی جانا بند ہو گیا تو اس کی برآمد قانہ کی بندرگاہ سے جہازوں میں ہونے لگی۔ مارکوپولو بتاتا ہے کہ شحر[3] کی بندرگاہ میں بخورات پر مقامی حکمران اٹھ سو فی

---

[1] Herodotus [2] ٹیلنٹ کے وزن مختلف تھے۔ عام طور پر یہ پچانوے پونڈ کا ہوتا تھا۔ یونانی ٹیلنٹ کا وزن بیاسی پونڈ کے قریب تھا۔ بیاسی پونڈ قریباً ایک من ہوتا ہے [3] شحر حضرموت کی مشہور بندرگاہ ہے جسے پیشتر بہت شہرت حاصل تھی۔ یہ مکلا سے شرقی جانب تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔

صد تقفح لیتا تھا - قرون متوسط میں قبیلوں کے درمیان لڑائیاں شروع ہوگئیں تو بخورات کے بہت سے درخت تباہ ہو گئے۔

کچھ درخت اب بھی موجود ہیں۔ اور ان سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان اور بحیرۂ روم بھیجا جاتا ہے، لیکن آج کل درختوں کی دیکھ بھال پوری طرح نہیں کی جاتی - بہترین بخورات ظفار میں پیدا ہوتے ہیں - ان کی قیمت کا اندازہ رنگ، صفائی اور گولے[1] کے وزن سے کیا جاتا ہے۔ اور ایک ٹن کی قیمت چالیس ڈالر سے تین سو بیس ڈالر تک ہوتی ہے۔

ظفار اور حضرموت کے بخورات پیدا کرنے والے حلقوں کی چھان بین نہیں کی گئی - البتہ ۱۹۱۶ء میں میجر ٹی التونیان[2] نے کچھ حصہ دیکھا تھا - وہ مکلا سے چلا تو موٹر اور اونٹ پر سیحوت پہنچا، جو مہرہ کے حلقے کا نہایت اہم مقام ہے اور وہاں کی آبادی تین ہزار ہے - وہاں سے قشن[3] گیا، جو ساحل بحر پر ایک خوبصورت خلیج کے کنارے واقع ہے - قشن کا سلطان ہی سقوطرہ کا بھی سلطان ہے - ۱۹۵۳ء میں سلطان خلیفہ احمد کی وفات ہوئی اور اس کے چچیرے بھائی نے انتظامی کاروبار سنبھال لیا - وہ بڑی سادہ زندگی بسر کرتا ہے ننگے پاؤں چلنے میں بھی اسے عار نہیں - اپنی بندوق کو خود اٹھاتا ہے

قشن سے التونیاں آگے بڑھا اور مغرب کی طرف مڑ گیا - پھر پہاڑوں

---

[1] بخورات کے بڑے بڑے گولے بنا لیے جاتے ہیں - گولا جتنا بڑا ہو، اتنی ہی اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے - علاوہ بریں قیمت کے سلسلے میں رنگ اور صفائی کا بھی خیال رکھا جاتا ہے

[2] Major T. Altounyan [3] قشن - مہرہ کی بندرگاہ ہے جو ظفار اور حضرموت کے درمیان واقع ہے - سیحوت وادی سیلہ کے دہانے سے قریب ساحل بحر پر ہے اور غالباً یہیں مہرہ کی مغربی سرحد ہے

اور وادیوں کو قطع کرتا ہوا دو سو ساٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے تریم کے قریب جا نکلا

حضر موت کا ماضی بڑا شاندار تھا۔ مورخوں اور ماہرین آثار قدیمہ کا فرض ہے کہ اس کے چہرے سے گمنامی کا پردہ اٹھائیں۔ وہاں باہر سے روپیہ آرہا ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ تیل یا دوسری قیمتی دھاتیں مل جائیں اور بعض آدمی دور حاضر کی روح سے بھی معمور ہیں، اس لیے امید ہے کہ آیندہ نسل حضر موت کے چہرے سے قرون وسطیٰ کا پردہ اٹھا دے گی۔
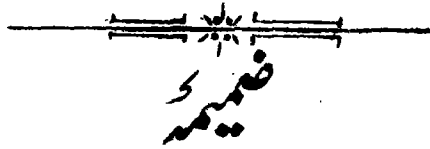
ضمیمہ

مشرقی اور مغربی امارتوں کے وفاق ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۵ء میں بن گئے۔ مغربی امارتوں کی تعداد اٹھارہ ہے اور مشرقی امارتوں کی تعداد غالباً آٹھ ہے۔ یعنی حضر موت (سلطنت شحر و مکلا) تیری، اہرہ، الواحدی (میفع علی)، الواحدی (بلحاف)، قشن و سقوطرہ، مرقا، حورا، دونوں کی انتظامی کونسلیں بنا دی گئی ہیں اور ہائی کمشنر کی صدارت میں یہ کونسلیں کام کرتی ہیں۔ مشرقی امارتوں کا مرکز مکلا ہے مشرقی امارتوں میں سے بعض میں کونسلیں بن گئی ہیں۔

سترھواں باب

سرزمین امام

انجمن اقوام متحدہ کے ممبر ملکوں میں سے یمن سب سے کم معروف ہے۔ آپ راہ چلتے دس آدمیوں سے پوچھیں کہ تبت کا مرکز حکومت کیا ہے؟ تو پانچ ضرور بتا دیں گے کہ لہاسا ہے، لیکن اگر آپ یہی سوال یمن کے مرکز حکومت کے بارے میں کریں گے تو اکثر اُلٹا پوچھیں گے کہ یمن کہاں ہے؟ اس بے خبری پر زیادہ حیرت اس لیے ہوتی ہے کہ تبت تو ہندوستان کے عقب میں پہاڑوں کے اندر مستور ہے اور یمن کی سرحد بحیرہ قلزم کے جنوبی و مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ تین سو میل سے زیادہ فاصلے تک چلی گئی ہے۔ یہ اریٹریا کے بالکل سامنے واقع ہے اور اس کا سابقہ دارالحکومت صنعا، ہوائی جہاز میں ساحل سے صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ علاوہ بریں یمن نجد اور لیبیا کی طرح ریگستان نہیں۔ دولت سعودیہ کا رقبہ لاکھ ستائیس ہزار مربع میل ہے اور آبادی صرف چھپن لاکھ ہے لیکن اس کے برعکس پہاڑی مگر زرخیز یمن کا رقبہ چوہتر ہزار میل سے زیادہ نہیں۔ تاہم اس کی آبادی

چالیس لاکھ ہے۔

یمن کے بارے میں بے خبری کی ایک وجہ ملک کی جغرافیائی حیثیت بھی ہے۔ بحیرۂ قلزم کے ساحل کے ساتھ ساتھ پانی زیادہ گہرا نہیں۔ نیز وہاں زیر آب چٹانوں کا ایک خطرناک سلسلہ چلا جا رہا ہے۔ یمن کی سب سے مشہور بندرگاہ مخا ہے، جو باب المندب سے پچھتر میل شمال میں ہے۔ جنوبی یمن میں جو اعلیٰ درجے کا قہوہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ سالہا سال تک مخا کی بندرگاہ سے بیرونی دنیا میں پہنچتا رہا۔ اس وجہ سے قہوہ کا نام ہی "مخا" مشہور ہو گیا۔ اب یہ تجارت حدیدہ اور عدن کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ مخا کے اکثر مکان گر گئے ہیں اور گودی میں مٹی بھر گئی ہے۔ یمن کی باقی دو بندرگاہیں حدیدہ اور لحیہ کے ساحل کے ساتھ ساتھ سنگریزوں کا فرش بچھا ہوا ہے اور زیر آب چٹانیں ان کی حفاظت کر رہی ہیں۔

خشکی میں ساحل کے ساتھ ساتھ ریت کی ایک پٹی چلی جا رہی ہے، جو گرم بھی ہے اور اس میں موسمی بخار کے جراثیم بھی زیادہ ہیں۔ اسے تہامہ[1] کہتے ہیں۔ یہ ساحل سے اندر کی طرف کم از کم بیس اور زیادہ سے زیادہ پچاس میل پھیلی ہوئی ہے۔ پھر پہاڑ شروع ہو جاتے ہیں۔ سلسلے کے بعد سلسلہ چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ بلندی دس ہزار فٹ تک پہنچ جاتی ہے اور ان سے گزرنے کا ہر درہ کم سے کم سات ہزار فٹ

---

[1] تہامہ نشیبی زمین کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ساحلی پٹی اندرون ملک کے پہاڑوں کے مقابلے میں نشیب میں واقع ہے، اس لیے تہامہ نام پایا۔

کی بلندی پر ہے۔ ان پہاڑوں کی مشرقی جانب شمالاً جنوباً دو سو میل ایک وادی چلی گئی ہے جس کی چوڑائی کہیں دس میل ہے اور کہیں چالیس میل۔ اس کے دونوں سروں پر پہاڑوں کے نیاد کھڑے ہیں۔ اس وادی کے مشرق میں پھر بلند پہاڑ شروع ہو جاتے ہیں جن کی بلندی مشرقی جانب کم ہوتے ہوتے ربع الخالی میں گم ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ملک میں جانا سہل نہیں اور نہ بغیر مشقت اٹھائے اس کے اندر پھرا جا سکتا ہے، اس لیے کہ نہ وہاں ریل ہے، نہ اچھی سڑکیں ہیں۔ صرف پیچ وخم کھاتے ہوئے راستوں میں سے گزرنا پڑتا ہے، جہاں بندوقچی جب چاہیں بآسانی راستہ روک سکتے ہیں۔

بے خبری کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جو لوگ بڑی اور اونچی وادی میں یا دوسری چھوٹی چھوٹی وادیوں میں رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جزیرۃ العرب کے حد درجہ خوشگوار حصوں پر ان کا قبضہ ہے۔ وہ بڑے مضبوط و توانا اور مستعد و چست ہیں۔ خنجر چلانے کے ماہر، بندوق کے نشانے میں طاق ہیں اور اجنبیوں کو اپنے ملک میں داخلے سے روکنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔
غرض سرزمین کی دشوار گزاری اور باشندوں کی عصبیت کے باعث امام یا فرمانروا ملک کی منظوری کے بغیر سفر غیر ممکن تھا۔ اور چونکہ یمن پر بار بار حملے ہوتے رہے، اس لیے فرمانرواؤں نے الگ تھلگ ہی رہنا بہتر سمجھا۔

جب عرب کی تپتی ہوئی ریت سے قدامت کا پردہ اٹھا تو یہ سرزمین (عرب) مشرق و مغرب کے درمیان ایک برزخ کا کام دے رہی تھی۔ مصر، بابل اور نینوا کے مندروں اور معبدوں کو بخورات کی ضرورت تھی۔ یہ ایسی جنس تھی، جس کا ایک

حصہ ان درختوں سے حاصل ہوتا تھا۔ جو جنوبی عرب کے پہاڑوں پر اگتے تھے۔ مصر کی پرانی دستاویزوں میں دو ہزار آٹھ سو سال قبل مسیح بخورات کے لیے سفروں کی کیفیت درج ہے۔ کوئی ۱۰۰۰ ق م میں عرب کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ ان پراسرار پہاڑوں تک شاہراہ تجارت بن گئی۔ ہندوستان کے تاجروں نے بھی ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ کی طرف بڑھتے بڑھتے جنوبی عرب میں بخورات کے خطے تک کا راستہ دریافت کر لیا۔ یقین ہے کہ ابتدا میں ان حریف گروہوں کے درمیان لڑائیاں ہوئی ہوں گی۔ پھر ان پر آشکارا ہو گیا کہ ہر ایک کے پاس ایسی چیزیں موجود ہیں جنھیں دوسرے استعمال کر سکتے ہیں۔

بحیرۂ روم کے شہروں کو بخورات کے علاوہ ہندوستان سے دار چینی اور سیاہ مرچ، خلیج فارس سے موتیوں اور چین سے ریشم، رنگوں اور روغنیات کی ضرورت تھی۔ نیز قدیم زمانے کے لوگ بہ کثرت گوشت کھاتے تھے۔ اس عہد میں گوشت کو محفوظ رکھنے کے لیے ریفریجریٹر (تبرید یعنی ٹھنڈا رکھنے والی مشین) تو موجود نہ تھے، لہذا انھیں جزائر شرق الہند کے مسالوں کی ضرورت پیش آئی۔ ہندوستان اور چین کو روم سے سونا، دھات کی بنی ہوئی چیزیں اور چمڑے مطلوب تھے۔ اسی طرح مشرق و مغرب دونوں تیار تھے کہ افریقہ سے غلام، ہاتھی دانت، شتر مرغ کے پر اور بید زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خرید لیں۔ چنانچہ ان جنسوں کی تجارت خوب فروغ پذیر ہوئی۔ بحیرۂ قلزم اس زمانے میں بحری قزاقوں سے پٹا پڑا تھا اور یہ جنسیں جہازوں میں بھیجی نہ جا سکتی تھیں۔ اس لیے اندرون ملک میں ایک تجارتی شاہراہ وجود

ہو گئی - یہ شاہراہ مکلا اور عدن کی بندرگاہوں سے شروع ہو کر یمنی پہاڑوں کے مشرقی ڈھلانوں کے پاس سے نجران، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہوتی ہوئی جاتی تھی[1]۔

اس شاہراہ پر مشرقی یمن کے باشندے نہایت سرگرم اور مستعد تاجر تھے۔ قیاس یہ ہے کہ ابتدا میں انھوں نے قزاقی شروع کی - جو قافلے ان کے پاس سے گزرتے انہیں لوٹ لیتے۔ پھر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہر قافلے سے گزر کا محصول وصول کریں۔ آخر میں وہ اپنے قافلے تیار کر کے بھیجنے لگے اور دوسروں کے محاصل سے محفوظ رہنے کا بندوبست بھی انھوں نے کر لیا۔ اس غرض سے انھوں نے شاہراہ کی درستی کا انتظام کیا۔ اس پر جابجا قلعے بنائے۔ قافلوں کے لیے پڑاؤ تیار کیے۔ پانی کا بندوبست کیا۔ یہاں تک کہ مسیح علیہ السلام سے نو سو سال پیشتر یمن کے باشندے بحیرۂ روم کی دنیا نیز افریقہ، ہندوستان اور چین کی ایک نہایت اہم شاہراہ کے اجارہ دار بن گئے۔ اسی اجارہ داری کی بدولت مشرقی یمن کی باہم لڑنے بھڑنے والی آبادیوں میں پانچ دولت مند اور طاقتور حکومتیں قائم ہو گئیں۔

ان میں سب سے پہلی سلطنت معین کی تھی۔ جو اس نام کی سلطنت کا

---

[1] واضح رہے کہ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس وقت مدینہ منورہ موجود ہی نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ آبادی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد قائم ہوئی۔ پھر مدینہ بہت بڑا شہر بن گیا۔ قدیم زمانے میں یہ مقام یثرب کے نام سے مشہور تھا جو وہاں کی متفرق بستیوں کا صدر مقام تھا۔

کا دارالحکومت تھا[1]۔ یہ سلطنت ۹۵۰ ق،م سے ۶۵۰ ق،م تک رہی اور یہ اس حصے میں واقع تھی، جہاں یمن کے شمالی و مشرقی پہاڑ پست ہوتے ہوتے ربع الخالی پہنچ کر ناپید ہو جاتے ہیں۔ اپنے دورِ عروج میں سلطنت معین جنوبی عرب کے بڑے حصے پر قابض تھی۔ بہت سے کھنڈر اور کتبے دریافت ہوئے ہیں۔ اور ان سے اب تک چھبیس حکمرانوں کے نام معلوم کیے جا چکے ہیں۔ کتبوں اور کھنڈروں سے معلوم ہوتا ہے کہ معین بہت بڑا شہر تھا اور خاصا خوشحال تھا۔ اسی زمانے کا ایک شہر تمنا تھا جو سلطنت قتبان کا دارالحکومت تھا۔ یہ سلطنت عدن کے پاس کی زیرِ حمایت مغربی امارتوں کے شمالی و مشرقی گوشے میں واقع تھی۔ حال ہی میں برطانیہ کے ناظم آثار قدیمہ نے وادی بیحان میں تمنا کے کھنڈر دریافت کیے ہیں۔ رابرٹ فیرس[2] نے (جو عدن میں امریکہ کی طرف سے نائب قونصل تھا) جون ۱۹۴۹ء میں یہ کھنڈر دیکھے تھے۔ وہ لکھتا ہے:

صحرا کی ریت آہستہ آہستہ کھنڈروں پر چھائے جا رہی ہے، لیکن وسطی حصے کے مکانوں اور بڑی بڑی عمارتوں کا پتا لگا لینا ہرگز مشکل نہیں۔ جگہ جگہ بہت سے رنگوں کے ترشے ہوئے پتھر ملتے ہیں۔ جنھیں خوب جلا دے دی

---

[1] بلاشبہ معین قصبے کا نام تھا۔ قوم کا کوئی نام تھا یا نہیں گیا ہمارے محققین نے قوم کو "معاونیہ" قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو "ارض القرآن" جلد اول) آبادی کا جوف یمن میں تھی اور بعض نے اس کے دارالحکومت کا نام "قرن" بتایا ہے، جو اب بھی عدن پروٹیکٹوریٹ کے شمال میں اور مارب کے جنوب مائل بہ مشرق میں موجود ہے۔

[2] Robert Ferris

گئی تھی۔ عرب ان پتھروں کو اُٹھا اُٹھا کر استعمال کرتے لگے تھے سا نگر نیٹل نے
انھیں روک دیا تاکہ وہاں مہم بھیج کر کھدائی کرائی جا سکے۔ شہر کے وسطی چوک میں
ایک سنگی مینار کھڑا ہے۔ جس پر اوپر سے نیچے تک عبارتیں کندہ ہیں۔ اب
ریت نے اسے قریب قریب ڈھانپ لیا ہے۔ ایک مرتبہ ریت پندرہ فٹ
کی گہرائی تک ہٹائی گئی تھی اور اس گہرائی میں بھی مینار کے نیچے کا حصہ
نہیں ملا تھا۔ پرانے مندر کی ایک طرف کی دیوار اور سامنے کا ڈھلوان چبوترہ
اب تک موجود ہے۔ ان میں بڑے بڑے تراشے ہوئے پتھر استعمال کیے
گئے ہیں۔

اس کے بعد حضر موت کی سلطنت نے فروغ حاصل کیا۔ اس کا دارالحکومت
شبوہ تھا۔ جہاں بخورات جمع ہوتے تھے۔ اس شہر کا محل و مقام معلوم تھا۔
مگر فلبی کے سوا بہت کم فرنگیوں نے بہ امعان نظر اسے دیکھا۔

اہل حبشہ کا دعویٰ ہے کہ ملکہ سبا ایک حبشی شہزادی تھی۔ دوسرے لوگ
جن میں فلبی بھی شامل ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق شمالی عرب سے تھا۔ لیکن
یہ یقین کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ یا تو وہ سبا کے قدیم شہر سے تھی
یا شبوہ سے جو حضر موت میں واقع ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے
زمانے میں سونے، ریشم، بخورات، مسالوں اور سبا و شبوہ کی دوسری
چیزوں کی ... سخت ضرورت تھی اور کچھ تعجب کی بات
نہیں کہ ملکہ نے شمال کا سفر کیا ہو تاکہ تجارت کی نئی منڈی کا معائنہ کر لے اور
دنیا کے دانشمند ترین فرد (حضرت سلیمانؑ) سے مل لے۔ مشہور ہے کہ ملکہ

کا شوہر مر چکا تھا۔ اور کاہنوں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر بیٹا نہ ہوا تو وہ ماری جائے گی۔[1] اس لیئے ملکہ نے حضرت سلیمانؑ سے مشورہ ضروری سمجھا۔

۱۵۰ سنہ ق م کے آس پاس معین، تمنا اور شبوہ کی عظمت ماند پڑ گئی اور شہر مارب نے فروغ حاصل کر لیا جو سلطنت سبا[2] کا صدر مقام تھا۔ اور تمنا سے قریباً پچاس میل شمال میں بخورات کی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ جو چند فرنگی مارب جا چکے ہیں، وہ بتاتے ہیں۔ کہ وہاں بڑے بڑے مندروں، سرکاری عمارتوں، دیواروں اور دروازوں کے کھنڈر موجود ہیں۔ مارب نے خاص شہرت بندوں کی وجہ سے حاصل کی۔ یہ بند بنا کر اہل مارب نے یمن کے پہاڑوں سے آنے والا پانی روک لیا تھا۔ سب سے بڑا بند خود مارب میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک میل لمبا اور پچاس فٹ بلند تھا۔ اور سنہ ۵ ق م میں بنا تھا۔ اس کے کھنڈر اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور زمانہ قدیم کے مہندسی منصوبوں کی یہ ایک نہایت مفید شہادت ہیں۔

---

[1] بظاہر مطلب یہ ہے کہ ملکہ سبا کا پہلا شوہر فوت ہو چکا تھا، اکابر و امرا نے مشورہ دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے تاکہ اس کے اولاد پیدا ہو جو وارث تخت بنے۔ اگر یہ نہ ہوا تو وہ ماری جائے گی۔

[2] سبا کے متعلق دو تحقیقیں ہیں۔ اول یہ کہ یہ سبی لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی غلام بنانے کے ہیں۔ چونکہ اس قوم کا جد اعلیٰ عبد شمس بہت بڑا فاتح تھا اور اس نے بہت سے لوگوں کو غلام بنا لیا تھا، اس لیے اس کا لقب "سبا" پڑ گیا۔ دوسری تحقیق یہ ہے کہ سبا کا مادہ تجارتی سفر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ یہ قوم تاجر تھی۔ اس لیے سبا کے لقب سے مشہور ہوئی۔

شہر سبا نے ۶۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک عروج پر رہا۔ اس نے تجارت، خوشحالی اور ثقافت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا۔ پانسو سال تک یہ شہر دنیا کی بہت بڑی شاہراہ پر قابض رہا، اور اس کے باشندے اونٹوں کی باربرداری سے دولت مند بنے۔ جو شرق و غرب میں جاتے تھے۔ اس کے بعد طاقت و قوت کا مرکز پھر ایک مرتبہ بدل گیا اور زمین کی سطح مرتفع کے شہر ظفار[۱] کو اہمیت حاصل ہوگئی، جو موجودہ شہر یریم[۲] کے قریب واقع تھا۔ جنوبی عرب کی یہ پانچویں سلطنت حمیر کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کے وقت یہ انتہائی عروج پر پہنچی ہوئی تھی، اور شمال و جنوب میں شاہراہ تجارت کے ساتھ سیکڑوں میل کا علاقہ اس کے زیر حکم تھا۔ ساتھ ہی مشرقی سمت میں اس کا دائرہ حکومت حضر موت کے ساتھ ساتھ خلیج فارس تک پہنچ گیا تھا۔ اس زمانے میں یمن "قلعوں کی سرزمین" کہلاتا تھا۔ ان قلعوں میں سے مشہور ترین قلعہ صنعا کا غمدان تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سنگ سرخ، سنگ سماق اور سنگ مرمر سے تعمیر ہوا تھا۔ چھت سفید شفاف پتھر کی ڈالی گئی تھی اور اس میں سے اڑتے ہوئے جانور پہچانے جا سکتے تھے۔ اس کی چار بیرونی دیواروں میں سے ہر ایک کا رنگ مختلف تھا[۳] اور چاروں کونوں پر دھات کے چار شیر نصب

---

[۱] واضح رہے کہ یہ ظفار، اس نام کے عمانی صوبے سے بالکل مختلف اور بہت دور واقع تھا۔ نیز یہ شہر کا نام تھا صوبے کا نام نہ تھا۔ [۲] یریم جنوبی یمن میں اس راستے پر واقع ہے جو عدن سے صنعا جاتا ہے۔ ذمار سے کسی قدر جنوب میں ہے۔ [۳] کہا جاتا ہے کہ ایک کا رنگ سرخ تھا، دوسری کا سبز، تیسری کا سفید اور چوتھی کا زرد۔ خود قصر بیست منزلہ تھا۔

گرے رکھے تھے۔ ہوا چلتی تو وہ دھاڑنے لگتے۔ عرب مورخ الہمدانی اس عمارت کے متعلق لکھتا ہے کہ بادلوں نے اس کے سر پر دستار باندھ رکھی تھی، اور اس کا کمر بند سنگ مرمر کا تھا۔

حمیری سلطنت کے متعلق جو معلومات اب تک حاصل ہوئی ہیں، انھیں سامنے رکھ کر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ جاگیرداروں کی حکومت تھی۔ تمام امرا قلعوں میں رہتے تھے اور دہقانوں پر حکم چلاتے تھے، لیکن موجودہ یمن کی دولت و ثروت ظفار کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس لیے کہ ظفار کو مشرق و مغرب کی تجارت کے بڑے بڑے راستوں کی اجارہ داری حاصل تھی۔

جنوبی عرب کے باشندوں کا ان شاہراہوں پر جو اقتدار ایک ہزار سال تک حاصل رہا، وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور سے تھوڑی دیر پہلے کمزور پڑ گیا۔ جب پہلی صدی قبل مسیح میں رومیوں کے بیڑے نے بحیرۂ قلزم کے چکر لگانا شروع کیے اور بحری قزاقوں کا خاتمہ کر دیا، معاً ہی حالات منقلب ہو گئے۔ یمن کے تاجر بخورات نیز افریقہ، ہندوستان اور مشرق بعید کی چیزوں پر جو بے اندازہ نفع کماتے تھے، انھیں رومی برداشت نہ کر سکے۔ بحیرۂ قلزم کے جغرافیائی حالات سے آگاہ ہو چکنے کے بعد انھوں نے عرب میں ایک مہم بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ اہل یمن کے اجارے کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲۴ سنہ ق م میں رومی جرنیل آئی لس گیلس کی سرکردگی میں دس ہزار فوج مصر سے بحیرۂ قلزم کو عبور کر کے ینبوع کی پرانی بندرگاہ کے شمال میں اتری، اور شاہراہ تجارت پر یمن کی جانب روانہ ہوئی۔ یہ تربیت یافتہ لشکر چھ ماہ تک صحرائی اور پہاڑی

علاقے میں پیش قدمی کرتے رہے۔ قبائل ان پر چھاپے مارتے رہتے۔ پانی اور خوراک کی کمی نے بھی بہت مصیبتیں پیدا کیں، پھر جو رہبر انھوں نے بطرا[1] سے ساتھ لیا تھا، اس نے فوج کو دانستہ غلط راستے پر ڈال دیا اس لیے بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ جب رسد ختم ہو گئی اور فوج کو مسلسل لڑائیوں اور بیماریوں نے ادھ مُوا کر دیا۔ تو یہ مارب کے قریب پہنچی۔ آگے جانے کا حوصلہ نہ ہوا اور گیلس دل شکستہ ہو کر لوٹ گیا۔ وہ نہ حمیریوں کے دارالحکومت میں پہنچ سکا اور نہ بخورات کے خاص علاقے میں داخل ہو سکا۔ ایک ہزار چھ سو سال گزر جانے کے بعد ترکوں نے جنوبی عرب میں فوجی مہمیں بھیجیں۔ مگر وہ بھی کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

جو کام رومی سپاہی پورا نہ کر سکے تھے، وہ رومی بیڑے نے پورا کر دیا۔ رومیوں کو بحر ہند کا یہ راز معلوم ہو چکا تھا۔ کہ سال کے ایک حصے میں برساتی ہوائیں مشرق سے مغرب کی طرف چلتی ہیں، اور دوسرے حصے میں ان کا رُخ منقلب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رومی بیڑے کی کوشش سے سنہ ۶۰ء تک حمیریوں کی وہ اجارہ داری ختم ہو چکی تھی۔ جو انھیں بحیرہ روم اور بحر ہند کی تجارت میں حاصل تھی۔ گویا پرانی عربی ثقافت کی عظمت کا دور افسانۂ ماضی بن چکا تھا۔

بعض سرگرم یمنی بادشاہوں نے پھر کوشش کی کہ دنیا کی تجارت میں اپنا

---

[1] Petra جسے عرب عام طور پر بطرا کہتے ہیں۔ یہ ادوم کا نہایت مستحکم حصار تھا، جو بحیرۂ لوط اور خلیج عقبہ کے درمیان ایک وادی میں واقع تھا۔ اس کے آثار بھی برآمد ہو چکے ہیں۔

حصہ حاصل کر لیں چنانچہ انہوں نے بحیرۂ قلزم کے ساحلی علاقے کے علاوہ حضرموت پر بھی اقتدار قائم کر لیا۔ اس طرح حبشہ والوں سے ان کا تعلق پیدا ہو گیا۔ رومی شاہنشاہ کانسٹن ٹیس نے جنوبی عرب میں مبلغوں کی ایک جماعت بھیجی تھی، جس سے مسیحیت کو تقویت پہنچی۔ یہودیت شمالی جانب سے پہنچ گئی۔ اور اس نے اتنی قوت پکڑ لی کہ آخری حمیری بادشاہ ذونواس یہودی مذہب اختیار کر چکا تھا۔ ۵۲۳ء میں ذونواس نے شمالی مشرقی یمن کے شہر نجران پر حملہ کیا اور وہاں کے مسیحیوں کا صفایا کر دیا[1]۔ یمن میں جو مسیحی باقی رہ گئے تھے۔ انہوں نے حبشہ کے مسیحی حکمران سے مدد طلب کی۔ وہاں سے ستر ہزار فوج آئی اور وہ ہر مخالفت کو بہالے گئی۔ ذونواس گھوڑے پر سوار ہو کر ساحلی میدان کے ایک ریگزار سے گزر گیا اور گھوڑا اس نے سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیا۔ پھر وہ کسی کو زندہ نظر نہ آیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی ۵۲۵ء میں حمیری سلطنت ختم ہو گئی۔ اسی وقت جنوبی عرب کی ثقافت کے عہد درجہ شاندار دور کا سورج بھی ڈوب گیا۔

---

[1] یہ وہی واقعہ ہے جس کی طرف قرآن مجید نے سورۂ بروج میں یوں اشارہ کیا ہے۔ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ۔ مارے گئے کھائیاں کھودنے والے یہ آگ ہے بہت ایندھن والی جب وہ اس پر بیٹھے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ذونواس یہودی نے نجران کا محاصرہ کر لیا تھا۔ شہر فتح ہوا تو تمام عیسائیوں کو گرفتار کر لیا خندقیں کھدوا کر ان میں آگ سلگائی اور سب اسیروں کو اسی آگ میں جلوا دیا۔ یہ خدا کے بندوں پر صریح ظلم اور جبر تھا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ خندقیں اور کھائیاں کھدوا کر خدا کے بندوں کو آگ میں جلانے والے ہلاک ہوئے اور ملعون قرار پائے۔ انھیں بھی دہکتی ہوئی آگ میں جلنا پڑے گا۔

حبشی مسیحیوں نے یمن پر قابض ہوتے ہی مرکز حکومت ظفار کی جگہ صنعاء میں منتقل کر لیا اور وہاں ایک شاندار کنیسہ تعمیر کیا۔ جس کے لیے مارب کے کھنڈروں سے پتھر حاصل کیے گئے تھے[1]۔ صنعاء کے بعض مسیحی بشپ پوری مسیحی دنیا میں مشہور تھے۔ مثلاً ماربطروس[2] (۵۹۶ء) عربی تاریخ نگاروں نے جنوبی عرب میں اس دور کے جس سب سے بڑے واقعے کا ذکر کیا ہے، وہ بند مارب کا انہدام ہے، جو چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں پیش آیا۔ قافلوں کی آمد و رفت میں بہت کمی آ گئی تھی۔ اس وجہ سے دولت گھٹ گئی۔ پھر اہل حبشہ کے ساتھ جنگوں کے انہماک نے آبیاری کے وسیع انتظامات کی پوری دیکھ بھال کی فرصت نہ دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نظام برباد ہو گیا، جس پر مشرقی یمن کی تہذیب کا انحصار تھا۔ سیاسی اور اقتصادی انقلابات کا بیان آسان نہ تھا۔ اس لیے عرب مورخوں نے اپنی توجہ بند کے ٹوٹنے پر مرتکز رکھی اور اسے انھوں نے ایک بہت بڑے چوہے کا قصہ قرار دیا۔ سلطنتوں کے عروج و زوال کو عام فہم انداز میں پیش کرنے کے سلسلے میں انسانی کوشش کی یہ ایک دلچسپ مثال ہے۔ یہ بھی ممکن

---

[1] یہی کنیسہ تھا جسے پورے عرب کا مرکز عبادت بنانے کے لیے ابرہہ نے کوششیں کی تھیں جب دیکھا کہ عرب حرم پاک کو نہیں چھوڑتے تو مکہ معظمہ پر چڑھائی کر دی۔ شہر سے چھ میل پر وادی محسّر میں اس کا لشکر تباہ ہو گیا۔ ذونواس نے مسیحیوں پر ظلم کیا اور سزا پائی۔ آخرت کی سزا الگ رہی۔ مسیحی حکمران نے عبرت حاصل کرنے کے بجائے خود ذونواس کے ظلم و جبر کا طریقہ اختیار کر لیا۔ اس کا انجام بھی وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

[2] Mar Petrus گویا یہ مسیحی بشپ نسطوری فرقے کا تھا۔

ہے کہ بند کی بنیادوں میں زمین کھودنے والے چوہوں جیسے جانوروں نے کھوکھلی کر دی ہوں، جو عرب کے اس حصے میں پائے جاتے ہیں۔[۱]

سنہ ۶ء کے بعد مغربی دنیا کو جنوبی عرب کی اس تہذیب کے بارے میں یاد نہ رہا اور یہ بے خبری ایک ہزار سال تک جاری رہی۔ سنہ ۱۷۶۲ء میں کارسٹن نیبہر نام ایک ڈین (باشندہ ڈنمارک) نے یورپ کو جنوبی عرب کے کتبات سے آگاہ کیا۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں برطانیہ کا ایک بحری افسر جیمز آر ویل سٹڈ اس تاریخی خطے میں تھوڑی دور تک گیا۔ پھر ایک فرانسیسی تامس ارناڈ[۲] نے مارب کے کھنڈر دریافت کیے۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں ایک اور فرانسیسی جوزف ہلیوی[۳] نے جنوبی عرب کی سلطنتوں کے متعلق یورپ کے علم میں مزید اضافہ کیا۔ یہ بڑا بلند پایہ مستشرق تھا اور ارنی سی گلیس کے بعد پہلا یورپی تھا جس نے مارب کے شمالی و مشرقی علاقے کو دیکھا۔ یہاں سب سے زیادہ وسیع پیمانے پر کام کرنے کا اعزاز ایڈورڈ گلازر[۴] نام ایک آسٹروی کو حاصل ہے جس نے انیسویں صدی کے نویں عشرے میں مارب تک چار مرتبہ تحقیقی سفر کیے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں ایک امریکی ہوائی جہاز نے بعض امریکیوں اور یمنی امیروں کے ساتھ مارب کے کھنڈروں کا چکر لگایا۔

امریکہ میں انسانی تہذیب و تاریخ کے مطالعے کے لیے امریکن فونڈیشن[۵] کے

(ii) Thomas S. Arnaud (iii) Joseph Holevy

(iv) Edward Glaser (v) American Foundation for the study of man.

[۱] بلاشبہ بند ایسی بے تباہ ہوا کہ دیکھ بھال نہ ہوسکی۔ اسکے اسباب ظاہر تھے۔ اول دولت کی کمی دوم لوا تیموں میں انہماک۔ انکے علاوہ یہ بھی ہوا کہ نظم و نسق بگڑ گیا ہے اور بے بسی و حکومت نا اہل ہے کہ آتی ہے تو عموماً ایسے ہی نتیجے نکلتے ہیں۔ سب سے آخر میں یہ واقعہ ۳۴۹

نام سے ایک ادارہ بنا ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء سے سنہ ۱۹۵۲ء تک اس ادارے کی جانب سے آثار قدیمہ کی چھان بین کے سلسلے میں دو مہمیں عدن کے زیر حمایت علاقوں میں اور ایک مہم یمن میں بھیجی گئی۔ وینڈل فلیپس[1] ان مہموں کا رئیس تھا۔ مہموں کے ارکان بھی اپنے اپنے فنوں میں ماہر تھے۔ اور ان کے پاس سامان بھی نہایت عمدہ تھا۔ چنانچہ جنوبی و مشرقی یمن کے علاوہ عدن کے زیر حمایت علاقوں کے بعض حصوں میں آثار قدیمہ کی دیکھ بھال جاری رہی۔ قتبان کی قدیم سلطنت کے نظام آبیازی کا مفصل مطالعہ کیا گیا۔ حجر ابن حمید کے انبار میں پانچ مہینے کھدائی جاری رہی۔ وہاں سے دو ہزار سال پیشتر کی چیزیں نکلیں۔ تمنا کے بعض معبدوں میں کھدائی کی گئی، جو چیزیں برآمد ہوئیں، ان سے اندازہ کیا گیا کہ تمنا ۲۵ سنہ ق م کے آس پاس آخری مرتبہ تباہ ہوا۔ وہاں کے قبرستان کا ایک حصہ بھی کھدوا گیا۔ اور جو کتبے برآمد ہوئے، ان کی نقلیں اور تصویریں لی گئیں۔

یمن میں مارب کی طرف امریکیوں کا یہ پہلا اقدام تھا۔ وہاں چندر دیوتا کے ایک مندر کی کھدائی ہوئی جو ساتویں صدی قبل مسیح کا تھا۔ علاوہ بریں مارب کے بند کبیر کی کھدائی بھی کی گئی۔ برنج اور شفاف پتھر کی بہت سی چیزیں نکلیں اور سبا کے متعلق نئے کتبات دریافت ہوئے۔ مگر حکومت یمن کی طرف سے مشکلات پیدا کی گئیں، یہاں تک کہ کام اچانک روک دینا پڑا۔ بایں ہمہ جنوبی عرب کی سبائی تہذیب پر خاص روشنی کا انتظام ہوا۔ لیکن یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس حصہ عرب کی جو ثقافت مدت ہوئی گم ہو چکی تھی یورپیوں نے ابھی اس کی

---

[1] Wendell Phillips

اگر زمین کھودنے والے جانوروں یا چرواہوں نے آس پاس کی زمین میں بل بنا کر پانی کے لیے اندر جانے کا بندوبست کر دیا تو اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے۔ بہرحال یہ دیکھ بھال دکھ کرنے ہم کا ایک الم انگیز نتیجہ تھا۔

سطح پر سرسری خراشیں لگائی ہیں جب اہل یمن تحقیق کے لیے دروازے کھول دیں گے۔ اور آثار قدیمہ کی چھان بین حقیقی معنی میں شروع ہو جائے گی تو ایک ایسی تہذیب برآمد ہوگی جو اہمیت میں مصر اور دوآبہ عراق کی تہذیب سے کم نہ تھی۔

۱۹۲۶ء سے پیشتر یمن میں صرف آٹھ امریکی گئے تھے۔ ان میں سے پہلا ایک مسیحی مشنری چارلس، ایف کیمپ[1] تھا، جو اپنی بیوی کے ساتھ ۱۹۰۵ء میں یمن پہنچا اور حدیدہ سے روانہ ہو کر اس نے صنعا کو دیکھا۔ پھر واپس ہو کر مناخہ[2] میں مقیم ہو گیا، جہاں اس نے بڑھئی کی دکان کھول لی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جوش اس کے عقل و فہم پر غالب آگیا۔ ۱۹۱۰ء میں عدن کے امریکی قونصل چارلس کے۔ موزر[3] کو حکم ملا کہ کیمپ مارا جا چکا ہے۔ یمن پہنچ کر اس واقعہ کی چھان بین کرو۔

موزر حاجیوں کے ایک چھوٹے سے جہاز میں سوار ہوا، جو جدہ جا رہا تھا اور مئی ۱۹۱۰ء میں حدیدہ کے ساحل پر اتر گیا۔ پھر مقامی ترکی گورنر سے گھوڑے لے کر مناخہ اور صنعا کی جانب روانہ ہو گیا۔ امام یحییٰ اس زمانے میں نوجوان تھا۔ اس نے موزر کا خیر مقدم کیا۔ چھان بین میں مدد دی، آخر ثابت ہوا کہ کیمپ کو ترکوں نے قید کر لیا تھا اور انہیں موت کی سزا دی۔ موزر واپسی کے لیے گھوڑے پر سوار ہوا تو گر پڑا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہاں نہ کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ گاڑی تھی۔ موزر نے خود ہی ٹوٹی ہوئی ہڈی باندھی

۱؎ Charles F. Camp ۲؎ مناخہ حدیدہ اور صنعا کے درمیان پہاڑوں میں ہے۔ ۳؎ Charles K. Moser.

اور سوار ہو کر چلا۔ سانغرا سے ایک جہاز نے عدن پہنچایا۔ وہاں اس کا علاج ہوا۔ موزر ۱۹۴۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوا۔

پھر آٹھ سال تک یمن اور امریکہ کے درمیان کوئی علاقہ پیدا نہ ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد امام یحییٰ (الامام المتوکل علی اللہ یحییٰ بن محمد حمید الدین) نے پریذیڈنٹ ولسن کو لکھا کہ آپ نے دنیا میں امن قائم کیا ہے یمن میں ہمارے حقوق امامت کا بھی احترام کیجیے، جہاں ہمارے اجداد ایک ہزار سال سے حکومت کرتے آئے ہیں، اور عربوں کو بھی آزادی دلایئے۔ اس خط پر کوئی توجہ نہ کی گئی۔ انیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں ابین ریحانی نے، جو عربی النسل امریکی تھا، یمن کی سیاحت کی[1]۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد موزر چین کی طرف تبدیل ہو گیا۔ سرکاری دوروں کے سلسلے میں وہ ایک مرتبہ مکدن[2] گیا، جو برف سے محصور تھا۔ امریکہ کا وزیر مختار متعینہ چین، چارلس آر کرین بھی ساتھ تھا۔ کرین جوانی کے زمانے میں مصر رہ چکا تھا۔ اس لیے اسے عربوں کے معاملات سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی

---

[1] ابین ریحانی نے نہ صرف یمن بلکہ یمن، حجاز، عراق، نجد، عدن وغیرہ کی سیاحت کی اور اس سفر کے متعلق تین کتابیں لکھیں۔ ایک عربی میں جو "ملوک العرب" کے نام سے دو جلدوں میں شائع اور دو انگریزی میں ایک کا نام Around the coasts of Arabia اور دوسری کا نام Arabian Peak Desert تھا۔ ریحانی اس سفر میں ملک عبدالعزیز مرحوم سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کے حالات پر بھی ایک کتاب انگریزی میں تصنیف کی تھی جس کا نام Ibn Saud of Arabia تھا۔

[2] Mukden

تھی ۔ پھر صدر ولسن نے اسے ایک کمیشن کا ممبر بنا کر فلسطین بھی بھیجا تھا[1] ۔ رینے اس سلسلے میں سفر یمن کے حالات بیان کیے ۔ ساتھ ہی بتایا کہ اس کے مدنظر بڑے شاندار اور تاریخ نہایت اہم ہے ۔ کرین کو اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ اس نے امام یحییٰ سے ربط ضبط پیدا کر لیا اور ۲۷-۱۹۲۶ء کے موسم سرما میں وہ صنعا گیا ۔ اس طرح دونوں میں گہری دوستی پیدا ہو گئی ۔ گفتگو کے دوران میں کرین نے امام کو بتایا کہ یمن کی ارضی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے ، یہاں بہت سی قیمتی دھاتیں ملیں گی ۔ امام نے کہا کہ ہم ایک امریکی انجینیر کی خدمات مستعار لینے کے لیے تیار ہیں ۔ کرین بڑا فراخ حوصلہ آدمی تھا اور اس کے پاس روپے کی بھی کمی نہ تھی ۔ اس نے امام کو اطلاع دی کہ میں اپنے خرچ پر ایک انجینیر آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں امام نے یہ پیشکش قبول کر لی ۔ اسی سال موسم بہار میں ایک امریکی انجینیر کارل ایس ٹوچل عدن سے گزرا ، وہاں اسے معلوم ہوا کہ کرین کو یمن میں کام کرنے کے لیے ایک انجینیر کی ضرورت ہے ۔ اس طرح ٹوچل عربستان کے افق پر نمودار ہوا ۔ جو آگے چل کر اس سرزمین میں نشو و ارتقا کے تمام منصوبوں کا سرچشمہ بننے والا تھا ۔

۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان ٹوچل نے یمن کے چھ چکر لگائے ۔ ایک

---

[1] یہ اس کمیشن کا ذکر ہے جو صدر امریکہ کے لیے معلومات فراہم کرنے کی غرض سے آیا تھا ۔ یعنی King - Crane کمیشن ۔ لیکن برطانیہ اور فرانس کی غلط پالیسی نے اس کمیشن کی معلومات کے مطابق کام ہی نہ ہونے دیا اور امریکہ تمام معاملات سے دست کش ہو گیا

چکہ یمن کرین کا ذرا سا چارلس ریڈلے بھی ساتھ اور ٹوچل کی بیوی بھی گھوڑے کی سواری میں ہمراہ رہتی تھی۔ اہل یمن ایک خاتون کو بے پردہ گھوڑے پر سوار دیکھ کر سخت حیران ہوتے تھے۔ غرض ٹوچل نے یمن کے معدنی ممکنات کی خوب چھان بین کی۔ اس نے کچھ سڑکیں تجویز بھی کیں اور تعمیر بھی کیں۔ بعض یمنیوں کو نمونے کے فارم قائم کرنے میں مدد دی جن میں آدمیوں یا جانوروں کے ذریعے سے چلنے والے پمپ لگائے گئے۔ کہیں کہیں ہوا کے ذریعے سے چلنے والے پمپ بھی لگے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ حدیدہ صنعا جانے والے راستے پر ایک ندی میں کئی مہینے پانی کا اتنا جوش و خروش ہوتا تھا کہ راستہ رک جاتا ہے۔ یہاں لوہے کا ایک پل بنا دیا گیا، جو کرین نے دوستانہ تحفے کے طور پر پیش کر دیا تھا۔

کرین ۱۹۲۷ء میں صنعا سے امریکہ گیا تو اپنے ساتھ معاہدے کا ایک عربی مسودہ لے گیا، جس کی مرکزی دفعہ یہ تھی کہ امریکہ یمن کو تسلیم کر لے۔ اس وقت تو رسمی تعلقات کا کوئی بندوبست نہ ہوا۔ البتہ کرین نے دوستانہ روابط بڑھانے کے سلسلے میں جو کچھ کیا تھا، اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ اس سلسلے میں عدن کا امریکی نائب قونصل جیمز لوڈر پارک[1] بھی غیر رسمی طور پر یمن گیا۔ چارلس موزر کی آمد پر اٹھارہ سال گزر چکے تھے، جب دوسرا امریکی مامور یمن پہنچا۔ اس پوری مدت میں یمن کی حالت وہی رہی جو پہلے تھی۔ صرف دو تبدیلیاں ہوئیں، اول ترکی اقتدار ختم ہو گیا تھا، دوسرے صنعا اور حدیدہ: تعز اور یمن کے درمیان

---

[1] James Loder Park

تاربرقی کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔

اس اثنا میں ارضیات کے دو امریکی ماہروں نے ساحلی میدان میں چھان بین کی تھی۔ انہیں معلوم ہوا کہ مخا کے پاس نیز جزیرہ فرسان میں تیل کے ذخیرے ہیں۔ نیو یارک کی ایک کمپنی نے مٹی کے تیل کا اجارہ لینا چاہا لیکن معاملہ طے نہ ہو سکا۔ اس لیئے کہ امام یحییٰ بدلے میں امریکہ کی فالتو فوجی وردیاں مانگتا تھا اور کمپنی وردیاں دے نہ سکتی تھی۔ ترکوں نے حدیدہ کے شمال میں نمک کی ایک کان کھودی تھی۔ ایک امریکی کمپنی نے اس نمک کا اجارہ لینا چاہا۔ مگر امام نے اس بنا پر انکار کر دیا۔ کہ ملک کے طبعی ذخیروں میں سے کوئی چیز کسی اجنبی کمپنی کو نہیں دی جا سکتی۔ ۱۹۳۳ء میں امام نے امریکہ کے ایک ماہر بشریات کو ملک میں آنے کی اجازت دے دی۔ مگر مارب جانے کی اجازت نہ دی۔

یمن کی شمالی سرحد متعین نہ تھی۔ صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ نجرانی قبائل کے جانور چرانے کی آخری جنوبی حد سے آگے یمن کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ نیم خانہ بدوش عرب چراگاہوں کی تلاش کرتی ہوئی شمال اور جنوب میں میلوں نکل جاتی تھی۔ عسیر کے متعلق بھی یحییٰ اور ابن سعود کے درمیان تنازعات تھے جنھوں نے ۱۹۳۴ء میں نازک صورت اختیار کر لی اور آخر جنگ ہوئی۔ ابن سعود کی فوج کا ایک حصہ امیر فیصل کی سرکردگی میں تہامہ سے گزرتا ہوا حدیدہ سے آگے بڑھ کر زبید جا پہنچ گیا۔ دوسرے حصے نے موجودہ بادشاہ دولت سعودیہ (امیر سعود جو اس زمانے میں ولی عہد تھا) کی سالاری میں نجران سے پیش قدمی شروع کی۔ یمن کے شہزادہ احمد نے شکست کھائی اور

نجدی عساکر صعدہ پہنچ گئے۔ ابن سعود معاملے کو انتہا تک نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ جلد جنگ ختم ہو گئی۔ اور امام نے پالیسی میں ابن سعود سے مشورے پر آمادگی ظاہر کی۔

چارلس کرین نے ایک دلچسپ قصہ سنایا۔ دولت سعودیہ کی جو حد مقرر کی گئی تھی۔ امام اس سے متفق نہ تھا۔ چنانچہ اس نے ابن سعود سے کہا کہ گفت و شنید کی جائے۔ ابن سعود نے یہ تجویز قبول کر لی اور امام سے کہا کہ آپ کسی ایک کو ثالث تجویز کر دیں، جس کا فیصلہ آپ کے نزدیک قطعی سمجھا جائے۔ امام نے خود ابن سعود کو ثالث مقرر کر دیا۔ ابن سعود نے تمام حالات پر غور کرنے کے بعد فیصلہ صادر کر دیا کہ حد بندی غلط ہوئی ہے اور امام جو حد تجویز کرتے ہیں، اسے درست مانا جائے۔ قوموں کے درمیان خیر سگالی کی ایسی مثال شاذ ہی مل سکے گی۔

پارک کے یمن جانے پر مزید سولہ سال گزر گئے اور یمن و امریکہ کے تعلقات غیر رسمی حیثیت ہی تک محدود رہے۔ مئی ۱۹۴۷ء میں امام یحییٰ کا ایک کارکن سید حسین ایکسی قاہرہ کے امریکی سفارت خانے میں یہ درخواست لے کر پہنچا کہ یمن اور برطانیہ کے درمیان جنوبی سرحد کے متعلق جھگڑا چلا آتا ہے۔ اور ریاستہائے متحدہ کی حکومت بیچ میں پڑ کر اس جھگڑے کو ختم کرا دے۔ فیصلہ تو بہرحال گفت و شنید ہی سے ہونا تھا، لیکن مناسب معلوم ہوا کہ امریکہ کا کوئی افسر خود موقع پر جا کر حالات کی چھان بین کر لے۔ چنانچہ ہارلن بی کلارک[1] کو اس غرض سے منتخب کیا گیا۔ حکومت یمن کو اطلاع دی

---

[1] Harlan B. Clark

گئی تو اس نے تجویز کا خیر مقدم کیا چنانچہ کلارک عدن سے روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ امریکی بحریات کا ایک ڈاکٹر الفنٹ، کمانڈر الیفرڈ ڈبلیو پامر[1] اور ایک ترجمان وہ ساتھ لے گیا۔ ایک یمنی رہبر ہمراہ تھا، ایک آدمی خود امام نے خاص رفاقت کے لیے عدن بھیج دیا تھا۔ یہ لوگ توفیق خانے کی جیپ میں روانہ ہوئے اور لحج سے شمال مغرب کا رخ کیا۔ نخلستان لحج سے گزر کر پہلے ریت کے بنجر زار سے سابقہ پڑا جسے "زرد صحرا" کہنا چاہیے۔ پھر بنجر پہاڑ آ گئے جنہیں "سیاہ صحرا" قرار دینا مناسب ہوگا۔ رات تعز میں گزاری جو جنوبی یمن کا دارالحکومت اور موجودہ فرمانروائے یمن کا مرکز ہے۔ یہیں شہزادہ احمد سے ملاقات ہوئی۔ تعز سے مغرب کا رخ کر دیا گیا۔ پہاڑیوں سے گزر کر جنوبی تہامہ کا مسطح مگر غیر زرخیز علاقہ آگیا۔ پھر زبید میں پہنچ گئے۔ جس کے قلعے کی دیواریں کچھ کم بلند تھیں۔ یہ شہر ایک زمانے میں علوم کا مرکز تھا۔ یہاں علماء سے ملاقات ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ کیلے، انگور، پپیتے، لیمو، ناریل اور انجیر کے سیراب و پر رونق باغوں میں کچھ اور وقت گزارا جائے، مگر جو کام درپیش تھا، وہ اطمینان سے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ زبید سے راستہ کم اونچی ریتلی پہاڑیوں میں سے گزرا۔ بیچ میں سرسبز وادیاں بھی آتی رہیں۔ وحین کے اطراف میں درجہ بدرجہ کھیت خوب سیراب تھے۔ چالیس میل کا فاصلہ طے کر کے یہ جماعت بیت الفقیہ پہنچ گئی جہاں پر روئی کی منڈی ہے۔ یہاں مہمانوں کی تواضع قہوے سے کی گئی۔ بیت الفقیہ کو قہوے کے سلسلے میں خاص شہرت حاصل ہے۔ یہاں لوگوں کے چہرے ایک حد تک سیاہی مائل تھے۔ یہ افریقی خون کی آمیزش کا ثبوت تھا۔ اودھر

---

[1] Alfred W. Palmer

یمنی شہروں کی طرح بیت الفقیہ میں بھی ڈاکٹر پامر سے درخواست کی گئی کہ سرکاری افسروں اور ان کے افراد کنبہ کا علاج کر دیں جو موسمی بخار سے موتیا بند تک مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔

بیت الفقیہ کے بعد تہامہ کا اصل ریتلا علاقہ شروع ہو گیا۔ شام ہو چکی تو فورڈ کی ایک سٹیشن ویگن ریت میں ٹھہری ہوئی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ حدیدہ کا حاکم پندرہ میل کا سفر کر کے پیشوائی کے لیے آ گیا تھا کہ امریکی مہمان کہیں راستہ نہ بھول جائیں۔ حدیدہ میں دو راتیں گزاریں۔ پھر شمال مشرق کا رُخ کر لیا۔ ریتلے صحرا کے بعد پہاڑ آ گئے۔ صنعاء کے جس راستے پر کرین نے ایک جگہ لوہے کا پل بنوایا تھا، اس میں زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا یمنیوں نے قریب کا ایک راستہ درست کر لیا تھا۔ یہ راستہ مختلف وادیوں اور تین پہاڑی سلسلوں میں سے گزرتا تھا۔ پہلی رات زیر سما سوئے، جہاں ہوا خنک اور فضا مچھروں سے پاک تھی۔ دوسرے روز آٹھ ہزار فٹ اونچے درے سے گزرتے ہوئے متعبر پہنچے، جہاں رات گزاری۔ تیسرے روز صنعا میں وارد ہوئے۔

یہ جماعت ایک ہفتہ صنعاء میں ٹھہری۔ امام بہت بوڑھا ہو چکا تھا، مگر بڑی گرم جوشی سے ملا۔ گفتگو کے دوران میں اس نے پھر سوال اٹھایا کہ ریاستہائے متحدہ کو چاہیے کہ حکومت یمن کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لے۔ نیز ملک کے نشوونما ارتقا میں مدد دے۔ کلارک نے عدن واپس آ کر یہ اطلاع تار کے ذریعے سے واشنگٹن بھیج دی۔ اب ریاستہائے متحدہ کے تعلقات براہ راست

جزیرۃ العرب سے پیدا ہو چکے تھے۔ چنانچہ حکومت یمن کو تسلیم کر لینے کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ کام خط و کتابت سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ضروری تھا کہ کسی شخص کو صدر امریکہ کا نمائندہ اور وزیر مختار بنا کر بھیجا جاتا۔ چنانچہ پھر ایک مشن بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ اور دولت سعودیہ میں امریکی وزیر مختار ولیم اے ایڈی[1] کو اس غرض سے منتخب کیا گیا۔ کتاب کے مصنف[2] اور ہارلن کلارک کو بھی ساتھ کر دیا گیا۔ خوراک، لباس، خیموں، ریڈیو، دواؤں وغیرہ کی فراہمی میں خاصا وقت لگا اور ان معاملات کے متعلق یمنیوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے کہ بعض چیزیں وہاں میسر ہی نہ آ سکتی تھیں۔ فوج نے سواری کے لیے جیپیں اور سامان کے لیے ٹرک مہیا کر دیئے۔ جنگ کے بعد فورڈ نے موٹروں کا جو پہلا نمونہ تیار کیا، اس نمونے کی موٹر کرنیل ایڈی کے لیے لے لی گئی۔ عربوں میں یہ دستور بھی ہے کہ کسی سے ملاقات کے لیے جاتے ہیں تو تحفے پیش کرتے ہیں۔ امریکیوں نے فیصلہ کر لیا کہ ریڈیو کا بڑا اسٹ امام کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سٹ انہوں کے واسطے ساتھ رکھ لیے گئے۔ ٹارچیں اور رانڈی نیپڈ نقطے بھی تحائف کی غرض سے لے لیے گئے۔

امریکی بحریات کے ایک نئے تباہ کن جہاز (ڈسٹرائر) میں سوار ہو کر ۸۔ اپریل کو حُدَیدہ پہنچے۔ امریکی جہاز نے اکیس توپیں سلامی کے طور پر داغیں، حُدَیدہ کے قلعے سے جواب میں سلامی کی توپیں چلنی شروع ہوئیں۔ اس طرح بڑا وقت صرف ہوا۔ بڑی دیر کے بعد ایک کشتی آئی جس پر یمنی پرچم لہرا رہا تھا۔ اس میں پارک کا

---

[2] Harlan B. Clark [1] William A. Eddy

عزیز دوست قاضی فضل بن علی سوار تھا۔ وہ بہت بڑا زمیندار بھی تھا، عالم بھی
اور سرکاری عہدیدار بھی تھا۔ اب وہ امام کا نمائندہ بن کر آیا تھا۔ ایک کندھے
پر کڑھا ہوا سبز دوپٹا ڈال رکھا تھا۔ ایک جانب سنہری میان میں خنجر لٹک رہا تھا۔
قاضی نے امام کی طرف سے خوش آمدید کہی۔ اس کی خدمت میں آئس کریم اور
قہوہ پیش کیا گیا۔

حدیدہ ساحل بحر کی ریت اور تہامہ کی ریت کے درمیان کوئی ایک میل میں
پھیلا ہوا ہے۔ اس کا نصف شمالی حصہ جدہ سے مشابہ ہے۔ اگرچہ عمارتیں اتنی
بلند نہیں۔ نصف جنوبی حصے میں محض گھاس پھوس کی جھونپڑیاں ہیں، جن میں
حبشی رہتے ہیں۔ گودی پر پہنچے تو گورنر حدیدہ کے نائب نے استقبال کیا۔ عین
اس وقت کلارک بھی موٹر میں عدن سے آ پہنچا تھا۔ بندرگاہ سے باہر دو سو یمنی
سپاہی گارڈ آف آنر کے طور پر کھڑے تھے۔ آگے بڑھے تو بینڈ بجنے لگا۔ موسیقی
نہ مشرقی تھی، نہ عربی اور نہ ترکی، بلکہ تینوں کی آمیزش سے تیار ہوئی تھی۔ پھر
مشن گورنر کے محل میں پہنچا۔ وہاں ایک کمرے میں سب کو بٹھایا گیا، جس کی کھڑکیوں
سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ سامنے قاضی عبدالرحمٰن بن احمد السیاغی گورنر حدیدہ
بیٹھا تھا۔ عمر چیالیس سال کی ہو گی۔ سفید لباس، سنہری پیٹی اور کندھے پر سبز
دوپٹا جو اونچے طبقے کے یمنی استعمال کرتے ہیں۔ نصف گھنٹے کی بات چیت کے بعد
پارٹی سہ منزلہ مہمان خانے میں پہنچ گئی۔ شام کی خنکی میں پارٹی کے افراد نے حدیدہ
کی سیر کی۔ لکڑی کے دروازوں پر اعلیٰ درجے کے نقش و نگار تھے اور عربی کی عبارتیں
کندہ تھیں۔ بازار دیکھے۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جن پر سائبان تھے تاکہ دکاندار

دھوپ سے محفوظ رہیں۔ دکانوں پر چاول، مکئی، باجرا فروخت ہو رہا تھا۔ ترکاریاں لیمو اور سبزیوں کی بہتات تھی۔ تازہ پکڑی ہوئی مچھلیاں اور گوشت بھی تھا جسے مکھیوں کے ہجوم نے ڈھانپ رکھا تھا۔ بعض دکانوں پر ہندوستان کے رنگین کپڑے بھی تھے۔ جدہ سے مقابلہ کیا تو حدیدہ میں اناج زیادہ نظر آیا۔ لیکن بازار ویسے صاف نہ تھے۔ اور زیادہ لوگ بیمار یا لولے لنگڑے، اپاہج اور اندھے دکھائی دیتے تھے۔

گوداموں کو دیکھا تو وہاں قہوہ کے انبار پڑے تھے جنہیں عورتیں بوریوں میں بھر رہی تھیں اور اس سے خوشبو کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ حُدَیدہ کا قہوہ دنیا بھر میں بہترین مانا جاتا ہے۔ عدن میں زیادہ سے زیادہ قیمت پاتا ہے اور قہوے کی دوسری جنسوں میں ملا کر اسے فروخت کیا جاتا ہے۔ افسوس کہ اہل یمن قہوہ زیادہ مقدار میں پیدا کرنے کے ممکنات سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

دوسرا دن خلیج حُدیدہ کے معائنے میں بسر ہوا جو قصبے کے شمال میں ہے۔ پانی کا ایک وسیع قطعہ زمین کے اندر آ گیا ہے۔ بیس سال پیشتر ایک یونانی کمپنی کو گودی بنانے کے لیے ایک لاکھ پونڈ کا اجارہ دیا گیا تھا، مگر دس ہزار پونڈ خرچ ہونے کے بعد افسر غائب ہو گئے۔ ان کی کوشش کا صرف یہ نتیجہ باقی رہ گیا۔ کہ ایک چھوٹا سا سنگین چبوترہ ہے۔ اور ایک زنگ خوردہ ریل کی چھوٹی لائن جس پر بارہ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں اور ایک انجن انتہائی بری حالت میں پڑے ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد پارٹی پھر حدیدہ کے دورے پر نکلی۔ معلوم ہوتا تھا کہ چاندنی بدبو کو ختم کر رہی ہے۔ اور بلند مکانوں کی گرد آلود خستگی کو غسل دیکر جمیل و پُراسرار بنا رہی ہے۔ لوگ مکانوں کی چھتوں پر سے اور کھڑکیوں میں سے اجنبیوں کو دیکھ رہے تھے اور سایہ دار گلیوں میں پہرے داروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو مکانوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ وہ ساری رات

[illegible]

اٹھارھواں باب

سفارتی مشن کی داستان

حُدیدہ سے سڑک تھوڑی دور ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب جاتی ہے۔ اس کے دونوں طرف جھاڑیوں کے جھنڈ اور ریت کے ٹیلے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک مقام پر سے وہ درختوں سے بھرا ہوا جزیرہ صاف نظر آتا ہے جہاں ۱۹۲۳ء میں شہزادہ محمد اپنے دو دوستوں کی جان بچاتا ہوا غرق ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ شاہی خاندان میں وہ سب سے زیادہ قابل فرد تھا۔ اور اس کی وفات امام کے لیے بڑا سخت صدمہ تھی۔ راستے میں اونٹوں کا قافلہ ملا۔ جن پر کپڑے، مٹی کا تیل، تانبے، پیتل کے برتن، نمک وغیرہ چیزیں لدی ہوئی تھیں۔ سیاہ بھیڑوں کے ریوڑ اور ہندوستانی وضع کے پلے ہوئے مویشی چر رہے تھے۔ پہاڑیوں پر کہیں کہیں بزرگانِ دین کی قبریں تھیں، جن پر سفیدی پھری ہوئی تھی۔ ساحلی علاقہ خاصا سرسبز تھا۔ اور یہاں کے باشندے خانہ بدوشی کے بجائے کھیتی باڑی پر گزارہ کرتے تھے۔ اکثر کھیتوں میں تازہ ہل چلایا گیا تھا اور راستے میں جا بجا پانی

کی نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان نالیوں کو پاٹ دینا ضروری ہے کیونکہ ہر تیس چالیس گز کے بعد ایک ایسی نالی ضرور آجاتی تھی، جو موٹر کے لیئے رکاوٹ بن جاتی تھی۔ میدانی علاقہ خشک تھا۔ جب سورج نکلا اور ہوا چلنے لگی۔ تو ایک وقت میں پانچ بگولے نظر آئے، جو ایک دوسرے کے پیچھے چکر کھاتے ہوئے جارہے تھے۔ بعض ڈیڑھ ڈیڑھ سو فٹ بلند تھے۔ ہنگامہ ختم ہوتے ہی ایک وادی کے چوڑے دہانے میں داخل ہوئے۔ جس کی سطح سنگریزوں سے لبریز تھی۔ اطراف میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ اسی طرح قصبہ باجل میں پہنچ گئے، جو دو وجہ سے مشہور ہے، اول یہ کہ یہاں کی عورتیں بڑی حسین ہوتی ہیں، دوم یہ کہ ۱۹۱۹ء میں برطانیہ کا پولیٹیکل مشن صنعاء جارہا تھا۔ اسے یہاں تین مہینے قید رکھا گیا تھا۔ وہاں عامل کے اصرار پر قہوہ پینا پڑا، پھر آگے چلے۔ دوپہر کے کھانے کے لیئے پارٹی ایک جگہ ٹھہری۔ جہاں کیلوں کے علاوہ تربوز کھائے گئے جنھیں بطیخ کہتے ہیں۔ اس کا ذائقہ پپیتے جیسا تھا[1]۔ کھانے کے بعد حقہ بھی پیش کیا گیا۔ متعدد نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد پارٹی ایسے مقام پر پہنچی، جہاں پہلے پہل پتھر کے مکان نظر آئے۔ ٹیلوں کے اطراف میں دو دو تین تین ایکڑ کے کھیت تھے اور ان کے گرد دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ چشموں کے پانی کو روک کر ٹیلوں کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں پہنچانے کا انتظام کرلیا گیا تھا۔

حدیدہ سے ایک سو اٹھارہ کلومیٹر (تقریباً چھتر میل) کا فاصلہ طے کر چکنے کے بعد پارٹی ایک گاؤں کے پاس سے گزری جو اونچے ٹیلے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ قتار

---

[1] یہ آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ تربوز کا ذائقہ پپیتے جیسا ہوتا ہے۔ ممکن ہے امریکہ میں یہی کیفیت ہو۔ ہمارے ہاں تو تربوز اور پپیتے کے ذائقے میں بعید سی مشابہت بھی نہیں۔

تھا۔اب اصل وادی یمن کے دروازے پہنچ گئے، جس کے زیدی حکمران صحت و حفاظت کے خیال سے اسی قسم کے مقامات کو پسند کرتے ہیں۔

زیدی شیعوں ہی کا ایک فرقہ ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں قوت وطاقت انہیں کے ہاتھ میں ہے۔یا بڑے بڑے زمینداروں اور تاجروں کے ہاتھ میں، البتہ ساحلی آبادی سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے ۔ اور مقتدر لوگ یا تو تجارت پیشہ ہیں یا بحر پیما۔ یمن میں خانہ بدوش کوئی نہیں ۔ اب ہر طرف پہاڑی سلسلے نظر آ رہے تھے۔سورج ساڑھے پانچ ہی بجے نظروں سے غائب ہو گیا۔ پارٹی نے خیمے لگا کر کھلے میدان میں سونے کا انتظام کیا۔آسمان صاف ہو گیا۔ تارے نکل آئے۔چاند نے پہاڑوں کو دھندلی روشنی کا لباس پہنا دیا۔ دہقانوں نے جلانے کے لیے لکڑیاں فراہم کیں پھر دو دو فٹ چوڑی روٹیاں، بھنا ہوا دنبا اور چاول آ گئے۔ ہوا کی تازگی و خوشگواری سے بھوک چمک اٹھی تھی۔خوب کھا کر کمل اوڑھے اور سو گئے۔

پارٹی کے ساتھ گارد کے جو سپاہی جا رہے تھے، وہ تڑکے اٹھے۔ قہوہ تیار ہو گیا۔ پی کر قنفار کے مشرق کی جانب روانگی عمل میں آئی۔ جا بجا درجہ بہ درجہ کھیت تھے جن میں مرد پوستین پہنے ہوئے کام کر رہے تھے۔"مدینۃ العبیاء" میں قہوہ کے درخت پہلی مرتبہ دیکھے۔ یہ درخت کوئی بارہ فٹ اونچے ہوتے ہیں اور یوکلپٹس کے سایے میں پرورش پاتے ہیں۔ آگے پہلا قابل ذکر مقام حمام علی آیا، جہاں گرم پانی کے چشمے ہیں۔ دور دور سے لوگ نہانے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ چشموں کے مشرقی جانب ایک پہاڑ کھڑا تھا جو سطح وادی سے پانچ ہزار فٹ اور سطح بحر سے دس ہزار فٹ بلند ہو گا۔ یہ جبل مصنع ہے۔جو وادی یمن کے

راستے کا آخری بند یہ تھا - اس پہاڑ کے ساتھ جو سڑک بنائی گئی تھی، وہ بہت ڈھلوان تھی - اور موٹریں بڑی احتیاط سے چلانی پڑتی تھیں - وہ گرم ہو جاتی تھیں - اور بار بار انھیں ٹھنڈا کرنا پڑتا تھا - کرنل ایڈی کی موٹر خراب ہو گئی تھی - عامل حدیدہ نے ان کے لئے ڈاج کا انتظام کر دیا تھا - لیکن جیپیں اور ڈاج بار بار ٹھہرتی تھیں - پارٹی نے آدھا راستہ پیدل طے کیا - چوٹی پر پہنچ کر سوبٹریں پہنیں - درے کے مشرقی جانب چند سو فٹ ڈھلوان میں پہنچے تو وادی یمن کی سطح آ گئی - اس مقام پر وادی دس میل چوڑی تھی - زمین زیادہ تر پتھریلی نظر آئی - دس میل شمال کی جانب گئے تو معبر آ گیا جو اعلیٰ درجے کے زرخیز اور مزروعہ ضلع کا صدر مقام ہے - حدیدہ سے تار برقی کے ذریعے عامل معبر کو پوری اطلاعات مل چکی تھیں - قیام گاہ میں خوب ڈی ڈی ٹی چھڑک دی گئی تھی - اس لئے نیند خوب آئی - یہاں مہمانداری کا بڑا اچھا انتظام تھا - اگلے روز معبر سے روانہ ہوئے - ایک گھنٹے سے کم مدت میں ان پہاڑیوں سے گزرے جو وادی کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتی ہے - مزید دو گھنٹے کے سفر کے بعد جبل نقم[1] پہنچ گئے - جس کی بلندی وادی سے دو ہزار فٹ ہے اس کے دامن میں یمن کا دارالحکومت صنعا واقع ہے - دارالحکومت سے تین میل جنوب میں ایک سنگین عمارت ہے، جس میں مسافر ہاتھ منہ دھوتے اور کپڑے بدلتے ہیں - پھر شہر میں داخل ہوتے ہیں - یہاں سرکاری مہماندار اور رسالے کا ایک جیش ٹھہرا ہوا تھا - مہماندار نے امام کی طرف سے خوش آمدید کا پیغام پہنچایا - آگے راستہ "ورکشاپ" کے پاس سے جاتا تھا جہاں امام کی موٹروں کی مرمت ہوتی ہے اور فوج کے لئے بندوقیں ڈھلتی

---

[1] مصنف نے اسے جبل نقمر (NUQUM) لکھا ہے لیکن ابن ریحانی نے جبل نقم بتایا ہے - میرے نزدیک ریحانی کا تلفظ زیادہ قابل اعتماد ہے -

ہیں۔ اور آگے بڑھے تو صنعا میں داخلے کے بڑے دروازے "باب الیمن" پہنچ گئے۔ یہ تیس فٹ بلند ہے۔ اس کے دونوں طرف اینٹوں کے دو برج بنے ہوئے ہیں۔ اس دروازے پر دو سو سپاہی بینڈ کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے۔ مہمان خانے میں پہنچے یہ صنعا میں عہد حاضر کے نمونے کی بہترین عمارت ہے اگرچہ صرف دو منزلہ ہے۔

پارٹی صنعا میں تین ہفتے ٹھہری۔ اور یہ مدت اسی مہمان خانے میں گزاری۔ ہر ایک کے قیام کے لیئے جدا گانہ کمرے تھے۔ کرنل اڈی کے لیئے ایک الگ نشست گاہ بھی تھی۔ جب کانفرنسیں نہیں ہوتی تھیں تو پارٹی کے افراد وہاں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ کھانا ٹھنڈے کمرے میں کھایا جاتا تھا جو عمارت کی مغربی جانب تھا۔ بہترین اور لذیذ ترین کھانا ناشتے میں ملتا تھا۔ اس میں قہوہ سنگترے، میٹھے، سیب، انڈے مختلف شکلوں میں پیش کیئے جاتے تھے۔ ایک آدمی جو امریکہ کے مشہور مقام ڈیٹرائٹ میں اتفاقیہ ٹھہرا رہ چکا تھا ترس بنایا کرتا تھا۔

صبح کے وقت مطلع صاف ہوتا۔ سورج کے نکلتے ہی رات کی خنکی کافور ہو جاتی۔ صنعا میں دوپہر کے وقت بھی گرمی نہیں ہوتی اس لیئے کہ یہ شہر سات ہزار دو سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ دوپہر کے بعد سیاہ بادل جبل نقم کے آس پاس جمع ہونے لگتے اور کئی گھنٹے بارش ہوتی۔ پھر مطلع صاف ہو جاتا سفارتی مشن کے افراد کی سیر کے لیئے عربی گھوڑے مہیا کر دیئے گئے تھے۔

Detroit ا

جو چاہتا صبح سویرے گھوڑے کی سواری کرتا۔ جیپ میں بھی سیر و گردش کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح معلوم ہوا کہ صنعا تین حصوں میں منقسم ہے اور تینوں حصے ایک ہی فصیل سے محصور ہیں:-

۱۔ مشرقی جانب اصل عرب شہر ہے۔ گلیاں تنگ اور پیچ و خم فرش نا پختہ، زیادہ تر مکانوں کی چھتیں نیچی، عام مکان تین تین منزل کے بعض سات سات آٹھ آٹھ منزل کے۔ طریقہ وہی کہ پہلی منزل میں گودام، دوسری میں نوکر چاکر، تیسری میں صاحب خانہ اور اہل و عیال، سب سے اوپر کی منزل پر بیٹھنے کے لیے کمرے۔ وسط شہر میں بازار مگر تنگ اور پر پیچ و خم۔ بعض چھ فٹ سے بھی کم چوڑے۔ ان میں غلّہ، سبزیاں، پھل، گوشت، کپڑے، رسّے ڈبیاں وغیرہ چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ مغربی سیاحوں کے نزدیک خاص طور پر دلچسپ دکانیں سناروں کی ہیں، جو چاندی کی خوبصورت چیزیں تیار کرتے ہیں۔ دن کے وقت بازار کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں۔ اس حصے میں بعض مکانوں کی وضع قطع قلعوں کی سی دیکھی۔ نیز اس میں ایک درجن سے زیادہ خوبصورت مسجدیں ہیں۔ بعض کے مینار بڑے بلند اور حد درجہ خوش وضع ہیں۔

۲۔ صنعا کا وسطی حصہ، جس میں مہمان خانہ بھی واقع ہے، دراصل ترکی حصہ تھا۔ اس کے بازار اور گلیاں چوڑی رکھی گئی ہیں اور بہت سے مکانوں کے ساتھ سیراب باغ بھی ہیں۔ اسی حصے میں صنعا کی نو درسگاہیں واقع ہیں، جن میں زیادہ تر قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے۔ بعض میں جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ڈاک خانہ بھی اسی حصے میں ہے۔

۴- شہر کا تیسرا حصہ مغربی سمت میں تھا، جو یہودیوں کے لیئے مخصوص تھا۔ اب بہت سے یہودی نکل کر عدن کے راستے اسرائیل چلے گئے ہیں پیشتر یمن میں یہودیوں کی آبادی پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔ ان میں سے زیادہ تر صنعاء میں رہتے تھے۔ اکثر پہلی صدی عیسوی میں فلسطین چھوڑ کر باہر نکلے تھے جب انھیں جبراً وہاں سے اٹھا دیا گیا۔ کچھ لوگ ۵۰۰ء کے آس پاس آ گئے جب یہاں کا بادشاہ یہودی تھا۔ وہ خاص محصول دے دیتے تھے (جزیہ) اور فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ رات کے وقت وہ اپنے مخصوص حصہ شہر سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ زمین خریدنے کی انھیں اجازت نہ تھی گھوڑے یا موٹر کی سواری اور ہتھیار لے کر چلنے کی بھی ممانعت تھی۔ وہ دو منزل سے اونچے مکان نہیں بنا سکتے تھے مگر بعد میں آخری پابندی ختم ہو گئی تھی۔ وہ عام طور پر سنار کا کام کرتے تھے اور انگور کی شراب بھی بناتے تھے۔

ایک مرتبہ مہمانوں کو امام کے گرمائی محل میں دعوت دی گئی جو صنعاء سے دس میل کے فاصلے پر شمال میں واقع ہے۔ یہ آٹھ منزل کی عمارت ہے جو ایک بلند چٹان پر واقع ہے۔ امام گرمی کے مہینے یہاں گزارتا ہے۔ ایک مرتبہ الروضہ میں دعوت دی گئی جو صنعا کے شمال میں پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں پر مستقل انگور بھی دیکھے۔ کھانے میں مرغ، پلاؤ اور سبزیوں کے علاوہ ہر چار مہمانوں کے لیے ایک ایک سالم دنبا پکوایا گیا تھا۔ یہ دعوت امام کے شہزادوں کی طرف سے ہوئی تھی، جن میں سے، سیف الاسلام شہزادہ حسین اور سیف الاسلام

شہزادہ مطہر خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ کھانے کے بعد قات چبائی گئی۔ ایک درخت ہوتا ہے جو صرف بلند مقامات پر کہیں کہیں کاشت کیا جاتا ہے۔ جب پروان چڑھ جاتا ہے تو اس کے ملائم پتے توڑ کر نم آلود کپڑے میں لپیٹ لیے جاتے ہیں۔ چبانے کا طریقہ یہ ہے کہ پتے کا گولا سا بنا کر منہ میں رکھ لیا جاتا ہے، پھر دوسرا، پھر تیسرا، یہاں تک کہ ڈنٹھے کی وجہ سے کھانے والے کا رخسار باہر نکل آتا ہے۔ پھر اسے تھوک کر چند گلاس پانی پیا جاتا ہے۔ اس طرح کھانے والے کی آنکھ کی پتلیاں ذرا سکڑ جاتی ہیں اور اس پر سرور کی سی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دو تین گھنٹے کے سرور کے بعد ردعمل شروع ہو جاتا ہے اور جب تک مزید قات چبانے کو نہ ملے عادی آدمی ناخوش اور مغلوب الغیظ رہتا ہے۔ امریکیوں نے بھی تجربے کے طور پر کھایا، مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ممکن ہے اثر اس وقت ہوتا ہو جب اسے ہفتوں تک زیادہ مقدار میں کھایا جائے۔

سفارت کے سامنے دو مقصد تھے، اول سلطنت یمن کو تسلیم کر لینا، دوم دوستی اور تجارت کا معاہدہ کرنا۔ پہلا کام حدیدہ میں اکیس توپوں کی سلامی ہی سے پورا ہو چکا تھا، دوسرے کے سلسلے میں پہلے امام سے رسمی ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر بڑا اہتمام کیا گیا۔ سفارتی مشن کے آدمی شاہی محل میں پہنچے تو وہاں راغب بے وزیر خارجہ موجود تھا۔ یہ شخص ۱۸۷۰ء میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوا۔ سفارتی خدمات کے سلسلے میں بخارسٹ، پیٹرز برگ (لینن گراڈ) پیرس اور مراکش میں بھی رہا۔ ترکوں کے ماتحت حدیدہ اور تعز کا گورنر مقرر ہوا۔ ترک چلے گئے تو امام کے پاس رہ گیا۔ عربی اور ترکی کے علاوہ فرانسیسی بڑی بے تکلفی سے بولتا تھا۔ اس

کی ایک بیٹی شہزادہ احمد سے اور دوسری شہزادہ حسین سے بیاہی گئی تھی ۔ وزیر اعظم سے بھی اس کا قریبی رشتہ تھا ۔

دربار ہال میں امام کی کرسی ایک چھوٹی سی میز کے پیچھے رکھی تھی۔ امام برآمد ہوئے۔ سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر مرصع ٹوپی تھی، جس پر سفید دستار بندھی ہوئی تھی ۔ ایک طرف سنہری خنجر لٹک رہا تھا، جس کی پیٹی بھی مرصع تھی ۔ امام کی شخصیت ابن سعود کی شخصیت جتنی با اثر نہ تھی ۔ وہ قرآن مجید کا بڑا اچھا عالم تھا۔ اور اس کے کتب خانہ نادر و کمیاب مذہبی و تاریخی مخطوطوں سے لبریز تھا ۔

امام نے کرنیل ایڈی کی مزاج پرسی کے بعد پوچھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ کرنیل نے امام کی صحت کے بارے میں استفسار کیا تو جواب ملا کہ کسی بیرونی ڈاکٹر کے مشورے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ۔ پہلے ڈاکٹر پامر کا علاج موثر ثابت ہوا تھا، جو قونصل کلارک کے ساتھ آیا تھا ۔ اب ڈاکٹر ہیڈلے[1] کے علاج سے فائدہ ہوا ہے، جو سفارت کے ہمراہ آیا ہے ۔

پھر کہا کہ میری رعایا کو کپڑوں کی سخت ضرورت ہے۔ بعض لوگ تعطیلات میں بھی صرف اس وجہ سے گھروں کے اندر بیٹھے رہتے ہیں کہ ان کے پاس پہننے کے لیے مناسب کپڑے نہیں ہوتے ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی طاقتوں میں سے اٹلی کے ساتھ تعلق پیدا ہوا، لیکن اطالوی خود میرے خلاف ہو گئے۔ ہٹلر نے میرے پاس پیغامات بھیجے ۔ لیکن میں نے اس کے ساتھ معاہدہ نہ کیا۔ امریکیوں کا خیر مقدم کرتا ہوں ۔ اس سلسلے میں کرین اور ٹوچل کا ذکر کرتے ہوئے

---

[1] Doctor Hedley

ان کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ کرنیل ایڈی نے معاہدے کے باب میں امریکہ کی خواہش ظاہر کی تو امام نے کہا کہ ضرور ہو جانا چاہیئے۔ راغب بے وزیر خارجہ اور قاضی عبدالکریم مطہر نائب وزیر خارجہ کو اپنی طرف سے نمائندے مقرر کر دیا۔

سات روز میں بہت سے امور طے ہوگئے تو شہزادہ حسین نے گفتگو میں مداخلت کی اور بات چیت کا مختار بن گیا۔ وزیر خارجہ اور نائب وزیر خارجہ دونوں ہٹا دیئے گئے۔ شہزادے نے بات بات پر مین میخ نکالنی شروع کی۔ خصوصاً اس دفعہ کو خلاف مذہب قرار دیا کہ یمن کی رعایا کے ساتھ امریکہ میں اور امریکہ کے باشندوں کے ساتھ یمن میں موقع کی ضرورتوں اور مسلمہ بین الاقوامی معمولات کے مطابق سلوک ہوگا۔ معاملات اس حد پر پہنچ گئے کہ سفارت نے معاہدے کے بغیر واپسی کا فیصلہ کر لیا اور امام کو اس بارے میں اطلاع بھی دے دی۔ ساتھ ہی رخصتی ملاقات کے لیئے درخواست پیش کر دی۔

چنانچہ ۲۲ اپریل کی صبح کو پھر ایک دربار خاص منعقد ہوا۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد امام نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ کرنیل ایڈی نے بتایا کہ ایک عریضہ دو روز پیشتر بھیجا گیا تھا۔ اس میں حکومت امریکہ کی پوزیشن واضح کر دی تھی۔ امام نے کہا۔ میری نظر سے تو ایسا کوئی خط نہیں گزرا۔ ساتھ ہی اپنے بیٹے شہزادہ قاسم سے کہا کہ اس کی نقل لاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ حسین نے پوری خط وکتابت اپنے ہی قبضے میں رکھی تھی۔ اور امام تک کوئی بات نہ پہنچنے دی تھی۔ جب کرنیل ایڈی کا خط سامنے آیا تو امام نے غور سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں جو ذرا صبر و تحمل سے کام لے کر درست نہ کی جا سکے۔ ابھی ٹھہریئے اور اس

معاملے پر مزید گفتگو کر لینے دیجئے ۔ میری آرزو ہے کہ قاضی اور راغب بے پھر بات چیت شروع کریں۔

اس کے بعد ایک عجیب ڈرامائی واقعہ پیش آیا۔ سر راغب بے امام کے سامنے جا کھڑا ہوا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ میں نے تیس سال امام کی خدمت گزاری میں صرف کیے اور سلطنت یمن کے بین الاقوامی معاملات کا سفینہ شدید مشکلات کے سمندر میں سے سلامت گزارتا رہا۔ میں اب بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ موت کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ میری آرزو تھی کہ مرنے سے پہلے یقین ہو جاتا، سلطنت یمن کی خارجہ پالیسی صحیح اصول پر جاری رہے گی۔

میں امام کو کئی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ بیسویں صدی بڑی طاقتوں کے درمیان رزم و پیکار کی صدی ہے۔ اب جرمنی، جاپان اور اٹلی کی اہمیت گھٹ چکی ہے، صرف روس، انگلستان اور امریکہ ہی دنیا کی بڑی طاقتیں رہ گئی ہیں۔ ہر چھوٹی قوم کو زندہ رہنا ہے تو کسی ایک سے وابستگی ضرور پیدا کر لینی چاہیئے۔ روس لامذہب ہے اور کوئی سچا مسلمان اس سے وابستگی پیدا نہیں کر سکتا۔ برطانیہ اور یمن کے درمیان جنوبی سرحد کے متعلق سالہا سال سے تنازع چلا آتا ہے۔ اس کا اب تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ صرف ایک امریکہ ہے، جس نے اب تک کوئی سامراجی مقصد ظاہر نہیں کیا اور امریکی شہریوں سے یمن کے تعلقات نہایت خوشگوار رہے ہیں۔ حکومت امریکہ اب خود دوستی کی خواہاں ہے۔ اس معاہدہ دوستی کو میں اپنے دور خدمت کا سب سے بڑا واقعہ سمجھ رہا تھا۔ اس کا مطلب یقیناً یہ ہوتا کہ

یمن کو ایک اچھا اور طاقتور حلیف مل جاتا۔ جس کے ساتھ آئندہ سلسلہ معاملات جاری رہے گا۔

یہاں پہنچ کر راغب بے میز پر جھک گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اور امام کی ریش کے قریب ہاتھ لے جا کر گرایا ہوا۔

یہ بین الاقوامی کارنامہ پایہ تکمیل کو پہنچ رہا تھا۔ کہ یہ کام مجھ سے لے لیا گیا اور مجھے محل سے ٹھوکر مار کر کتے کی طرح نکال دیا گیا۔ میری جگہ آپ کے فرزند حسین نے گفت و شنید سنبھال لی۔ حالانکہ اسے ان معاملات کا قطعاً تجربہ نہ تھا۔ میں نے مہمان خانے میں جو عظیم الشان چیز تیار کی تھی، آپ کے فرزند نے وہ گرادی اور اس کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔ ترقی اور پیش قدمی رک گئی۔ جب واضح ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔ تو آپ مجھے بلاتے ہیں کہ جاروب کش کی حیثیت میں ان ٹکڑوں کو جمع کروں اور جوڑ جوڑ کر آپ کے فرزند کی پھیلائی ہوئی بربادی کی تلافی کر دوں۔ میں محل کے غلاموں کی طرح ادھر ادھر نہیں پھر سکتا۔ میں اعلیحضرت کے وزیر خارجہ کے منصب سے مستعفی ہوتا ہوں۔ میں اب یمن میں نہیں ٹھہر سکتا۔ یہاں سے اپنے وطن ترکی جانے کی اجازت چاہتا ہوں تاکہ وہیں مروں۔

ساتھ ہی اس نے سسکیاں بھرنی شروع کیں۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ امریکی سفارت کے ارکان تصویر حیرت بنے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ صنعاء کی لطیف ہوا میں اس درجہ جذباتیت راغب بے کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔

امام کی گارڈ کے سالار نے دروازے پر کھڑے ہوئے یہ خطبہ سنا تو وہ دبے پاؤں راغب بے کے پیچھے پہنچ گیا۔ دایاں ہاتھ خنجر کے دستے پر رکھا اور بائیں ہاتھ سے امام کو اشارہ کر دیا۔ امام کی طرف سے خفیف سا اشارہ بھی ہوتا تو راغب بے کی زندگی ختم ہو جاتی۔

بہر حال راغب بے کی تقریر ختم ہوئی تو امام نے شفیق باپ کے انداز میں فرمایا:۔

راغب بے! اپنا جی ہلکان نہ کرو۔ معاملات درست ہو جائیں گے۔

آرام کرو۔ تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔

کرنیل ایڈی نے کہا کہ ہم تھوڑی دیر اور مہمان خانے میں ٹھہریں گے۔ اگر آپ کوئی پیغام مجھے یا میری حکومت کو بھیجنا چاہیں۔ تو میں منتظر رہوں۔

امام نے پھر راغب بے سے کہا کہ بات چیت کرو۔ اس نے عرض کیا کہ میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو چکا ہوں۔ اس کے بعد امام نے قاضی مطہر کو اس کام کے لیے مقرر کر دیا اور کرنیل ایڈی کے ترجمان محمد آفندی کو وہیں روک لیا۔ سفارت کے ارکان مہمان خانے میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محمد آفندی آیا تو اس نے بتایا کہ ارکان سفارت کی روانگی کے بعد سب لوگ دربار ہال میں جمع ہو گئے اور اس معاملے پر خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ حسین کہتا تھا کہ اگر یہ دفعہ قبول کر لی گئی تو یمن میں اسلامی زندگی باقی نہ رہے گی۔ امام نے اس کا مشورہ رد کر دیا۔

محمد آفندی اور قاضی مطہر محل سے روانہ ہو کر چل پڑے تھے کہ راستے ہی سے

قاضی کو واپس بلا لیا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ مہمان خانہ میں آیا تو ارکان سے کہا کہ شہزادہ
حسین نے جو خط لکھے ہیں، وہ واپس کر دیئے جائیں۔ اس خواہش کی تعمیل ہو چکی۔ تو
معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ کرنیل ایڈی فوراً جیپ میں روانہ ہو گئے۔ اس لیئے
کہ انھیں دولت سعودیہ میں ضروری کام تھا۔ ان کے ساتھی دوسرے روز چلے گئے
اور ایک لانچ میں سوار ہو کر جزیرہ قمران پہنچ گئے۔ صرف دو آدمی پیچھے رہ گئے
تاکہ یمنیوں کو ریڈیو چلانا سکھا دیں۔ اس ریڈیو سیٹ کے لیئے محل کے ساتھ ایک
عمارت بنانے میں جس عجلت سے کام لیا گیا، اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔ وسط
جولائی میں ریڈیو سٹیشن کام کرنے لگا اور یہ پُر لطف واقعہ ہے کہ شہزادہ
حسین نے اس پر افتتاحی تقریر کی۔
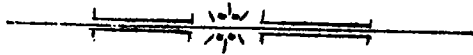
انیسواں باب

صنعا میں انقلاب

سفارتی مشن کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو یمن سے سرکاری ربط و ضبط کا موقع ستمبر ۱۹۴۶ء میں پیش آیا، جب جے رِوِس چائلڈز[ط] امریکہ کی طرف سے دولت سعودیہ اور یمن کے وزیر مختار کی حیثیت میں کاغذات اعتماد پیش کرنے کی غرض سے صنعا گیا۔ اس موقع پر بھی ہارلن کلارک اور محمد آفندی مسعود ہمراہ تھے۔ امام بیماری کے حملے سے صحت یاب ہو چکے تھے اور انھوں نے الروضہ کے نخلستان میں ایک عظیم الشان دعوت کا انتظام کیا تھا جس میں شہزادہ احمد اور شہزادہ عبداللہ کے سوا تمام اکابرین شریک تھے۔ شہزادہ احمد کئی سال سے صنعا آیا ہی نہ تھا اور شہزادہ عبداللہ یمن کی طرف سے سفیر عام مقرر ہو چکا تھا اور اس وقت لندن میں تھا۔ مثلاً شہزادہ حسین موجود تھا، جس نے سفارتی مشن کی گفتگو میں رکاوٹیں پیدا کی تھیں۔ شہزادہ قاسم

J. Rives Childs [ط]

موجود تھا۔ جو بڑا سرگرم آدمی تھا اور اس زمانے میں حکومت یمن کا وزیر مواصلات تھا۔ شہزادہ علی موجود تھا جو پہلے وزیر امور اقتصادیات رہ چکا تھا اسے بڑا ہی غیر ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ خصوصاً مزاج میں وہ بالکل بے باک تھا۔ شہزادہ حسن وزیر تعلیمات اور شہزادہ اسماعیل بھی موجود تھے۔ شہزادہ ابراہیم موجود تھا، جو کچھ دیر بعد عدن پہنچ گیا تھا۔ شہزادہ عبدالرحمٰن اور دوسرے بھائی بھی موجود تھے جنہیں مغربی لوگوں نے شاذ ہی دیکھا ہوگا۔

چالمرز روانگی سے پیشتر ڈاکٹر عدنان ترصیصی رئیس وفد لبنان سے بھی ملا۔ یہ وفد اس غرض سے یمن آیا تھا کہ نشو و ارتقا کے منصوبوں میں امداد دے۔ واپسی میں چالمرز نے بیریم، ارب اور نقرہ کا مشکل راستہ اختیار کیا۔ بیریم سے حمیری دارالحکومت ظفار کے کھنڈر دیکھنے کے لیے بھی گیا۔ مئی ۱۹۴۷ء میں سیف الاسلام شہزادہ عبداللہ نے، جو قاہرہ میں تھا، ریاست ہائے متحدہ کے ساتھ ضرورت سے زائد پیداوار کے بارے میں معاہدہ کر لینے کی خواہش ظاہر کی اور وزارت نے اسے واشنگٹن آنے کی دعوت دے دی۔ شہزادے نے اس شرط پر دعوت قبول کر لی کہ پہلے والد سے گفتگو کر لوں۔ اس نے ہوائی جہاز میں صنعا جانے کا فیصلہ کیا۔ امام کے حکم سے پانچ ہزار یمنی صنعا سے قریب زمین ہموار کرنے میں لگ گئے۔ شہزادہ امریکیوں کے ساتھ عدن پہنچا۔ اسے وہاں ٹھہرا کر پہلے امریکی خود ہوائی جہاز لے کر صنعا پہنچے تاکہ تمام انتظامات کی درستی کا جائزہ لے لیں، پھر شہزادے کو لے جائیں۔ وہ لوگ صنعا پہنچے تو ایک خیمے میں قاضی عبداللہ العمری وزیر اعظم نے ان کا خیر مقدم کیا۔ دوسرے چکر میں وہ شہزادہ عبداللہ کو لے گئے۔

راغب بے دوبارہ وزیر خارجہ مقرر ہو چکا تھا اور اس کی صحت بھی اچھی تھی۔ امام کی صحت بھی ترقی کر چکی تھی۔ چند روز پیشتر وہ سفید خچر پہ سوار ہو کر ادائے نماز کے لیئے جامع مسجد پہنچا تھا۔

اسی موقع پہ اطالوی ڈاکٹر مدام آدیزیو[1] سے ملاقات ہوئی۔ پورے یمن میں صرف تین یورپی خواتین مقیم تھیں۔ ان میں سے ایک مدام آدیزیو بھی تھی۔ مدام نے مصر کے ماہر آثار قدیمہ احمد فخری بے سے امریکیوں کو ملاقات کرائی۔ جو قاہرہ کے عجائب خانہ تاریخ کا ناظم تھا۔ اور پچھیں روز یمن کے شمالی و مشرقی گوشے میں گزار کر آیا تھا۔ جہاں گلازر کے بعد (۱۸۸۹ء) کوئی یورپی سیاح نہیں گیا تھا۔ فخری بے مصر کے آثار قدیمہ سے آگاہ تھا۔ اس نے بتایا کہ میں نے مشرقی یمن کے آثار قدیمہ سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ اہم آثار بہت کم دیکھے ہیں۔ وہ مارب کے بعض محلات اور بڑے بند کو بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ کھنڈر اس وجہ سے خاص دلچسپی کا مرکز تھے کہ ان پہ کتبات صاف نظر آ رہے تھے اور رقاصاؤں کی تصویریں بھی تھیں۔ یہ بھی بتایا کہ مارب کے کھنڈروں میں مصری اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اور یہ کھنڈر غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح کے ہیں۔ بہترین آثار جوف[2] کے علاقے میں ہیں۔ جو مارب کے شمال میں واقع ہے جہاں معینی دور کا ایک معبد اب تک سلامت موجود ہے۔ اس

---

[1] Audizio

[2] اس سے مراد جوف یمن ہے جس کا محل مارب کے شمال اور نجران کے جنوب میں ہے، یعنی یمن کا شمالی و مشرقی گوشہ۔

معبد میں جو سلیں لگی ہوئی ہیں ان میں سے بعض پچیس پچیس ٹن کی ہیں اور ان پر مقامی نمونے کی بعض چیزیں کندہ ہیں۔ جوف کی بعض عمارتوں پر بلند ستون لگے ہوئے ہیں۔ جن کے سولہ سولہ پہلو ہیں۔

امریکیوں نے روانگی سے پیشتر یمن کے شمالی و مشرقی حصے پر پرواز کی اجازت لے لی تھی۔ چنانچہ انھوں نے صنعا سے پرواز کی اور وادی یمن سے باہر نکل کر ایک اور وادی کے ساتھ ساتھ اڑنا شروع کیا۔ یہ کشادہ ہوتے ہوتے اس زمین پر ختم ہو گئی جو ربع الخالی اور کوہستان یمن کے درمیان واقع ہے۔ یہ زمین اگرچہ خشک ہے لیکن زرخیزی کے ممکنات سے معمور ہے۔ کارل ٹوچل بھی اسی جہاز پر سوار تھا۔ اس نے آتش فشاں پہاڑوں کے متعدد دہانے دیکھے جن کی حرارت ختم ہو چکی تھی اور اندر سے جو لاوا نکلا تھا، وہ خشک ہو کر جم گیا تھا۔ ایک بہت بڑا دہانہ نظر آیا۔ یہ آتش فشاں نہ تھا، بلکہ معلوم ہوتا تھا کوئی شہاب ثاقب نیچے گرا ہے۔ جس نے بہت بڑا گڑھا پیدا کر دیا ہے۔ فخری بے نے وادی مارب کے متعلق بڑی بیش قیمت معلومات بہم پہنچائیں۔ بند کا بڑا حصہ نظر نہ آتا تھا۔ سیاتو وہ گر چکا ہو گا، یا ریت نے اسے ڈھانپ لیا ہو گا۔ لیکن بند کی جگہ دونوں کناروں پر بڑے بڑے اور بھاری پتھر صاف نظر آ رہے تھے۔ بند سے تھوڑی دور ایک قدیم شہر کے کھنڈر تھے۔ اس کے ستون سنگ خارا کے تھے۔ ایک مدور دیوار ایک صحن کو گھیرے ہوئے تھی۔ جس کے دروازہ میں پانچ مربع ستون نصب تھے۔ مصری ماہر آثار قدیمہ نے بتایا کہ یہ ملکہ بلقیس (ملکہ سبا) کی محراب ہے۔

مارب سے جہاز شمالی جانب چلا گیا۔ اس حصے کا نقشہ کبھی تیار نہیں ہوا۔ ایک

مزروعہ میدان راستے میں ملا جس میں دیہات کے علاوہ پانی کے بڑے بڑے تالاب تھے۔ ٹوچل نے بتایا کہ یہ دولت سعودیہ کا شہر نجران ہے، جسے اس نے آخری مرتبہ ۱۹۴۲ء میں دیکھا تھا۔ لوگ ہوائی جہاز کو دیکھ کر متحیر ہوئے اور گلیوں یا چھتوں پر جمع ہو گئے۔ وہاں سے جہاز مغرب کی جانب مڑ کر عسیر کی فضا میں پہنچ گیا۔ پھر جدہ چلا گیا۔ اگر یمنیوں کو یقین دلا دیا جائے کہ ان کی کوئی چیز ملک سے باہر نہ جائے گی اور چھان بین شروع ہو جائے تو وہاں سے مشرق قریب کے عظیم ترین آثار برآمد ہوں گے۔

بہرحال سیف الاسلام شہزادہ عبداللہ امریکہ پہنچا۔ صدر ٹرومین سے ملا۔ وہاں اس نے خواہش ظاہر کی کہ یمن کو انجمن اقوام متحدہ کا ممبر بنا لیا جائے۔ تمام عرب حکومتوں نے اس کی زبردست حمایت کی اور ۲۵۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کو سیف الاسلام شہزادہ عبداللہ یمن کے نمائندے کی حیثیت سے انجمن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شریک ہوا۔ جس میں چھپن اقوام کے نمائندے پہلے سے شریک تھے۔ شہزادہ عبداللہ نے نیویارک کے ایک ہوٹل میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس کی قیامگاہ عملاً یمنی سفارت خانہ بن گئی۔ وہ امریکہ کے مالدار آدمیوں اور کاروباری نرخوں کے نمائندوں سے مل کر یمن کے لئے بندرگاہوں، سڑکوں، ہسپتالوں اور پانی ذخیرہ کرنے کے لیئے بندوں کی ضرورت پر زور دیتا رہا۔ اس اثنا میں صنعا کے اندر ایک خوفناک و خونریز سازش کی پخت و پز ہوئی، جس کے مفصل حالات تو ابھی تک روشنی میں نہیں آئے، لیکن جو کچھ یہاں پیش کیا جا رہا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ اس میں خاندان وزیری کی بغاوت کے تمام اہم پہلو آ گئے ہیں۔

۱۹۴۸ء کے پہلے پانچ ماہ میں صنعا کے اندر جو واقعات پیش آئے۔ انھیں

سمجھنے کے لیئے یہ جان لینا ضروری ہے۔ کہ پشتوں سے یمن دو طاقت ور اور با اقتدار خاندانوں کے زیر اثر چلا آتا ہے۔ ان میں سے ایک حمیدالدین کا خاندان ہے، یعنی امام کا خاندان، دوسرا وزیر کا خاندان ہے۔ یہ بھی زیدی جاگیرداروں کا بڑا اہم خاندان ہے۔ اس میں سے بھی یمن میں امام بنتے رہے، اور بڑے بڑے عہدوں پر بھی اس خاندان کے افراد مامور ہوتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں اس کا رئیس و سرکردہ عبداللہ الوزیر تھا ساٹھ سال کی عمر کا سفید ریش آدمی جو اونچے عہدوں پہ فائز رہا اور ۱۹۳۴ء میں یمن و دولت سعودیہ کے صلح نامے میں اس نے نہایت اہم حصہ لیا تھا۔

اگرچہ امام یحییٰ نے یمن کو ترکوں سے آزاد کرایا تھا اور ملک میں امن قائم کر دیا تھا۔ مگر اس کا نظم و حکومت ذرا سخت تھا اور کچھ لوگ اس کے اور اس کے بڑے فرزندوں کے مخالف ہو گئے تھے۔ مخالفوں کے دو مرکز تھے۔ ایک عدن جس میں "آزاد یمنی" جماعت منظم تھی۔ اور کم و بیش پندرہ ہزار یمنی روزگار کے سلسلے میں وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو وطن میں نئے زمانے کے اوضاع و اطوار جاری کرنے کا بہت خیال تھا۔ اور یہ نظام حکومت میں آزادی و آزاد خیالی کے لیئے کوشاں تھے۔ دوسرا مرکز وزیری خاندان کا تھا، جو شادیوں کے رشتے میں امام سے منسلک تھے۔ اور اس خاندان میں بڑے بڑے جاگیردار بھی تھے۔ یہ حقیقت بھی واضح ہو جانی چاہیئے کہ یمن میں امامت کا منصب موروثی نہ تھا۔ ایک امام کا انتقال ہوتا تو دوسرے امام کا انتخاب مذہبی اکابر کی مجلس شوریٰ کے ذریعے سے ہوتا اور وہی شخص منتخب کیا جاتا جو بہترین ہوتا۔ امام یحییٰ کی آرزو تھی کہ اس کا

بڑا بیٹا جانشین ہے لیکن اس رائے کی مخالفت بھی موجود تھی سیف الاسلام شہزادہ احمد دستور زدہ یمن کے جنوبی مقام تعز میں مقیم تھا۔ وہاں اس نے دور حاضر کے بعض سلسلے ایک جرمن انجنیئر کی نگرانی میں جاری کئے تھے۔ جس کا نام ہاینسن تھا۔ مگر ساتھ ہی لوگوں پر بھاری ٹیکس بھی لگا دیئے تھے۔ اس وجہ سے یہ تحریک چل پڑی تھی۔ کہ اس کی جگہ مجلس شوریٰ کے ووٹ عبداللہ الوزیر کے لئے حاصل کئے جائیں۔

اس سلسلے میں امام کے فرزند سیف الاسلام شہزادہ ابراہیم کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ یہ شہزادہ اصلاحات کا سرگرم حامی تھا۔ اس لیئے امام کی نظروں سے گر گیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں شہزادے نے بیماری کا عذر پیش کر کے حبشہ کے دارالحکومت عدیس آبابا جانے کی اجازت لی۔ جہاں ایک ڈاکٹر موجود تھا۔ علاج کے بعد وہ صنعا جانے کے بجائے عدن میں مقیم ہو گیا۔ اور "آزاد یمنی جماعت" کا رئیس بن گیا۔ اس کے نام سے کئی منشور شائع ہوئے۔ البتہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی تیاری میں شہزادے کا کتنا حصہ تھا۔ ان منشوروں میں بتایا جاتا تھا۔ کہ عدن بہت پس ماندہ ملک ہے۔ لازم ہے کہ مطلق العنانی پر پابندیاں لگائی جائیں۔ "آزاد یمنی جماعت" کی طرف سے آئندہ امامت کا امیدوار عبداللہ الوزیر ہی تھا۔ اگرچہ وہ لوگ علی الاعلان اس کا اقرار نہیں کرتے تھے۔

سیف الاسلام شہزادہ احمد کے خلاف سیف الاسلام شہزادہ حسین بھی خفیہ خفیہ کام کر رہا تھا۔ وہ بظاہر الوزیر کا حامی تھا لیکن اصل میں اس کے پیش نظر ذاتی اغراض تھیں۔ قاضی عبداللہ العمری وزیر اعظم اگرچہ امام کا پرانا دوست تھا۔ مگر وہ بھی شہزادہ احمد کا مخالف تھا اور چاہتا تھا کہ امامت اس کے ایک رشتہ دار کو مل جائے تاکہ یہ منصب خود اس کے خاندان میں آ جائے۔ غرض "آزاد یمنی جماعت" کے علاوہ سازشیوں کے یہ تین گروہ خود صنعا میں موجود تھے۔ جو یہ بظاہر اتحاد سے کام کر رہے تھے۔ مگر حقیقتاً ہر گروہ سب کچھ خود سمیٹ لینا چاہتا تھا۔

عام حالات میں وزیر کا خاندان امام یحییٰ کی وفات کا انتظار کر سکتا تھا جس کی عمر اسی سال کی ہو چکی تھی پھر وہ اپنے دعوی کے لیئے کوشاں ہو سکتے تھے۔ لیکن کسی شخص نے وزیریوں کے منصوبے کا راز امام یحییٰ کے پاس فاش کر دیا۔ امام نے فوراً سیف الاسلام شہزادہ احمد کو صنعا بلا لیا۔ وسط فروری میں شہزادہ احمد کا سامان صنعا پہنچنے لگا۔ تو سازشیوں کو احساس ہوا کہ جو کچھ ضروری ہے اس کے لیئے فوراً عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔ ۱۷ فروری کو قاضی عبداللہ العمری امام کے پاس پہنچا اور بتایا کہ ایک شاہی فارم میں جو صنعا سے زیادہ دور نہیں پانی کا نیا چشمہ نکلا ہے۔ امام اور وزیر اعظم دونوں سرخ رنگ کی بند بیوک گاڑی میں بیٹھ کر چشمہ دیکھنے کے لئے نکلے۔ راستہ میں ایک ٹرک کھڑا تھا اس میں سے چند قبائلی باشندے نکلے جو تین مشین گنیں لیئے ہوئے نکلے اور قاضی عبداللہ الوزیر کو آواز دی کہ موٹر سے باہر نکل آؤ۔ امام نے قاضی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اٹھنے نہ دیا۔ فی الفور آتش باری شروع ہو گئی۔ قاضی عبداللہ العمری مارا گیا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ امام کے خراش تک نہ آئی۔ اسے خیال ہوا کہ یہ لوگ قاضی عبداللہ العمری کو مارنا چاہتے تھے چنانچہ زور سے آواز دی کہ قاضی مر چکا ہے اب آتشباری بند کردو یہ سنتے ہی قاتلوں نے دوسری بار میں امام کا جسم بھی گولیوں سے چھلنی کر ڈالا۔

شہزادہ حسین اپنے محل میں بیٹھا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً اسلحہ خانے کی طرف دوڑا تاکہ شہر پر قابض ہو جائے۔ لیکن سپاہیوں نے اسے محل کے دروازے پر روک لیا۔ وہ سب عبداللہ الوزیر کے وفادار تھے جب شہزادے نے انہیں حکم دیا کہ ایک طرف ہٹ جاؤ تو سپاہیوں نے اسے گولی مار دی۔ عبداللہ الوزیر نے اسلحہ خانے اور شاہی محل پر قبضہ کر لیا۔ مجلس شوریٰ نے فوراً اس کی امامت کا اعلان کر دیا۔ سیف الاسلام شہزادہ مطہر کو جو سیف الاسلام شہزادہ احمد کا وفادار تھا قید میں ڈال دیا گیا۔ شہزادہ ابراہیم اور آزاد یمنی جماعت کے دوسرے اہم ارکان ایک ہوائی جہاز میں سوار ہو کر صنعا پہنچ گئے۔

یمن کے بعض اور شہروں نے بھی نئے امام کی حمایت کا اعلان کر دیا اور بہ ظاہر وزیر کے خاندان کے لیئے حالات بہتر نظر آنے لگے۔ شہزادہ احمد نے جنگ شروع کر دی۔ اور وہ ساحلی علاقے کے ساتھ ساتھ شمالی صوبوں کی جانب نکل پڑا اس لئے کہ سمجھتا تھا یہ صوبے اس کے زیادہ وفادار ہیں۔ متعدد لڑائیوں میں اس نے شکست بھی کھائی

بہرحال وہ حدیدہ پہنچا۔ تو وہاں کا عامل (گورنر) اگرچہ وزیری خاندان کی سازش میں شریک تھا اور امید یہی تھی کہ اسے پکڑ کر قتل کر دے گا، مگر گورنر بالکل خلاف توقع شہزادہ احمد کا طرفدار بن گیا اور اسے امداد دے کر شمالی یمن کے مشہور مقام حجہ[1] پہنچا دیا۔

وہاں شہزادہ سیف الاسلام احمد نے ایک طرف اپنے حامیوں کو جمع کر لیا، دوسری طرف صنعا میں ایک فوری اور ناگہانی اقدام کا انتظام کر دیا۔ اس اقدام میں شہزادہ مطہر کو قید سے آزادی مل گئی۔ اس نے عبداللہ الوزیر کو گرفتار کر کے اسی کوٹھڑی میں بند کر دیا جس میں خود محبوس رہ چکا تھا۔ اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ الوزیر اور اس خاندان کے دوسرے گرفتار شدہ اشخاص کو حجہ بھیج دیا گیا۔ تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ مجلس شوریٰ نے حالات بدلے ہوئے دیکھے تو شہزادہ احمد کی امامت کا اعلان کر دیا۔ مقدمہ دیر تک چلتا رہا۔ آخر عبداللہ الوزیر اور اس کے تین بڑے حامیوں کو سزائے موت دی گئی۔ شہزادہ ابراہیم قیدی ہی میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ عبداللہ الوزیر نے مسند امامت حاصل کر لینے کے بعد ابن سعود مرحوم سے درخواست کی تھی کہ اس کی حکومت تسلیم کر لی جائے۔ ابن سعود نے سختی سے انکار کر دیا۔ ساتھ ہی سیف الاسلام شہزادہ احمد کو ریاض سے پیغام بھیجا کہ اپنے والد کا تخت حاصل کرنے کے لئے جنگ جاری رکھو۔ گویا ضمناً یہ بھی بتا دیا کہ ضرورت پیش آنے پر نجد امداد دے گا۔

نئے امام نے صنعا کی جگہ تعز کو دار الحکومت بنا لیا۔ حدیدہ کے عامل کو حاجب کا عہدہ دے دیا اور اپنے بھائی شہزادہ حسن کو وزیر اعظم بنا دیا۔ غالباً بعد کو پھر وزارت خارجہ کا منصب مل گیا۔ لیکن اسے شہزادہ عبداللہ کے لیے جگہ خالی کرنی پڑی۔ یقیناً شہزادہ عبداللہ ہر لحاظ سے اس منصب کے لیے موزوں ترین آدمی تھا۔ یمنی سفارت خانے واشنگٹن، قاہرہ اور لندن میں قائم ہو چکے ہیں۔ بیرونی دنیا کے ساتھ عموماً جرمنی کے ساتھ خصوصاً تعلقات بڑھ رہے ہیں۔ امام چاہے بھی تو بیسویں صدی پر یمن کے دروازے بند نہیں کر سکتا۔ یمن اور پورے جزیرۃ العرب میں تغیر کی قوتیں اتنی زبردست ہیں کہ انہیں دبایا نہیں جا سکتا۔ جزیرۃ العرب، عربوں اور مغربی دنیا سب کا فرض ہے کہ متعلق تغیرات ایسے انداز میں آئیں، جو

[1] حجہ۔ صنعا سے شمال و مغرب میں اور لحیہ کے عین محاذ میں پہاڑوں کے اندر واقع ہے۔

سب کے لیے مفید و بابرکت ہو۔

ضمیمہ

یمن کے پہلے دارالحکومت صنعا کی آبادی پچاس ہزار ہے اور یہ سوا سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ موجودہ دارالحکومت تعز کی آبادی صرف بارہ ہزار ہے اور یہ چار ہزار چھ سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ حدیدہ کی آبادی تیس ہزار ہے۔ اِبّ، یریم، الحجبہ اور مخا میں سے کسی کی آبادی بارہ ہزار سے زیادہ نہیں۔

اختیارات کا مالک سیف الاسلام امام احمد بن یحییٰ ہے جو مارچ ۱۹۴۸ء کو تخت نشین ہوا۔ آٹھ وزیروں کی ایک مجلس کے ہاتھ میں انتظام ہے۔ شہزادہ بدر وزیر اعظم، وزیر خارجہ اور وزیر دفاع ہے اور سیف الاسلام شہزادہ علی وزیر تعلیمات۔ ان کے علاوہ وزیر داخلہ، وزیر مالیات، وزیر مواصلات، وزیر عدل اور وزیر زراعت ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں وزارت کا منصب حاصل ہے مگر کوئی محکمہ سپرد نہیں۔ یعنی وہ صرف وزیر بے وزارت ہیں۔ انتظامی لحاظ سے ملک اضلاع میں بٹا ہوا ہے۔ قہوہ، چمڑے اور کھالیں برآمد ہوتی ہیں اور بہت بڑا ذریعہ آمدنی ہیں۔ حکومت فصلوں پر عشر وصول کرتی ہے۔ نیز سرائے پر ٹیکس اور جزیہ لیا جاتا ہے۔

تین اخبار نکلتے ہیں۔ تعلیم ابھی تک پرانے نہج پر جاری ہے۔ زراعت کے لیے بھی ایک سکول ہے۔ نئی تعلیم کے لیے چھ درسگاہیں قائم ہو چکی ہیں۔ دینی کالج مسجدوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔